تارِ نظر
وہاب عندلیب

تارنظر

(مضامین، تبصرے اور پیش نامے)

وہاب عندلیب

یہ کتاب
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے

نام کتاب : تارِ نظر
مصنف و ناشر : وہاب عندلیب
تزئین و صفحہ ساز : باسط فگار
سرورق : محمد ایاز الدین پٹیل
کمپوزنگ : عارف مرشد ، حسن محمود
اشاعت : ۲۰۱۴ء
قیمت : ۲۰۰ روپے
صفحات : ۳۳۴
تعداد : ۵۰۰
طباعت : اورین پرنٹرس، حیدر آباد
تقسیم کار :

📖 مصنف، کنج نسیم، 1-29/35، ہاؤزنگ بورڈ کالونی، عقب عدالت، گلبرگہ (کرناٹک)
📖 انجمن ترقی اردو گلبرگہ، روبرو کے بی این اسپتال، اسٹیشن روڈ، گلبرگہ

TAR -E- NAZAR

(Articles)

by

Wahab Andaleeb
Kunj-e-Naseem, 1-29/35, KHB Colony,
Behind Dist. Courts, Gulbarga - 585102
Cell No. : 09880872386

Rs. 200, Pages - 334 - Year of Publication - 2014

جواں سال ادیب

ڈاکٹر غضنفر اقبال

کے نام

جن کی تلاش و جستجو اور کد و کاوش کے باعث

میرے مضامین، تبصرے اور پیش ناموں پر مشتمل کتاب

تارِ نظر

کی صورت گری ممکن ہو سکی

ہجومِ غم سے یہاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے
(مرزا غالب)

مشمولات

الف : (ادب)

مطالعے

ب : زبان، تعلیم و تدریس

ج : تبصرے

د۔ پیش نامے

تارِنظر : ایک تاثر

ڈاکٹر محمد ضیاالدین احمد شکیب (لندن)

ڈاکٹر وہاب عندلیب دکن کی اردو دنیا کی ایک نہایت معتبر شخصیت ہیں۔ عندلیب صاحب کے کئی علمی اور ادبی کارنامے ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "تحقیق و تجزیہ" اُن کے علمی رُسوخ اور فکر و نظر کا آئینہ دار ہے۔ اس کے علاوہ عندلیب صاحب کے خاکوں کے مجموعے "قامت و قیمت" اور "گفتار و کردار" سے نہ صرف اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ دکن کی کئی معروف اور غیر معروف علمی شخصیتوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ دکن کے شاعر سلیمان خطیب جو دکنی اردو میں شعر کہا کرتے تھے، عندلیب صاحب نے اُن پر ایک علاحدہ کتاب "سلیمان خطیب ۔شخص، شاعر و نثر نگار" کے عنوان سے شائع کی ہے۔ اسی طرح حیدرآباد کے ایک اور نا قابل فراموش شاعر ڈاکٹر غیاث صدیقی کی شخصیت اور فن پر بھی ایک کتاب مرتب کی ہے جو دکن میں اردو ادب کی تاریخ کے لیے دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔

"تارِنظر" عندلیب صاحب کے مضامین، تبصروں اور پیش ناموں پر مشتمل ہے۔ ان مضامین میں بعض تاریخی حیثیت کے ہیں جیسے ہندوی ہندی، دکنی ایک زبان، فیروز شاہ بہمنی کے دور میں دکنی ادب ،اس کے بعد بیشتر دکن کے معاصر ادیبوں یا اُن کی کاوشوں کا کبھی تفصیلی جائزہ ہے تو کبھی معروضی اظہارِ خیال ہے، کہیں کہیں غیر معروف ادیبوں کے ساتھ نرم گوشہ اختیار کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر وہاب عندلیب نے اردو زبان کے علاوہ اُس کے تعلیمی فروغ میں نہ صرف عملی دلچسپی لی ہے بلکہ اُن مسائل پر اپنے تجربات کی روشنی میں مضامین لکھے ہیں جو کبھی تاریخی طور پر اور کبھی موجودہ صورت حال کے جائزے کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان اوراق میں ان مضامین کے علاوہ کم و بیش ۳۰ (تیس) شعری و نثری کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ تبصروں کے علاوہ ۳۶ کتابوں پر لکھے گئے پیش نامے بھی اس کتاب کا جزو ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اوراق میں جو کچھ مواد شامل ہے وہ نصف صدی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ دکن میں اردو زبان و ادب اور تعلیم و تدریس کے بارے میں جب بھی کچھ لکھا جائے گا "تارِنظر" کو نظر انداز کرنا خلافِ احتیاط ہوگا۔ مجھے اُمید ہے کہ اہل علم اس کتاب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ ●●

فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں دکنی ادب

اردو زبان کی ابتدا ملک کے کے کس خطہ میں اور کب ہوئی تا حال محققین میں اتفاق رائے نہیں پایا جاتا۔ اس سلسلہ میں مختلف نظریات کارفرما ہیں۔ کسی کی نظر میں وہ مغلیہ دور کی پیداوار ہے تو کوئی اس کا رشتہ محمود غزنوی کی فتوحات ہند سے جوڑتا ہے تو کوئی اور پیچھے ہٹ کر اسے محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے منسوب کرتا ہے۔ اسی طرح کسی نے دلی کو اس کا مولد ٹھہرایا تو کسی نے پنجاب سے اس کا خمیر اٹھایا تو ایک اور گروہ کے خیال میں اردو کو دکن اور گجرات سے نسبت ہے۔ جہاں یہ صحیح ہے کہ اردو زبان کی ابتداء شمالی ہند میں ہوئی وہاں یہ بھی صحیح ہے کہ اردو ادب کا آغاز دکن میں ہوا۔ کیوں کہ شمالی ہندوستان کے اہل قلم ایک عرصہ تک فارسی ہی میں تصنیف و تالیف کرتے رہے جب کہ دکن میں اردو تصنیف و تالیف کا کام شمالی ہندوستان کے مقابلے میں کئی سو برس پہلے شروع ہوا۔ اس طرح دکنی یا اردو ادب کا آغاز شاہ جہاں کے دور کی یادگار ہے بلکہ اس سے پہلے اس کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اردو نثر و نظم کی ابتدا کا سہرا دکن ہی کے سر ہے چنانچہ شمال کا شاعر قائم چاند پوری کہتا ہے:

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ :: ایک بات لچری بہ زبان دکنی تھی

میر صاحب بھی فرماتے ہیں:

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے :: معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اردو ادب کی ابتدا و فروغ میں شمال کے مقابلے میں دکن کو اولیت حاصل رہی۔

علاء الدین خلجی نے تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں دکن پر حملہ کیا۔ ملک کافور کی قیادت میں اس کی افواج نے راس کماری تک سلطنت کو وسیع کر دیا۔ اس طرح دکن میں اردو کی ابتدائی صورت کو رواج دینے کا کام علاء الدین خلجی کی افواج نے انجام دیا۔ جب محمد بن تغلق برسر اقتدار آیا تو اس نے ۱۳۲۶ء میں دہلی کے بجائے دولت آباد کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس کے ہمراہ صرف فوج ہی نہیں بلکہ اہل علم و کمال، صناع، تاجر اور دہلی کی کثیر آبادی دکن آگئی۔ پایہ تخت کی دوبارہ منتقلی کے بعد بہتوں کو دہلی واپس ہونا پڑا لیکن اکثر خاندان

بہمنی کے ہو رہے۔ ان کی زبان اردو تھی جس نے دکن میں دکنی اور ہندوی کا نام پایا۔ اس واقعہ کے ۲۱ برس بعد محمد بن تغلق کے ایک افسر ظفر خان نے اس کے دائرہ اطاعت سے آزادی کا اعلان کیا اور سکندر ثانی علاء الدین حسن گنگو بہمنی کا لقب اختیار کر کے ۱۳۴۷ء میں گلبرگہ میں بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور شہر کا نام حسن آباد رکھا۔

ہمیں شہر گلبرگہ شد تخت گاہ :: عمارت بر آورد بر اوج ماہ

بنام حسن شہر شد چوں تمام :: نہادند زاں حسن آباد نام

دکن کا یہ نیا بادشاہ اور اس کی رعایا دہلی کے اثر سے آزاد رہنا چاہتے تھے ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی خاص طرز زندگی اور انداز فکر کے مطابق زندگی گزاریں۔ چنانچہ انھوں نے فارسی کی بجائے اردو میں دلچسپی لی۔ اس اردو پر گجراتی اور مرہٹی کا اثر نمایاں تھا۔ اس لیے وہ دکنی اور گجراتی کہلانے لگی۔ اسی بادشاہ نے سب سے پہلے اس زبان کو سلطنت کے دفتری کاروبار کے لیے منتخب کیا۔ اس سلطنت کی سرحدیں شمال میں تاپتی، جنوب میں تنگبھدرا اور کرشنا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سلطنت بہمنیہ ۱۸۰ سال تک برقرار رہی۔ شاہان بہمنیہ کی بے تعصبی، رواداری، وسیع القلبی اور فراخ دلی کے واقعات سے تاریخ دکن کے صفحات پُر ہیں۔ ان کا طریقہ کار صلح کل تھا۔ انصاف کے معاملے میں انھوں نے کسی کے ساتھ جانبداری نہیں برتی۔ سلطان علاء الدین نے اپنے ایک وزیر گنگو کو وزیر مال مقرر کیا۔ گنگو پہلا برہمن ہے جس نے ایک مسلمان بادشاہ کی ملازمت اختیار کی۔ گنگو کے زمانے سے یہ رسم چل پڑی کہ وزارتِ مال، تمام فرمانروایانِ دکن کی مملکت میں برہمنوں کو تفویض ہوتی رہی۔ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ارتباط بڑھتا گیا اور اس باہمی میل جول سے زبانِ اردو کو بھی فیض پہنچا۔ علم دوستی اور علم پروری کے لحاظ سے بھی یہ دور زیادہ یادگار سمجھا جاتا ہے۔ اس دور کے نامور علما، فضلا اور شعرا میں میر فضل اللہ انجو، شیخ آذری، نظیری، محمود گاواں، مشتاق، لطفی، نظامی، محمود، فیروز اور اشرف ہیں۔ خواجہ شمس الدین، حافظ شیرازی نے بھی گلبرگہ آنے کی دعوت قبول فرمائی تھی مگر کسی وجہ سے نہ آسکے۔

سلطان تاج الدین فیروز شاہ اسی خاندان کا آٹھواں بادشاہ تھا جو نومبر ۱۳۹۷ء میں بادشاہ بنا۔ اس نے ۳۵ سال حکومت کی۔ اس کے عہد میں بہمنی سلطنت کو بہت فروغ حاصل ہوا اور شہر گلبرگہ علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بن گیا۔ اس نے گلبرگہ کو تعلیم و تدریس کا مرکز بنانے کے لیے نامور علما، صوفیہ اور شعرا کو دکن آنے کی دعوت دی جن میں مولانا لطف اللہ شیرازی، حسن گیلانی اور سید محمد گزرانی قابل ذکر ہیں۔ فیروز خود

بھی بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں علما، شعرا، ادبا، فضلا، صوفیہ، مشائخین اور مورخین جمع تھے۔ حاجی محمد قندھاری لکھتے ہیں "فیروز شاہ اپنا وقت اہل کمال اور خوش طبع لوگوں کے ساتھ گزارتا تھا اس کا قول تھا کہ "ہر ملک کا بہترین تحفہ اس ملک کے صاحب کمال ہیں۔" یہی وجہ ہے کہ اس کا دربار باکمالوں سے بھرا ہوا تھا۔ میر فضل اللہ انجو جیسا عالم اس کے عہد میں گلبرگہ کا صوبہ دار تھا۔ اس نے مولانا لطف اللہ شیرازی کو نائب وکیل سلطنت مقرر کیا تھا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ علم و دانش میں فیروز شاہ کا پایہ محمد بن تغلق سے زیادہ بلند تھا۔ اسے قرآن، فقہ، تفسیر، کلام اور تصوف میں مہارت تھی۔ وہ ماہر لسانیات اور خوش نویس بھی تھا۔ بہت ساری زبانیں جانتا تھا۔ فارسی، عربی، ترکی، کنتری، مرہٹی تلنگی، گجراتی اور بنگالی زبانوں پر عبور تھا۔ اس لیے وہ ہر ایک سے ان کی اپنی زبان میں گفتگو کرتا تھا۔ فیروز شاہ نے انتہائی رواداری کے ساتھ حکومت کی۔ وہ دوسرے مذاہب کو بھی قدر کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس نے غیر مسلموں کو اپنی حکومت میں ذمہ دارانہ عہدے دیے۔ اس کی بیگمات بھی مختلف اقوام سے تعلق رکھتی تھیں جن کی زبانیں بھی الگ الگ تھیں جن سے بادشاہ بخوبی واقف تھا۔ وجیانگر کی شہزادی سے بھی اس نے بیاہ رچایا تھا۔ مُدگل کے سنار کی لڑکی پرتھال جو ایک خوش جمال رقاصہ تھی، فیروز کے بیٹے حسن خاں سے بیاہی گئی تھی۔ شاہی خاندان کے مختلف اقوام سے قریبی تعلقات سے بھی اس نئی زبان دکنی کو فروغ حاصل ہوا۔ وہ نہ صرف عام بول چال کی زبان بن گئی بلکہ دھیرے دھیرے اس زبان میں رسالے لکھے جانے لگے۔ اکثر صوفی بزرگوں نے اس زبان میں تبلیغ و تلقین کا کام کیا اور اپنے ارادت مندوں کے لیے کئی رسائل و کتب تصنیف کیں۔ دکن کے یہ بزرگان دین ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہی زبان جو دکنی کے نام سے مشہور تھی ترقی کر کے ادبی زبان بننے کے قابل ہو گئی۔

صوفیائے کرام کا یہ شعار رہا ہے کہ عوام سے ربط پیدا کرنے کیلئے عوامی بولیوں اور ان کی زبانوں کو منتخب فرماتے۔ حضرت بابا فرید شکر گنجؒ نے رعیت کی زبان پنجابی کو اپنایا تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے ہندوی کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح دکنی اردو حضرت بندہ نوازؒ کی دین ہے۔ حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ سلطان فیروز شاہ بہمنی کی دعوت پر ۱۴۰۰ء میں گلبرگہ تشریف لائے۔ ابھی آپ شہر گلبرگہ سے چند میل پر تھے کہ فیروز شاہ نے اپنی ساری فوج، علما و امرا کے ساتھ استقبال کیا۔ صوفیۂ چشت میں حضرت پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے شخصی طور پر رشد و ہدایت کے علاوہ قلم کے ذریعہ حق جوئی اور حق کوشی کا راستہ دکھایا۔ آپ کے عہد میں

دکنی زبان کی حیثیت ایک بولی سے بڑھ کر نہ تھی۔ حضرت بندہ نواز ؒ نے اپنے اعجاز سے اس بولی کو علمی و ادبی زبان بنادیا گویا بندگی مخدوم نے ترسیل و ابلاغ کے لیے فارسی پر دکنی اردو کو ترجیح دی۔ ان کی پیروی میں اس خانوادہ و سلسلہ کے صوفیہ حضرت سید محمد اکبر حسینی ؒ، حضرت سید عبداللہ حسینی ؒ، حضرت میراں جی شمس العشاق ؒ، حضرت برہان الدین جانم ؒ، حضرت امین الدین اعلیٰ ؒ، حضرت میراں جی خدانما ؒ، حضرت ہاشم حسینی خداوند ہادی ؒ، وغیرہ نے دکنی ادب میں تصنیف و تالیف کے سلسلے کو جاری رکھا۔ چنانچہ اس سلسلہ کی آخری کڑی حضرت ٹیپو سلطان شہید ؒ کے مرشد حضرت شاہ صدر الدین ؒ اور ان کے خلیفہ حضرت عارف شاہ قادری ؒ ہیں۔ دکنی کے ذریعہ تصوف اور عرفان کے موضوع پر قلم اٹھانے والے یہی دو آخری صوفی ہیں۔

حضرت بندہ نواز ؒ نے اصلاح معاشرہ کے لیے رسالوں کے علاوہ لوریوں اور چکی ناموں کی صورت میں بھی تصوف کے مسائل پیش کیے۔ یہ لوریاں اور چکی نامے آج بھی ہمارا قیمتی تہذیبی اثاثہ ہیں جو نہ صرف سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے ہیں بلکہ چکی کے یہ گیت آج بھی دکنی خواتین کو ازبر ہیں۔ دکنی کلام کے علاوہ بندگی مخدوم نے کئی مختصر نثری رسالے بھی لکھے ہیں۔ پروفیسر سید مبارز الدین رفعت مرحوم نے حضرت بندہ نواز ؒ سے منسوب دکنی رسائل کی تعداد ۱۲ بتائی ہے جن میں معراج العاشقین، شکار نامہ، تلاوت الوجود، درالاسرار، ہشت مسائل، تمثیل نامہ، رسالہ سہ بارہ، ہدایت نامہ، خلاصۃ التوحید اور معراج نامہ قابل ذکر ہیں۔ محققین نے آپ کی تصنیف ''معراج العاشقین'' کو اردو نثر کی پہلی کتاب قرار دیا تھا۔ حال میں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی تصنیف ''معراج العاشقین کا مصنف'' کے ذریعہ یہ سوال اٹھایا ہے کہ ''معراج العاشقین'' کا مصنف کون ہے؟ ڈاکٹر صاحب ''معراج العاشقین'' کو بارھویں صدی کے عہد کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ فی الحال اس تحقیق کو قطعیت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا کیوں کہ تلاش و فکر اور تحقیق و تجسس کے دروازے ہنوز وا ہیں۔ معراج العاشقین کو سب سے پہلے آج سے کم و بیش ۴۵ سال قبل بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مرتب کر کے اپنے مقدمے اور فرہنگ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ جب یہ کتاب نایاب ہوگئی تو دہلی کے محقق اور ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اور ان کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے دوبارہ شائع کرایا۔ ''شکار نامہ'' کو پہلی بار مرتب کر کے شائع کرنے کا اعزاز پروفیسر سید مبارز الدین رفعت مرحوم کو حاصل ہے۔ ''تلاوت الوجود'' کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ اور سالار جنگ لائبریری میں محفوظ ہے۔ ''دُرالاسرار'' کا ایک نسخہ ادارۂ ادبیات اردو اور

کتب خانہ آصفیہ میں ملتا ہے۔ ''رسالہ تلاوت الوجود'' بڑی حد تک طالب و مرشد کے مکالمے پر مشتمل ہے جس میں مرشد نے طالب کی تشنگی کو سیراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''دُرالاسرار'' میں صوفیانہ مسائل معرض بحث میں آگئے ہیں جبکہ ''شکارنامہ'' میں عرفان اور وحدانیت کے اسرار اور رموز ملتے ہیں۔ حضرت بندہ نوازؒ کے فرزند اکبر سید محمد اکبر حسینیؒ بھی بڑے عالم و فاضل تھے۔ اُن سے بھی ایک دکنی رسالہ منسوب ہے۔ حضرت عبداللہ حسینیؒ نے (جو بندہ نوازؒ کے پوتے ہیں) حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے عربی رسالے ''نشاط العشق'' کا ترجمہ کر کے اس کی شرح بھی لکھی ہے۔ حضرت بندہ نوازؒ کے ایک مرید اور شاگرد نے اپنے مرشد کے ملفوظات کی ایک بڑی شرح 'ہفت اسرار' کے نام سے قلمبند کی ہے اسی زمانہ میں اشرف نے ایک طویل مثنوی ''نوسرہار'' تحریر کی جس میں شہدائے کربلا کا تذکرہ ہے۔ حضرت بندگی مخدوم کے خلفاء اور مریدوں میں بیجاپور کے صوفیائے کرام حضرت میراں جی شمس العشاقؒ، حضرت برہان الدین جانمؒ، حضرت امین الدین اعلیٰؒ نے بھی اردو نثر و نظم میں تصوف اور عرفان کے موضوع پر کئی رسالے تصنیف فرمائے۔ اس طرح اردو میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جو فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں شروع ہوا تھا آخر تک جاری رہا۔ اس لیے فیروز شاہ بہمنی کے دور کو ہم تاریخ کا سنہری دور کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہ دور انتظام سلطنت کے علاوہ علمی و تمدنی ترقی کے اعتبار سے بھی تاریخ میں امتیاز رکھتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ دکنی اردو کی ابتدا ترقی و ترویج کے لیے اس عہد کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

●●

(1969ء)

لے : حضرت بندہ نوازؒ سے معراج العاشقین انتساب سے متعلق ایک اور تحقیقی مضمون بعنوان اردو زبان و ادب کی ابتدا اور حضرت خواجہ بندہ نوازؒ راقم السطور کی کتاب تحقیق و تجزیہ مطبوعہ، جون ۱۹۹۹ء میں شامل ہے۔ (و،ع)

جنگِ آزادی میں مولانا محمد علی جوہر کا حصہ

مولانا محمد علی کا شمار تحریکِ آزادی کے اُن مسلم رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ جنھیں تعصب و تنگ نظری کی کوئی لہر متاثر نہ کرسکی۔ انھوں نے بارہا اعلان کیا تھا وہ مسلمان بھی ہیں اور ہندوستانی بھی۔ ان کا یہ عزم راسخ آخری لمحات تک متزلزل نہ ہوسکا۔

مولانا محمد علی ۱۸۷۸ء میں مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالعلی خان بجنور کے رئیس تھے۔ محمد علی دو سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ ماجدہ بی اماں کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ دین اقدس کی حفاظت و دین کی خدمت اور خلافت پر جان دینے کے لیے مستعد ہوگئے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول بریلی میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۹۶ء میں علی گڑھ میں گریجویشن کی تکمیل کی۔ بعدازاں آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی، اے آنرس کیا۔ انگلستان سے واپسی کے بعد انھوں نے رامپور اور بڑودہ میں چند سال ملازمت کی۔ ۱۹۱۰ء میں بڑودہ کی ملازمت ترک کردی۔ انھوں نے کلکتہ سے انگریزی ہفتہ وار کامریڈ کی اجرائی کے ذریعہ دنیائے صحافت میں قدم رکھا، اس کے بعد وہ اپنی ملازمت کے دور میں بھی، ممبئی ٹائمز آف انڈیا میں مضامین لکھتے رہے تھے۔ ''کامریڈ''، اعلیٰ صحافت کا نادر نمونہ تھا۔ ہندوستانیوں کے علاوہ بڑے بڑے انگریز بھی اسے شوق سے پڑھتے تھے۔ جب انگریزوں نے کلکتہ کے بجائے دہلی کو صدر مقام بنایا تو مولانا محمد علی بھی ستمبر ۱۹۱۲ء میں دہلی آگئے اور کامریڈ ہمدرد پریس قائم کیا۔ اب کامریڈ دہلی سے شائع ہونے لگا ۱۹۱۳ء سے اُردو روزنامہ ''ہمدرد'' کی بھی اجرائی عمل میں آئی۔ مولانا نے صحافت کو کسب معاش کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اس کے ذریعہ ملک وملت کی اصلاح مقصود تھی۔ کامریڈ اور ہمدرد کے ذریعہ نہ صرف جدوجہد آزادی میں جوش و خروش پیدا ہوا۔ بلکہ ملک میں قومی یکجہتی اور اجتماعی جدوجہد کے جذبے کو فروغ حاصل ہوا۔

۱۹۱۴ء کی جنگ کے آغاز کے بعد مولانا محمد علی نے کامریڈ کے لیے انگریزوں کے خلاف چالیس گھنٹے کی محنت شاقہ برداشت کرکے ۱۹ کالم کا مضمون، لکھا تھا۔ جس کی پاداش میں ۳ نومبر ۱۹۱۴ء کو کامریڈ

پریس کی ضمانت ضبط ہوئی اور وہ دس برس بند رہا۔ کامریڈ کی مسدودی کے بعد انھوں نے ان مضامین کا سلسلہ ''ہمدرد'' میں جاری رکھا۔ یہاں تک کہ وہ ۱۶ر مئی 1915ء کو چھندواڑے میں نظر بند کر دیے گئے۔ جس کے ساتھ ہی اگست ۱۹۱۵ء سے 'ہمدرد' بھی بند ہوا۔

۱۹۱۷ء میں مسلمانوں نے مولانا کو اپنی پہلی نمائندہ سیاسی انجمن مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا۔ چونکہ وہ قید میں تھے اس لیے کرسی صدارت پر ان کی تصویر رکھ دی گئی۔ اس عزت افزائی پر انھوں نے یوں اظہار خیال فرمایا تھا:

یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر	دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ	بال و پر نکلے قفس کے در کھلے
صیاد کیا ہوئی وہ تری خوئے احتیاط	مرغِ خیال کے نہ مرے پر کتر گئی

پانچ سال کے بعد مولانا ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے جلیان والا باغ کے قتلِ عام کے باعث سارے ملک میں ہلچل پیدا ہو گئی تھی، خلافتِ تحریک بھی زور پکڑ رہی تھی۔ کیونکہ جنگ کے اختتام کے بعد اتحادی، ترکی اور خلافت سے متعلق اپنی یقین دہانی سے پھر گئے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں نے تحریک خلافت کے ذریعے خلیفہ کے دینی و دنیوی اقتدار کی بحالی کے لیے باضابطہ مہم شروع کی۔ اس مہم میں مہاتما گاندھی جی نے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ اس طرح جوش قومی اور ہندو مسلم دوستی کی لہر سارے ملک میں پھیل گئی۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا جمعیتِ خلافت کے ایک وفد کی قیادت کرتے ہوئے یوروپ گئے اس وفد نے برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے وزرا کے علاوہ پاپائے روم سے بھی ملاقات کی اور خلافت کے مسئلہ پر مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا۔ مگر اس وفد کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس وفد کی ناکامی کے باعث ہندوستان میں مرکزی خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلمائے ہند کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں ان سرگرمیوں کے باعث مسلم لیگ اور کانگریس کو شانہ بہ شانہ کام کرنے کا موقع ملا۔

اسی اثناء میں کانگریس نے ۱۹۲۰ء کے اپنے کلکتہ اور ناگپور کے اجلاسوں میں انگریزوں سے عدم تعاون کی قرارداد منظور کی۔ مولانا محمد علی نے اس تحریک میں مہاتما گاندھی کا ساتھ دیا اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے سارے ملک کا دورہ کیا۔ اس تحریک کے زیر اثر انگریزوں کی ملازمتیں چھوڑ دی گئیں۔

خطابات واپس کیے گئے۔ بدیسی سامان کا مقاطعہ کیا گیا اور ملک میں جگہ جگہ قومی تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا محمد علی کی کوششوں سے ۱۹۲۰ء میں علیگڈھ ہی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی اور وہی اس کے اولین شیخ الجامعہ منتخب ہوئے جامعہ ملیہ کو بعدازاں دہلی منتقل کیا گیا اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ وہاں سے سچے خدا پرست اور وطن پرور ہندوستانی پیدا ہوں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ملک کی فضاء مکدر ہونے کے باوصف جامعہ ملیہ کے طلبہ واساتذہ نے تنگ نظری وتعصب سے دامن بچایا۔ مولانا محمد علی نے جب یہ اعلان کیا کہ مسلمانوں کے لیے برطانوی فوج کی نوکری حرام ہے تو انگریز حکومت نے ۱۹۲۱ء میں انھیں بیجاپور میں تقریباً دو سال قید تنہائی میں رکھا۔ اُن دنوں نظر بندی، جلاوطنی اور اسیری، روز کا معمول تھا۔ انھوں نے اپنے حال کی اسطرح عکاسی کی:

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال :: ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

بی اماں مرحومہ کے ذریعہ جب مولانا کو قید تنہائی میں یہ اطلاع ملی کہ مہاتما گاندھی گرفتار ہوگئے ہیں اور آپ کے غیاب میں تحریک عدم تعاون کمزور پڑ رہی ہے تو انھوں نے مہاتما گاندھی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے قوم کو انکی اہمیت کا اس طرح احساس دلایا:

یہ حالت ہوگئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے :: کہ خُم خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

اگست ۱۹۲۳ء میں مولانا کی رہائی عمل میں آئی تو وہ کانگریس کے دو گروہوں تغیر پسندوں اور غیر تغیر پسندوں میں مفاہمت کا ذریعہ بنے اسی سال اُن کا انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت کے لیے باتفاق رائے انتخاب ہوا۔ انھوں نے کاکی ناڈا کانگریس کے اجلاس کی صدارت کی۔ دس سال کے وقفہ کے بعد مولانا نے کا "مریڈ اور ہمدرد" کو دوبارہ جاری کیا۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو کامریڈ اور نومبر ۱۹۲۴ء کو ہمدرد کی اشاعت عمل میں آئی۔ مولانا نے پھر سے ان اخبارات کے ذریعہ ہندوستانی عوام پر واضح کیا کہ راہِ آزادی سے گریز، بزدلوں کا شیوہ ہے۔ وہ بڑی بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ اپنی منزل کی سمت رواں دواں رہے۔ راہ میں کئی روڑے آئے۔ مخالفتوں کا سامنا ہوا زحمتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ ذیابطیس کا مرض الگ جان کھائے جارہا تھا یہاں تک کہ ۱۹۲۶ء میں چار ماہ تک صاحب فراش رہے لیکن انھوں نے بیٹھے بیٹھے لیٹے لیٹے ملک و ملت کی خدمت انجام دی ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا تو ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے اس کا

مقاطعہ کیا۔ مولانا محمد علی نے بھی اس کمیشن کے خلاف دہلی میں بڑے پیانے پر مظاہرے منظم کیے کامریڈ اور ہمدرد کی مصروفیت کے علاوہ مولانا نے کانگریس، خلافت، مسلم لیگ جمعیۃ العلماء علی گڑھ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دیوبند، ندوہ اور موتمر عالم اسلام کی تحریکوں میں بھی حصہ لیا۔ اس طرح انھوں نے سیاست، صحافت، تعلیم، شاعری، مذہب، تحریکِ آزادی، تحریکِ خلافت اور اسلامی ممالک کی ترقی سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس سلسلہ میں انھیں قدم قدم پر کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اور ناکامیاں بھی۔ عوام نے انھیں ٹوٹ کر چاہا تو خواص نے مخالفت بھی کی۔ ظفر علی خاں سے انکی معاصرانہ چشمک تھی تو خواجہ حسن نظامی کو شکایت تھی کہ مولانا سیاست کو مذہب پر مقدم رکھتے ہیں۔ خود مولانا کے بعض ساتھیوں کا خیال تھا کہ ان کو لیڈری نے تباہ کر دیا۔ مسز اینی بیسینٹ نے انھیں دیوانے ملا کا لقب عطا فرمایا تھا۔ تو مولوی عبدالحق نے انھیں آتش فشاں پہاڑ اور گلیشیر سے تشبیہ دی علیگڈھ یونیورسٹی کے معاملے میں وہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر ضیاء الدین کی حکمتِ عملی سے اتفاق نہ کر سکے مہاتما جی اور موتی لال نہرو کے علاوہ انھیں اپنے پیر و مرشد مولانا عبدالباری سے بھی بعض اُمور میں اختلاف رہا، جن کا وہ برملا اظہار کرتے رہے۔ کامریڈ کے جاری رہنے تک اور اس کے بعد ہمدرد کی آخری اشاعت ...... اپریل ۱۹۲۹ء تک انھوں نے مختلف مسائل پر مضامین اور جوابی مضامین کا سلسلہ جاری رکھا۔ مولانا انگریزی اور اُردو کے زبردست انشاء پرداز اور مقرر تھے اردو شاعری میں بھی اپنے جوہر آشکار کیے، ان کی تحریریں مختلف حلقوں میں پسندیدگی سے پڑھی جاتی تھیں اور وہ تقریر کرنے پر آجاتے تو بقول رشید احمد صدیقی ایسا معلوم ہوتا کہ ابوالہول کی آواز اہرامِ مصر سے ٹکرا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی تحریروں اور تقریروں کا سیلاب مخالفتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے گیا۔ وہ کسی مخالفت کی پرواہ کیے بغیر اپنے مقصد کے حصول میں شب و روز مصروف رہے۔ اہلِ وعیال کے لیے تک وقت ملنا دشوار تھا۔ کئی کئی دن گزر جاتے بچوں کی شکل دیکھنے میں نہ آتی جب کام سے فارغ ہو کر سونے کو جاتے تو بیوی کو سوتا ہوا پاتے اور جب بیگم صبح کو بیدار ہوتیں تو وہ انھیں سوتا ہوا چھوڑ کر جاتیں ۱۹۳۰ء کے ناگپور، کانگریس میں بیگم صاحبہ ان کے ساتھ تھیں۔ کانگریس کے پہلے ہی دن بیگم پر انفلوئنزا کا شدید حملہ ہوا۔ مولانا کچھ دیر، مریضہ کی دوا دارو اور تیمارداری کرتے تو کچھ دیر کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوتے۔ اسی طرح بی اماں جب حالت نزع میں تھیں تو مولانا کامریڈ کے پروف پڑھنے میں مشغول تھے۔ انتقال کے بعد بھی تدفین کے

مرحلے تک جتنا بھی وقت ملا وہ کامریڈ کے لیے لیڈنگ آرٹیکل لکھتے رہے۔ بلاشبہ "محمد علی کی موت خانہ زاد تھی" موت انھیں مرعوب نہ کر سکی وہ اس سے خوفزدہ نہیں تھے وہ ہمیشہ دار و رسن کے طلبگار رہے وہ دار و رسن کی رسم کو پھر سے زندہ کرنا چاہتے تھے مولانا جوہؔر کے ان اشعار سے انکی دلی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

سُنتے ہیں یہ بھی ایک بزرگوں کی رسم تھی
اس دورِ اعتدال میں دار و رسن کہاں
جوہؔر نہ کیوں یہ رسم کہن زندہ کر چلیں
دار و رسن کے گرچہ نہ ہوں بانیوں میں ہم

اسی جذبے کے زیرِ اثر مولانا بیماری کی حالت میں ۱۹۳۰ء کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس لندن میں شریک ہوئے اور کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اپنی آخری تقریر میں بہ بانگِ دہل کہا "میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جاؤنگا جبکہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤنگا۔ اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو آپ کو مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی" بارگاہ ایزدی میں اس محب وطن سچے مسلمان کی دعا قبول ہوئی۔ جنوری ۱۹۳۱ء میں ان کا لندن ہی میں انتقال ہوا۔ ایسی موت بہت کم خوش نصیبوں کے حصہ میں آتی ہے۔ مولانا پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جن کا ہندوستان کے باہر اسلامی ملکوں میں بے حد ماتم کیا گیا اور خود ہندوستان میں لاکھوں سوگوار اس احساس میں شریک تھے "محمد علی کے بدلے میں ہندوستانی مسلمانوں کا بڑے سے بڑا لیڈر دیا جا سکتا تھا" مرحوم کے جسدِ خاکی کو فلسطین منتقل کیا گیا اور وہیں انکی آخری آرام گاہ ہے۔ مولانا جوہؔر ہی کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے:

قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

●●

(دسمبر 1982ء)

اقبال کا تصور وطنیت

اردو شاعری ابتدائی دور ہی سے قومی یک جہتی کے عناصر سے پُر ہے۔ دکن میں قلی قطب شاہ، ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی تو شمال میں فائز دہلوی، مرزا مظہر جانِ جاناں اور حاتم وغیرہ نے اس روایت کو فروغ دیا۔ میرؔ، سوداؔ اور غالبؔ کے یہاں بھی یہ عناصر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ پہلی جنگ آزادی کے ایک دہے بعد وطنی اور قومی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا تو نظیرؔ، حالیؔ، آزاد، اسمٰعیل میرٹھی، چکبستؔ اور شادؔ عظیم آبادی کے بعد اقبالؔ نے بھی وطنیت کے جذبے سے سرشار ہو کر نظمیں لکھیں۔ اقبال نے تقریباً چار دہوں تک شاعری کی۔ ان کے دس شعری مجموعے شائع ہوئے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہم وطنوں کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبات کو ابھارا۔ اقبال نے بانگ درا کی پہلی نظم ''ہمالہ'' ۱۹۰۱ء میں لکھی اور جس میں اپنے وطن کے پاسبان ''ہمالہ'' کی عظمت وتقدس کا اعتراف کیا:

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستان
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

اقبال نے اپنی مشہور نظم ''ترانہ ہندی'' ۱۹۰۴ء میں لکھی۔ اس وقت تک گاندھی جی ہنوز سیاست میں داخل نہیں ہوئے تھے اور پنڈت جواہر لال نہرو کی عمر پندرہ سال تھی۔ اس ترانہ نے آزادی کے متوالوں میں ایک جوش اور ولولہ پیدا کیا۔ ۱۹۳۸ء میں گاندھی جی نے ایڈیٹر رسالہ جوہر (اقبال نمبر) دہلی کے نام اردو میں خط لکھتے ہوئے یہ اعتراف کیا:

''اقبالؔ کے بارے میں کیا لکھوں لیکن میں اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم ''ہندوستان ہمارا'' پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور بروڈا جیل میں سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا اور خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم مرے کانوں میں گونج رہی ہے'' (محب وطن اقبالؔ۔ ص۔ ۲۵)

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بھی اس نظم کو سراہا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی اقبال کی وطن دوستی کے قائل تھے ان کے انتقال کی خبر سنی تو یوں خراج عقیدت پیش کیا:

''ابھی تھوڑی ہی مدت کی بات ہے کہ جب وہ بستر علالت پر تھے تو میں نے ان کے ساتھ ایک طویل بات چیت کی تھی۔ ان کی ذہانت اور آزادیٔ ہند کے ساتھ ان کی محبت سے بھی بہت متاثر ہوا تھا۔ ان کی موت سے افق ہندوستان پر ایک روشن اور تابناک ستارہ غروب ہو گیا''۔

ہمالہ اور ترانہ ہندی کے علاوہ اس طرح کی اور نظمیں صدائے درد، تصویر درد، نیا شوالہ، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت خصوصیت کی حامل ہیں۔

اقبال اسلام سے جذباتی وابستگی کے باوجود دیگر مذاہب کے تہذیبی ورثے سے باخبر تھے۔ انھوں نے 'رام' نانک، بھرتری ہری اور سوامی رام تیرتھ پر بھی نظمیں کہیں۔ سوامی رام تیرتھ اور اقبال میں گہرے مراسم تھے۔ قیام یوروپ کے دوران انھوں نے سوامی رام تیرتھ کا مدحیہ مرثیہ لکھا۔ انھوں نے شری کرشن کی مدح سرائی والہانہ عقیدت سے کی ہے۔ اقبال نے آفتاب (ترجمہ گائتری) اور رام جیسی نظمیں بھی لکھیں۔ آفتاب ۱۹۰۲ء میں لکھی۔ اس نظم میں انھوں نے ''سوتیور'' کا ترجمہ ''آفتاب'' کیا۔ یہ آفتاب آسمانوں سے پرے چمکنے والا سورج ہے جو کہ ارضی سورج کیلئے روشنی کا سرچشمہ ہے۔ ''رام'' ۱۹۰۸ء میں لکھی۔ اس وقت تک وہ بلادِ اسلامیہ اور ترانہ ملی جیسی نظمیں لکھ چکے تھے۔ اس نظم میں رام چندر جی کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے:

ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے، زمانے میں شام ہند

''آفتاب'' کو یزداں اور پروردگار قرار دینے اور رام کو 'امام' اور ''چراغ ہدایت'' کے الفاظ سے یاد کرنے پر اقبال پر کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ آفتاب میں اقبال کے ذاتی خیالات نہیں تھے لیکن انھوں نے رگ وید کے مشہور منتر گائتری منتر کا آزاد ترجمہ کیا ہے۔ رام بھی بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے۔ اس نظم میں ان

کی خدا پرستی، بہادری، پاک طینتی اور فرماں برداری کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اقبال نے غلامی اور محکومی کو بھی موضوع بنایا۔ غلامی کی پستی اور آزادی کی لامحدودیت کی طرف عوام کی توجہ مبذول کی:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اقبال نے برطانوی اقتدار کے ظلم و جبر، مکر وریا، استحصال و منافقت کے خلاف آواز اٹھائی۔ ہم وطنوں کی ناعاقبت اندیشیوں، غرض مندیوں اور تفرقہ پردازیوں پر سخت گرفت کی اور ملک کی آزادی کے لیے قومی اتحاد کی ضرورت پر زور دیا۔ اقبال نے اپنی مشہور نظم صدائے درد ۱۹۰۲ء میں لکھی جو اہل وطن کی نفاق انگیز روش کا نوحہ ہے۔ انہوں نے اپنی دردمندی کا اظہار اس طرح کیا ہے:

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو ایک قرب فراق انگیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

تصویر درد ۱۹۰۴ء میں لکھی۔ اس نظم میں بھی وطن دوستی کا رنگ غالب ہے۔ شاعر سوال کناں ہے۔ میرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے؟ اور وہ اہل وطن کو متنبہ کرتا ہے:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اقبال نے جب ترانہ ہندی لکھا تو وہ قوم پرست تھے اور ترانہ ملی لکھا تو فرقہ پرست ہو گئے۔ اس تاریخی حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یہ دونوں نظمیں تحریک آزادی کے مختلف ادوار میں

لکھی گئیں۔ ترکی کی خلافت پر خطرات منڈلانے لگے اور اس کے حصے بخرے کرنے کے منصوبے بنائے جانے لگے تو انڈین نیشنل کانگریس نے مہاتما گاندھی کی رہبری میں تحریک خلافت کو تحریک آزادی کا حصہ بنایا۔ کانگریس کے ممتاز رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری میڈیکل مشن کے ساتھ ترکی گئے۔ اس موقع پر اقبال نے ترانہ ملی لکھا جس کا عربی ترجمہ مولانا آزاد نے اپنے اخبار میں شائع کیا تھا۔ اقبال نے جلیانوالہ باغ، امرتسر پر بھی شعر کہے ہیں۔

ہر زائر چمن سے یہ کہتی ہے خاک باغ
غافل نہ رہ جہاں میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

وطن پرستی کے جذبات لے کر اقبال جب یورپ گئے تو انھیں وہاں کے معاشرے اور حکومتوں کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ انھیں احساس ہوا کہ یوروپ کے ممالک حب وطن کے نام پر دوسرے ممالک کو تباہ کرنے کے درپے ہیں اور کمزور اقوام کو اپنی حرص و ہوس کا نشانہ بنا رہے ہیں تو انھیں وطنیت کے اس محدود نظریے سے نفرت ہوگئی۔ انھوں نے مغرب کی غلامی کے خلاف آواز اٹھائی۔ ۱۹۰۷ء میں یوروپ سے واپسی کے وقت جو غزل لکھی اس کے مخاطب مغربی ممالک تھے:

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

انھوں نے اس طرح پہلی جنگ عظیم کی پیش گوئی کی تھی۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اقبال کے تصور وطنیت کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ وطن دوست تھے، وطن پرست نہیں۔ اسلام نے حب وطن کو ایمان کا تقاضا قرار دیتے ہوئے اس کی پرستش، بے جا طرفداری اور اس کے لیے اندھی عقیدت سے روکا ہے۔ اس لیے اقبال نے اپنی نظم ''وطنیت'' میں سیاسی تصور کے خلاف آواز اٹھائی:

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے
ان تازہ خداؤں میں سب سے بڑا وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

انھوں نے واضح کردیا کہ

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبال نے اپنی وفات سے ایک ماہ قبل مارچ ۱۹۳۸ء میں اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا ''قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان، اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں، ہندی کہلاتے ہیں کیوں کہ ہم سب کرۂ ارض کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حقیقت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنی جنم بھومی سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے۔ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اسی اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا قانون ہے۔ اس لیے حب وطن کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے''

(نقوش اقبال۔ص ۳۰۹۔۳۰۸، مولانا ابوالحسن ندوی، ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں)

اس طرح ابتدا سے آخر تک اقبال وطن دوست ہوتے ہوئے بھی اسلام کی آفاقیت کے قائل رہے۔
اس خصوص میں ماہر اقبالیات جناب جگن ناتھ آزاد کا یہ بیان بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

''دراصل اقبال کا دل ایک دیوان عام تھا جس میں بچوں کی بڑوں کی، وطن کی، اسلام

کی اور دنیا بھر کی محبت سمائی ہوئی تھی۔ اقبال کے حب وطن اور حب اسلام میں کوئی تضاد نہیں۔ جس طرح عظیم فلسفی ڈاکٹر رادھا کرشنن کو ہندوستان اور ہندو دھرم دونوں سے محبت تھی جس طرح مولانا آزاد کا دل ہندوستان اور اسلام دونوں کی محبت سے لبریز تھا"۔ (اقبال زندگی شخصیت اور شاعری، جگن ناتھ آزاد، ص ۶۳۔۶۲)

اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ بانگ درا کی اشاعت کے بعد اقبال کے جذبۂ حب وطن میں کمی آئی۔ ان کی تیسرے دور کی شاعری میں بھی جو عام طور پر اسلامی دور کی شاعری کہی جاتی ہے وطنیت کے جذبات بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ یہ جذبہ ان کے ہاں آخر تک ملتا ہے ان کی وطن دوستی نے اپنے فرزند جاوید کو یہ پیغام دیا:

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احسان
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

جاوید نامہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ اقبال سیر افلاک کے دوران بھی اپنے وطن کی یاد سے غافل نہیں رہے۔ جہاں ان کی ملاقات ہندوستان کی عظیم شخصیتوں مہاتما بدھ اور بھرتری ہری سے ہوتی ہے، فلک زحل پر اقبال کا سامنا روح ہندوستان سے ہوتا ہے۔ ملاقات کے پہلے منظر میں اقبال نے ہندوستان کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے وطن سے والہانہ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ روح ہندوستان غلامی سے نالاں اور غداران وطن میر جعفر و میر صادق کی ملعون روحوں سے پناہ مانگتی ہے۔ جہنم کی آگ بھی ان روحوں کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ اس سے اقبال کی وطن دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ ضرب کلیم جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی ان کے آخری دور کی شاعری ہے جس میں انھوں نے غلامی کو ہدف ملامت بنایا ہے اور ہم وطنوں سے شکایت کی ہے:

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند
یوروپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو گلہ تجھ سے ہے یوروپ سے نہیں

ضرب کلیم کی ایک نظم "شعاع امید" میں ایک شوخ کرن کے ذریعہ نہ صرف مشرق بلکہ اپنے ملک

ہندوستان سے دلی وابستگی کا اظہار کیا ہے اور موثر طریقہ سے وطنیت کی حمایت کی ہے:

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خذف ریزہ دُر ناب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

بعض حلقوں میں علامہ اقبال کو دو قومی نظریہ کا حامی اور قیام پاکستان کا محرک قرار دیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ جناب سید مظفر حسین برنی سابق گورنر ہریانہ نے اپنی کتاب ''محب وطن۔ اقبال'' میں ایک باب ''اقبال اور پاکستان'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ جس میں وہ رقم طراز ہیں۔ ''حال ہی میں اقبال کے کچھ خطوط دریافت ہوئے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ انڈین یونین کے اندر ایسی خودمختار ریاست کے حق میں تھے جو پنجاب، شمال مغرب سرحدی صوبہ اور بلوچستان پر مشتمل ہو، جس کی تصدیق ان کے خطبہ صدارت سے ہوتی ہے جو انھوں نے ۲۹ ردسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ میں پڑھا تھا۔ ایڈورڈ تھامس نے اقبال کے خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' پر Observer لندن میں تبصرہ کرتے ہوئے نظریہ پاکستان سے خلط ملط کر دیا۔ اس پر اقبال نے تھامس کو لکھا، ''آپ مجھے نظریہ پاکستان کا حامی قرار دیتے ہیں مگر میرا منصوبہ پاکستان نہیں ہے۔ میں نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو تجویز پیش کی تھی وہ ہندوستان کے شمال مغرب میں صرف ایک مسلم صوبہ کی تشکیل ہے جو ہندوستانی وفاق کا ایک صوبہ ہوگا''۔

(محب وطن اقبال طبع دوم۔ ص ۱۴۰)

دراصل چودھری رحمت علی نے ۱۹۳۵ء میں ایک کتابچہ Pakistan The Father of the Pak nation لکھا تھا جس کے مطابق مسلمانوں کی ایک جداگانہ ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے جو راست انگلستان سے مربوط ہو۔ علامہ اقبال کے علاوہ محمد علی جناح نے بھی اس کی مخالفت کی تھی۔ اس کی تفصیلات فرینک مورلیس کی کتاب Witness to an Era صفحہ ۸۰ پر مل جاتی ہیں۔ اقبال کے

تصورِ وطنیت اور قومیت میں بظاہر جو تبدیلی نظر آتی ہے اس کا سبب ان کا ذہنی ارتقا ہے۔ اس تبدیلی کو جذبۂ محبت کی تبدیلی نہیں بلکہ معنی و مفہوم کی وسعت قرار دے سکتے ہیں۔ انھوں نے کسی بھی مرحلہ پر وطن کی محبت کو ترک نہیں کیا بلکہ وطن دوستی سے ایک دنیا، وحدت عالم One world اور آفاقیت کی طرف جست لگائی۔ اقبال نے قومیت کا تصور قرآن سے اخذ کیا اور وہ دنیا کے تمام انسانوں کو خدائے واحد کی مخلوق اور ایک آدم کی اولاد قرار دے کر رشتہ اُخوت اور بھائی چارگی کو استحکام بخشنے کے خواہاں تھے۔ انھوں نے مشرق و مغرب کے ہر ممکنہ سرچشموں سے فیضان حاصل کیا۔ انہیں رنگ و نسل اور علاقائی بنیاد پر انسانوں کا انتشار گوارا نہیں تھا:

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو
اُخوت کا بیاں ہوجا، محبت کی زباں ہوجا
یہ ہندی و خراسانی یہ افغانی و تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بیکراں ہوجا

●●

(2006ء)

اردو کی ادبی تحریکیں: ایک جائزہ

جب زندگی پر ایک رنگی و یکسانیت غالب آجائے اور اس کا اثر ایک طویل عرصہ تک جاری رہے تو ہم جمود کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی جمود زندگی کے ارتقائی سفر میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس جمود کو توڑ کر ہمہ رنگی اور تنوع پیدا کرنے کا عمل تحریک ہے۔ مذہب، فلسفہ اور سائنس کے انکشافات ہی نئی تحریکوں کو پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ اور یہ تحریکیں ادب اور قارئین پر بالواسطہ اور بلاواسطہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ فکر اور عمل کے ایک مخصوص دور کے بعد ان تحریکوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے وہ اتنی کمزور ہو جاتی ہیں کہ ان کی جگہ ایک نئی فعال تحریک ابھرتی ہے۔

عالمی ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی تاریخ کا جائزہ لیں تو اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ہر تحریک ایک مخصوص عرصہ تک تقویت پا کر روبہ زوال ہوئی اور اس نے دوسری تحریک کیلئے راہ ہموار کی۔ اردو ادب کی اصناف کی طرح بہت ساری تحریکیں بھی مغرب سے در آئیں، ان میں رومانویت، وجودیت، سرریلزم (Surrealism)، تجریدیت، علامت نگاری، تاثریت، مارکسزم اور جدیدیت کو اہمیت حاصل ہے۔

رومانوی تحریک:

اٹھارویں صدی عیسوی میں مغرب میں فرد کی داخلیت اور فطرت کی خارجیت میں بُعد بڑھتا گیا تو تخلیقی اُبال کو اخراج کا فطری راستہ نہ مل سکا۔ اس جامد فضا سے ادب کی رومانی تحریک ابھری، رومانوی ادب میں پُر شکوہ اور آراستہ پس منظر میں عشق و محبت کے واقعات پیش کیے گئے۔ رومانیت اس داخلی قوت کا نام ہے جو نامعلوم کو دریافت کرنے اور نئی شئے کی تخلیق پر آمادہ کرتی ہے چنانچہ یوٹوپیا کی تخلیق اور عینیت پسندی رومانیت کے اہم رجحانات میں شمار ہوتے ہیں اس تحریک کے اردو نثر نگاروں میں عبدالحلیم شرر، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، سجاد انصاری، نیاز فتح پوری وغیرہ شامل ہیں۔ رومانوی شاعروں میں اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، حامد اللہ افسر، ساغر نظامی، روش صدیقی، احسان دانش، سکندر علی وجد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس تحریک سے متاثر افراد نے شاعرانہ نثر اور رومان پرور شعروں سے حسن و شباب اور رنگ و نور کی فضا تخلیق کی۔ انجام یہ ہوا کہ شاعر و ادیب اپنی خوش ذوقی کے دائرہ میں محصور ہو گئے۔

فورٹ ولیم کالج کی تحریک:

1800ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام وقت کی کا منصوبہ تھا جو ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی سرکردگی میں وجود میں آیا۔ اگر چہ اس کے قیام کے محرکات سیاسی تھے لیکن اس نے ادب کو بھی متاثر کیا۔ اس کا ایک اور مقصد فارسیت کی حاکمیت کو کم کرنا اور اردو ہندی اور بنگالی کو الگ الگ زبانوں میں ابھارنے کا موقع فراہم کرنا تھا۔ اس کالج نے اپنے مصنفوں کے ذریعے سادگی اور سلاست سے پرفن پارے پیش کیے۔ ایک عام فہم اور سادہ اسلوب نگارش رائج کیا۔ کالج کی کتب میں لفظی ترجمے پر زور نہیں دیا گیا بلکہ مفہوم کو اردو کا جامہ پہنانے کی سعی کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ میر امن کی باغ و بہار، حیدر بخش حیدری کی طوطا کی کہانی، نہال چند لاہوری کی مہذب عشق کے تراجم میں زبان رواں دواں نظر آتی ہے۔

اس تحریک سے اردو کو جو فوائد حاصل ہوئے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اردو کو مشکل گوئی اور ادق نگاری سے نجات ملی۔

۲۔ فارسی آلود اسلوب متروک ہوا۔

۳۔ سلیس نثر نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔

۴۔ اردو کے داستانی ادب کو بڑھاوا ملا۔

۵۔ اردو صرف ونحو، قواعد وضوابط اور لغت کی مستند کتابیں فراہم ہوئیں۔

اس کے برعکس حسب ذیل نقصانات بھی ہوئے۔

۱۔ مقامی باشندوں کے لسانی اختلافات اُبھر کر آئے۔

۲۔ ہندی، اردو اور بنگالی کو باہم متصادم ہونے کا موقع فراہم ہوا۔

۳۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہندی اور اردو جو ایک زبان تھی جسے گاندھی جی نے ہندوستانی کہا تھا اسے دو زبانوں میں تقسیم کیا گیا اس طرح دیوناگری رسم خط کے ساتھ ہندی علاحدہ زبان قرار دی گئی۔

علی گڑھ تحریک:

علی گڑھ اور سرسید ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ سرسید کو مذہب اور تاریخ میں یکساں دلچسپی تھی ان کا تفکر سائنسی انداز نظر اور عصری علوم کی ترویج کے لیے کوشاں تھا۔ سرسید کی ذات میں قدامت اور جدیدیت دونوں کا امتزاج تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمارے طلبہ اسلامی عظمت و رفعت کے ساتھ ساتھ مغربی علوم سے بھی

استفادہ کریں انھوں نے نئے علوم کے لیے ہمیشہ اپنے ذہن کی کھڑکیاں کھلی رکھیں۔ انھوں نے عقل سلیم کے ذریعے اسلام کی مدافعت کی اور ثابت کر دیا کہ اسلام زمانے کے نئے تقاضوں کو نہ صرف قبول کرتا ہے۔ بلکہ نئے حقائق کی عقلی توضیح کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ انھیں اپنے منصوبوں پر عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے با اعتماد ساتھیوں الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، نواب محسن الملک اور چراغ علی کی رفاقت حاصل تھی۔

اس تحریک نے مذہبی تنگ نظری، تعصب اور انتشار کو کم کیا۔ اس سے اردو زبان کی وسعت میں اضافہ ہوا۔ علی گڑھ تحریک ہی کا نتیجہ ہے کہ اردو کا ایک باوقار، سنجیدہ، متوازن معیار قائم ہوا۔ اس تحریک نے سائنسی نقطہ نظر اور اظہار کی صداقت کو اہمیت دی اور اسلام اور بانی اسلام کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش کی۔

35 سال کے مختصر عرصہ میں اس تحریک نے ادب کی مختلف اصناف میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان کی معنویت اور اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کے کٹر سے کٹر مخالفین بھی ان کے اخلاص کے معترف تھے۔ اکبر الہ آبادی کا خراج ملاحظہ ہو:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے، کہنے اور کرنے والے میں

ترقی پسند تحریک:

علی گڑھ تحریک کے بعد یہ دوسری اور اہم منظم تحریک تھی۔ اس تحریک کا نظریہ ساز کارل مارکس تھا جس نے انسان اور اس کی مادی دنیا کو بنیادی اہمیت دی۔ اس کے مطابق ادب کی تخلیق داخل کی غواصی کا اتفاقی یا وجدانی حادثہ نہیں بلکہ سماجی عوامل، مادی حالات، معاشی اسباب اور علل کا بدیہی نتیجہ ہے۔ اس تحریک کا اثر مارکس کی وفات 1883 کے بہت بعد 1917 کے انقلابِ روس کے ذریعہ ظاہر ہوا۔ ترقی پسند تحریک، ادب لطیف کے رجحان اور حسن پرستی کی شدت اور مذہب کی رجعت پسندی کے خلاف تھی اس تحریک سے ایک ایسا رجحان پیدا ہوا جس میں گھن گرج اور بلند آہنگی شامل تھی۔ دسمبر 1932ء میں اردو کے نئے افسانوں کی کتاب ''انگارے'' شائع ہوئی تو یہ روایت سے بغاوت کا اعلان تھا اور ترقی پسند تحریک کا نقطہ آغاز بھی۔

انگارے کے مصنفین میں احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر شامل تھے۔ انگارے کے بعد

احمد علی کی کتاب ''شعلے'' اور اختر حسین رائے پوری کا مقالہ ''ادب اور زندگی'' نے ترقی پسند نظریات کے فروغ کے لیے زمین ہموار کی۔ ترقی پسند تحریک کے اولین اعلانیہ کے ذریعہ ہندوستانی ادیبوں کو للکارا گیا تھا کہ وہ ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسندوں کی حمایت کریں اور ایسا ادب خلق کریں جس سے خاندان، مذہب، جنس اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کی روک تھام ہو سکے، اور تلقین کی گئی کہ نیا ادب زندگی کے بنیادی مسائل بھوک، پیاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل کو موضوع بنائے۔ اس اعلان نامہ پر منشی پریم چند، حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین، نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی، قاضی عبدالغفار، علی عباس حسینی اور فراق گورکھپوری نے دستخط کیے تھے۔ ترقی پسندوں کی پہلی کانفرنس اپریل 15 / 1936 کو لکھنو میں منعقد ہوئی جس کا خطبہ صدارت منشی پریم چند نے پڑھا۔ دوسری کانفرنس 1938 میں کلکتہ میں منعقد ہوئی تھی اس کا خطبہ صدارت رابندر ناتھ ٹیگور نے دیا تھا۔ تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی جو ادبی گروہ سامنے آیا اس میں سبط حسن، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، اوپندر ناتھ اشک، سلام مچھلی شہری، عصمت چغتائی، اختر انصاری، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، احتشام حسین، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی وغیرہ شامل تھے۔

ترقی پسند تحریک نے ادب میں سیاست کا نقطہ نظر آزمانے کی کوشش کی تو اس تحریک کا دائرہ تخلیق محدود ہو گیا۔ ادبا اور شعرا نے جانب داری کے ساتھ ساتھ جارحانہ انداز اختیار کیا۔ علی سردار جعفری کا شعر ملاحظہ ہو

میرے ہاتھ سے میرا قلم چھین لو
اور مجھے ایک بندوق دے دو

مجاز نے بھی کہا تھا:

تخت سلطان کیا میں سارا قصر سلطان پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

غزل گو شعرا نے بھی دبی دبی زبان سے باغیانہ خیالات کا اظہار کیا۔ غلام ربانی تاباں کا شعر ملاحظہ ہو:

ہم بھی مسجد کے ارادے سے چلے تھے لیکن
میکدے راہ میں حائل تھے جدھر سے گزرے

مجروح کی فکر بھی جانبدارانہ تھی:

لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کر رہے گا
ہو کے رہے گی دھرتی اپنی ملک ہمارا ہو کے رہے گا

ترقی پسندوں کی اس روش سے وہ ادبا اور شعرا جو مارکسزم کے حامی نہیں تھے اس تحریک سے الگ ہو گئے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تحریک نے اردو ادب کو افسانہ نگار کرشن چندر، عصمت چغتائی، ابراہیم جلیس، خواجہ احمد عباس، احمد علی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، عابد سہیل، شاعروں میں فیض احمد فیض، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر، مجاز، ساحر، کیفی اعظمی وغیرہ اور تنقید میں اختر حسین رائے پوری، اختر انصاری، سجاد ظہیر، احتشام حسین، محمد حسن، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، ممتاز حسین جیسے بالغ نظر نقاد دیے۔ ترقی پسند ادب میں پروپگنڈہ تشہیر اور تبلیغ کا عنصر وافر مقدار میں شامل ہوا تو یہ تحریک زوال پذیر ہوئی۔ سوویٹ یونین کے انتشار نے تو اس تنظیم میں آخری کیل ٹھونک دی اگر یہ تنظیم زندہ بھی ہے تو فعال نہیں۔ اس کی انتہا پسندی نے اسے سخت نقصان پہنچایا۔

حلقہ ارباب ذوق:

ترقی پسندی کے برعکس لاہور میں قائم حلقہ ارباب ذوق نے داخلی سوز و گداز، اندرونی ربط، نجی علامتوں کے استعمال اور آزاد خیالی کے ذریعہ ہیئت اور پیرایۂ اظہار میں انوکھے تجربے کیے ان کے ہاں احساس جمال زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق کے ادبی رہنماؤں میں تصدق حسین خالد، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ن۔م۔راشد، اور میرا جی تھے۔ مگر نمایاں مقام ن۔م۔راشد اور میرا جی نے حاصل کیا۔ یہ حلقہ ابتدا میں بزم داستاں گویاں کے نام سے مشہور تھا۔ اس سے متعلق ادیب جماعتی پابندیوں سے آزاد ادب پر زور دیتے تھے۔ اس حلقہ کے قابل ذکر شاعروں میں قیوم نظر، مختار صدیقی، یوسف ظفر، انجم رومانی، شہرت بخاری، شہزاد احمد اور اختر الایمان تھے۔ اس حلقہ کے افسانہ نگاروں میں شیر محمد اختر، راجندر سنگھ بیدی، محمد حسن عسکری، سعادت حسن منٹو، انتظار حسین اور انور سجاد شامل تھے۔ حلقہ ارباب ذوق کی تنقید کو میرا جی، محمد حسن عسکری اور وزیر آغا نے فروغ دیا۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی، حفیظ ہوشیار پوری، تصدیق حسین خالد، اور شیر محمد اختر اس کے سرگرم اراکین تھے۔ حلقہ ارباب ذوق کا ترجمان "نئی تحریریں" 1955 میں شائع ہوا جس کی مجلس ادارت میں قیوم نظر، امجد الطاف اور شہزاد احمد تھے۔ یہ رسالہ پانچ اشاعتوں کے

بعد 1957 میں بند ہوا۔ 1979 تک اس حلقہ کا کسی نہ کسی نوع وجود باقی تھا اس حلقے کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اس نے مادیت سے گریز اختیار کرتے ہوئے روحانیت اور داخلیت کو فروغ دیا۔

جدیدیت:

سائنسی ترقیوں اور صنعتی ماحول نے ایک طرف مشینی آسائشیں مہیا کیں تو دوسری طرف مہلک وتباہ کن ہتھیاروں کے بھیانک انجام نے نئی نسل کو اپنے خول میں سمٹنے پر مجبور کردیا۔ ہندوستانی سماج کی نفسانفسی اور معاشی وجنسی گھٹن کی فضا میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا۔ مذہبی سماجی، اخلاقی اقدار کی شکست اور ریخت کے زہر کو اپنے رگ وپا میں اتارا۔ اب ادب کو کسی طے شدہ راستہ پر چلنا ممکن نہ رہا۔ اس نے طے شدہ فنی راستے سے وابستگی اور وفاداری کو یکسر رد کردیا۔ حلقہ ارباب ذوق کے ادبا اور شعرا نے جو مشعل جلائی وہ ان کے لیے رہنما بن گئی۔ شب خون الہ باد کے اجرا نے اس نئے رویے کو پھیلنے میں مدد دی۔ نیا طرز احساس نیا لب ولہجہ، ابہام اور نئی علامتوں کا استعمال نئی ترکیبیں اور نئے الفاظ کثرت سے ادب میں جگہ پانے لگے۔ اس کا مظاہرہ بعض ادبا اور شعرا نے فیشن کے طور پر کیا جس کے باعث ادب میں یکسانیت پیدا ہوئی اور وہ نیرنگی اسلوب سے محروم ہوا۔ اور افسانے چیستاں بن گئے ترسیل کا المیہ وقوع پذیر ہوا۔ یہ بھی کہا گیا کہ اس رجحان کے ادیبوں اور شاعروں کو قارئین کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت کے تحت بعض بہت اچھے افسانے، نظمیں اور غزلیں تخلیق پانے کے باوجود آج مابعد جدیدیت کی بات کی جارہی ہے۔

تحریک ادب اسلامی:

یہ امر واقعی ہے کہ اردو زبان وادب میں اسلامی تحریک سترہویں صدی کے وسط ہی سے جاری تھی۔ خاندان ولی اللہؒ کے تراجم قرآن، خواجہ میر درد، مظہر جانِ جاناں، مومن، حالی اور اقبال کی شاعری شبلی، سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، مولانا اشرف علی تھانوی، عبدالماجد دریابادی، ابوالاعلیٰ مودودی کی نثری تصانیف نے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ تحریک ادب اسلامی کے معرض وجود میں آنے کا سبب کیا ہے؟ اس کی بڑی وجہ ترقی پسند تحریک کا اختیار کردہ طرز عمل تھا جس نے ادب برائے انقلاب کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اشتراکیت کی تشہیر کو اپنا منصب قرار دیا۔ اس طرح ردعمل کے طور پر ادب اور فن کے ذریعہ اسلامی نظریات کو عام کرنے کے لیے ایک نئی تحریک کی طرح ڈالی گئی۔

تحریک ادب اسلامی کی جہت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی فکری روش کی مرہون منت ہے۔ اس تحریک نے بھی اپنا ایک منشور تیار کیا اور اپنے رفقا سے قبولیت کے دستخط حاصل کیے۔ اس تحریک کی خارجی جہت نے الحاد، بے دینی، فحاشی اور عریانی کو نشانہ بنایا۔ اور بلاواسطہ ہر اس نظام فکر کی مخالفت کی جو اسلامی نظریات کے مغائر تھا۔ ابتدا میں 1948 میں ترقی پسند مصنفین کے مقابلے میں تعمیر پسند مصنفین کے نام سے ادبی حلقہ بنا اور کراچی میں بھی حلقہ ادب اسلامی قائم ہوا۔ 1949ء میں لاہور کے کنونشن میں اس حلقہ کا نام حلقہ ارباب اسلامی پاکستان قرار پایا۔

ہندوستان میں بھی جماعت اسلامی کے زیر سایہ 1954 میں ادارہ ادب اسلامی وجود میں آیا۔ ابن فرید، محمد نجات اللہ صدیقی، فضل الرحمن فریدی، انور اعظمی نے اس تنظیم کو مستحکم کیا۔ نعیم صدیقی، اسد گیلانی، ابن فرید، فروغ احمد، نجم الاسلام، خورشید احمد، اسرار احمد سہاروی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (اقبالیات) ڈاکٹر عبدالمغنی، ڈاکٹر سید عبدالباری، مولانا طیب عثمانی ندوی، ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی، ڈاکٹر احمد سجاد، پروفیسر عبدالحق، شاہ رشاد عثمانی، خالد عرفان، روف خیر وغیرہ جیسے ناقدوں نے اس ادب کی آبیاری کی۔ اس تحریک سے وابستہ شاعروں میں نعیم صدیقی، ماہر القادری، روش صدیقی، شفیق جونپوری، عامر عثمانی، حفیظ میرٹھی، ابوالمجاہد زاہد، شفیع مونس، کلیم عاجز، ابوالبیان حماد، مسعود جاوید ہاشمی، انتظار نعیم، تابش مہدی، روف خیر، عزیز بلگامی، مظہر محی الدین، حنیف شباب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ افسانہ نگاروں میں نعیم صدیقی، اسد گیلانی، جیلانی بی اے، محمود فاروقی، محمود عالم، قیصر قصری، لالہ صحرائی، ابن فرید، فیاض قریشی، ضیا کرناٹکی، اہمیت کے حامل ہیں۔ اس تحریک نے فرد کو داخلی طور پر متحرک کرنے کے بجائے خارجی طور پر متحرک کرنے کی سعی کی۔ اس تحریک کی تنقید نے معاصر ادب کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اسلامی ادب پر توجہ مرکوز کی، تقابلی جائزہ کے ذریعہ اسلامی ادبا کی تخلیقات کا جائزہ نہیں لیا۔ یہ ایک مقصدی تحریک ہے جس کے پیش نظر اسلامی افکار و نظریات کی روشنی میں اخلاقیات کے بگڑتے ہوئے نظام کی اصلاح ہے۔

اس لیے یہ تحریک صالح معاشرے کے قیام کے لیے کوشاں ہے یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کی معنویت آج بھی سانس لے رہی ہے۔ اس مقالے میں ابتدا تا عہد حاضر اردو ادب پر بعض تحریکوں کے اثرات کا اختصار سے جائزہ لیا گیا ہے۔ انسانی زندگی کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ ساتھ مستقبل میں بھی نئی تحریکیں ابھریں گی جن سے اردو ادب بھی متاثر ہوتا رہے گا۔ ●●

(2010ء)

اُردو تنقید : الطاف حسین حالؔی سے مابعد جدیدیت تک

اصناف ادب میں جس صنف کو خصوصی اہمیت حاصل ہے وہ تنقید ہے۔ تنقید پرکھنے یا خوبی وخامی کے فرق کو ظاہر کرنے کا رویہ ہے۔ ادب کی اصطلاح میں کسی فن پارے کے محاسن اور معائب کا تجزیہ کرتے ہوئے صحیح رائے قائم کرنا، تنقید ہے۔ صرف نکتہ چینی یا مدح سرائی تنقید نہیں۔ اردو کے ممتاز نقاد آل احمد سرور نے تنقید کو سائنس قرار دیا ہے۔ جو معروضیت سکھاتی ہے۔ انگریزی کے معروف نقاد رچرڈز نے نقاد کو طبیب قرار دیتے ہوئے کہا ہے ”جو کام ایک ڈاکٹر جسم کے لیے کرتا ہے، تنقید ادب کے لیے کرتی ہے۔ وہ ذہنی صحت کا معیار قائم کرتی ہے۔“

اس اظہار میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اُردو تنقید بھی بیشتر اصناف کی طرح مغرب کے زیر اثر پروان چڑھی۔ یونانی فلسفی ارسطو کی بوطیقا فن شاعری پر پہلی تنقیدی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ افلاطون اور ہومر کے پاس بھی شاعری سے متعلق تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔ نشاۃ ثانیہ کے دور میں بین جانسن کلاسیکی تنقید کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر مشرق میں تنقید کی ابتدا عرب سے ہوئی۔ عربوں میں سخن سنجی اور شعر فہمی کا ملکہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ شعر گوئی کے معرکوں کے ذریعے ایک دوسرے کے اشعار پر تنقید بھی ہوتی۔ عباسیہ دور میں تنقید کے اُصول بھی مرتب کیے گئے۔ اس خصوص میں ابن جعفر قدامہ کی کتاب ”نقد الشعر“ کو اولیت حاصل ہے۔ عربی تنقید کا اثر فارسی نے قبول کیا اور فارسی سے اُردو تک پہنچا۔ مشاعروں میں شعرا ایک دوسرے کے شعروں پر اعتراض و تنقید کیا کرتے تھے۔ شاعری کے ابتدائی دور میں ملا وجہی نے قطب مُشتری میں شعر کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے:

جسے بات کے ربط کا فام نہیں :: اُسے شعر کہنے سوں کچ کام نہیں

ولؔی نے اپنا نظریہ اس طرح پیش کیا:

ولؔی شعر میرا سراسر ہے درد :: خط و خال کی بات ہے خال خال

اس طرح کا خیال میرؔ کے یہاں بھی موجود ہے:

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے :: درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میرؔ کو اپنے اسلوب کے بارے میں بھی علم تھا:

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے :: ہماری گفتگو کا ڈھب جدا ہے

تنقید کی ترویج و ترقی میں فارسی اور اُردو میں تحریر کردہ تذکروں کا اہم رول ہے۔ ان میں میرؔ کا نکات الشعراء (۱۷۵۰ء) اُردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس سے شعرا کے حالات، اس عہد کے ادبی رجحانات کے علاوہ شاعر (میرؔ) کے معیار اور نظریہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ دیگر تذکروں میں مخزنِ نکات (قیام الدین قائم۔ ۱۱۶۸ھ) میر حسن کا تذکرہ شعرائے اُردو (۷۷۔۱۷۷۳ء) میر لطف علی کا گلشن ہند (۱۷۸۴ء) نور خاں قاسم کا مجموعہ نغز، لچھمی نارائین شفیق کا چمنستانِ شعراء، تمنا اورنگ آبادی کا گل عجائب، مصطفیٰ خان شیفتہ کا گلشنِ بے خار، کریم الدین کا طبقات الشعراء، مرزا قادر بخش صابر کا گلستانِ سخن اور لالہ سری رام کا خُمخانہ جاوید قابل ذکر ہیں۔ تذکروں کے بعد کتابوں کی تقریظوں میں بھی اُردو تنقید کی روایت ملتی ہے۔

اُردو تنقید کے ارتقا میں تحریکوں اور نظریات کا رول بھی خاصا اہم ہے۔ خصوصاً علی گڑھ تحریک نے ادب کو زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ اُسی کے نتیجے میں عقلیت، حقیقت پسندی، افادیت اور سماجی ضرورتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ اُردو علمی زبان بنی۔ نثر و نظم کی اصناف کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اُردو تنقید نے بھی نئی کروٹ لی۔ نئی تنقید کی ابتدا سر سید کے رسالے تہذیب الاخلاق سے ہوئی۔ شبلی اور آزاد کے مقابلے میں حالیؔ نے تنقید کی طرف خاص توجہ کی۔ مقدمہ شعر و شاعری جو اُن کے دیوان کا مقدمہ ہے۔ اُردو تنقید کی پہلی کتاب قرار دی گئی ہے۔ بعض نقادوں کی رائے میں ''اُردو تنقید اپنی تمام وسعتوں کے باوجود آج تک اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں پیش کر سکی''۔ ان کی دوسری تصانیف حیاتِ جاوید، حیاتِ سعدیؔ، یادگارِ غالبؔ اگر چہ سوانح عمریاں ہیں ان میں بھی تنقیدی مواد موجود ہے۔ ان کی ایک اور کتاب ''مقالات حالیؔ'' میں ان کے مضامین اور تبصرے شامل ہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری ان کی نظری و عملی تنقید کا مکمل نمونہ ہے۔ اس میں شعر کی تاثیر، اسکی مثالیں، شعر کی عظمت اچھی اور بُری شاعری، شاعری کی اصلاح، شعر کی ماہیت، شاعری کی شرطیں، آمد و آورد میں فرق، شاعری میں جھوٹ اور مبالغے سے احتراز نیز غزل کے مضامین کا احاطہ

کیا گیا ہے۔ حالؔی چاہتے تھے کہ شعر کسی بلند مقصد اور اچھے کام کے لیے استعمال ہو۔ اچھا شاعر ہونے کے لیے ان کے یہاں تین شرطیں ضروری ہیں۔ ۱۔ تخیل (قوتِ متخیلہ) ۲۔ کائنات کا مطالعہ (نیچر کے مطالعے کے علاوہ) ۳۔ تفحصِ الفاظ (الفاظ کا صحیح استعمال)۔

تخیل یا Imagination ایسی قوت ہے جو شاعر کو غیر شاعر سے ممیز کرتی ہے۔ یہ قوت شاعر میں جس درجے کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجے کی ہوگی۔ شاعر کائنات میں گہری نظر سے خواص و کیفیات کا مشاہدہ کرے جو عام آنکھوں سے مخفی ہوں اور فکر میں مشق و مہارت سے ایسی طاقت پیدا کرے جو مختلف چیزوں سے متحد اور متحد چیزوں سے مختلف خاصیتیں فوراً اخذ کرے۔ تفحص الفاظ سے مراد یہ کہ انتخاب کے ذریعے مناسب الفاظ کو اس طرح ترتیب دے کہ شعر کے معنی و مفہوم کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردد باقی نہ رہے۔ حالؔی ایک بیدار مغز نقاد تھے۔ جنھوں نے پرانی روایات کے مقابلے میں نئی اقدار کی ترویج ضروری سمجھی۔ ان پر مغرب کے اثرات بھی تھے۔ انھوں نے ملٹن اور مکالے کے خیالات سے استفادہ کیا۔

حالؔی نے بقول آل احمد سرور ''شاعری اور سماج کے براہ راست تعلق پر زور دے کر ادب کو ایک سماجی آلہ قرار دیا۔ انھوں نے شعر کو حکمت کے مقابل ٹھیرا کر اُسے حقیقت کا دوسرا ادراک قرار دیا۔'' پروفیسر کلیم الدین احمد جو حالؔی کے بہت زیادہ طرفدار نہیں، تسلیم کرتے ہیں کہ حالی سے پہلے تنقیدی شعور ناپید تھا۔ انھوں نے شعر میں سادگی، اصلیت اور جوش کو بنیادی اہمیت قرار دے کر لفظ پرست یا مبالغہ کے رسیا شاعروں اور آسمان کے رہنے والوں کو زمین کا حسن دکھایا'' حالؔی نے اپنی شاعری میں ان ہی خصوصیات کو برتا اس کا احساس ہم داغؔ اور حالؔی کی شاعری کے موازنے سے کر سکتے ہیں۔ دونوں نے ایک ہی زمانہ پایا، اس کے باوصف داغؔ کے یہاں رونق، ہنگامہ، دلکشی تو حالؔی کے پاس ابالی کھچڑی اور بے مزہ سالن کے سوا کچھ نہیں۔ جب ہنگاموں سے طبیعت اوب جاتی ہے یا جب زندگی کا عرفان اور انسانیت کا احساس دل پر دستک دینے لگے تو ہم داغؔ کو چھوڑ، حالؔی کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ حالؔی کے ایک اور نقاد اکرام نے غالب نامہ میں تسلیم کیا ہے کہ '' آج بھی غالبؔ پر سب سے منصفانہ، معتدل اور متوازن تنقید حالؔی کی ہے۔ وہ نہ بجنوری کی طرح تنقید کو تحسین بناتے ہیں نہ لطیف کی طرح تخریبی حربہ''۔

حالؔی کے ہم عصروں میں شبلی اور آزاد کو خصوصیت حاصل ہے۔ شبلی نے بیک وقت تاریخ، سوانح،

مذہب اور ادب کی جانب توجہ کی۔ سیرۃ النبیؐ، الفاروق، المامون، سوانح مولانا روم کے علاوہ شعرالعجم لکھی جو فارسی شاعری کی تاریخ ہے۔ جس کی ۵ جلدیں ہیں۔ انھوں نے چوتھی جلد میں اپنے تنقیدی نظریات پیش کیے ہیں۔ ان کی دوسری اہم کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' ہے۔ اس کے علاوہ مقالات اور تبصرے بھی ہیں۔ شبلی کی تنقید میں فلسفیانہ مباحث ملتے ہیں۔ انھوں نے سماجی پہلوؤں پر زور کم دیا ہے۔ محمد حسین آزاد کی تصانیف آبِ حیات، نگارستان، سخن دان فارس کے علاوہ دیوانِ ذوق کے مقدمے میں کچھ تنقید ملتی ہے۔ علی گڑھ تحریک کے متاثرین میں وحید الدین سلیم، امداد امام اثر اور مہدی افادی بھی ہیں۔ وحید الدین سلیم، سرسید اور حالی سے متاثر تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین ''افاداتِ سلیم'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے مضامین میں ادب و شعر انکی ضرورت اور اہمیت اور ان کی اصلاح کی جانب توجہ مبذول کی گئی ہے۔ انکی توجہ زیادہ تر زبان کی طرف تھی۔ امداد امام اثر نے ''کاشف الحقائق'' کی دو جلدوں میں اُردو زبان اور شاعری پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اردو کے مختلف شعراء کے کلام پر تبصرہ بھی شامل ہے۔ اس طرح اصولوں سے زیادہ عملی تنقید کا پہلو نمایاں ہے۔ مہدی افادی کے تنقیدی نظریات ''افاداتِ مہدی'' کے مضامین میں ملتے ہیں۔ وہ شبلی سے متاثر تھے۔ وہ تنقید میں چبائے ہوئے نوالوں کو پھر سے چبانا نہیں چاہتے۔ ان کی تنقید میں اسلوب، طرز ادا اور تخلیق کے ظاہری حسن کی طرف توجہ زیادہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے بھی تنقیدی نظریات میں حالی کے نظریات کا تتبع کیا ہے۔ اُن کے مضامین اور تبصرے ''مقدماتِ عبدالحق'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

رومانی تحریک کی ابتداء ۱۸ ویں صدی عیسوی کے آخر سے ہوتی ہے۔ جب کہ کلاسیکیت کے متعینہ اُصول و ضوابط، عقلیت، مذہب و اخلاق اور تہذیبی اقدار کے خلاف بغاوت ہوئی۔ فرانس میں والٹیر اور روسو جرمنی میں ہیگل، کانٹ، گوئٹے، نطشے، لیسنگ اور ہرڈر نے روایت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ انگلستان میں ڈرائڈن، ولیم بلیک، ورڈسورتھ، کولرج، مادام ڈی اسٹیل اور ٹین (Taine) اور والٹر پیٹر بھی اس میں شامل ہوئے۔ ان کا نظریہ، ادب برائے ادب کہلایا۔ ان کے مطابق ادب سے کسی قسم کی افادیت کی طلب بدمذاقی ہے۔ انھوں نے ادب کو حسن آفرینی قرار دیا۔ ان کے نزدیک حسن سچائی ہے اور سچائی حسن۔ اردو میں رومانی تحریک عبدالرحمٰن، ل۔ احمد اور نیاز فتح پوری کے ذریعے نظم و نثر دونوں میں شروع ہوئی۔ اس تحریک کے زیر، تاثراتی و جمالیاتی تنقید کو فروغ حاصل ہوا۔ اس دبستان کی خصوصیت یہ ہے کہ تنقید

نگار صرف ان تاثرات کا اظہار کرتا ہے جو کوئی تخلیق اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ صرف ان نقوش ہی کو پیش کر دیتا ہے جو کسی فن پارے نے اس کے ذہن پر ثبت کیے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب تفریح طبع کا ذریعہ اور لطف اندوزی کا مترادف ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری اسی دبستان کے نمائندہ تنقید نگار ہیں۔ ان کی تصانیف محاسن کلامِ غالب اور باقیات بجنوری ہیں۔ ان کے اس مشہور جملے "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوانِ غالب" سے ان کی تنقیدی جذباتیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس دبستان سے متعلق دوسرے اہم نقاد نیاز فتح پوری ہیں۔ نیاز کی بھی کوئی مستقل تصنیف تنقید میں نہیں ہے۔ "نگار" میں جو ان کے مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ انھیں انتقادیات کے نام سے دو جلدوں میں چھاپا گیا۔ نیاز صاحب نے مذہب سے ادب لطیف کی طرف کوچ کیا۔ وہ ادب میں حسن کے دلدادہ ہیں۔ انھیں موضوعات کی پرواہ نہیں۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ شاعر یا فنکار جو کچھ لکھنا چاہتا ہے وہ واقعی الفاظ سے ادا ہوا ہے کہ نہیں۔ فراق گورکھپوری کا شمار اہم کلاسیکی غزل گویوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید نگاری بھی کی۔ نیاز فتح پوری نے نگار میں لکھا تھا۔ "شاعری تو صرف فراق کی ثانوی خصوصیت ہے۔ پہلی چیز جو ہمیں متاثر کرتی ہے۔ وہ اُن کا بے پناہ "ذوقِ انتقاد" ہے۔" تنقید میں ان کی تصانیف 'اُردو کی عشقیہ شاعری' (۱۹۴۵ء) 'اُردو کی غزل گوئی' (۱۹۵۵ء) 'اندازے' (۱۹۵۶ء) اور 'من آنم' (تنقیدی مراسلات کا مجموعہ) ہیں۔ انھوں نے جمالیاتی، تہذیبی اور نفسیاتی اقدار کے ذریعے تاثراتی تنقید کو جامعیت عطا کی۔ اپنی اس تنقید کو انھوں نے خلاقانہ اور زندہ تنقید کہا ہے۔ فراق، رومانی تحریک سے اشتراکی تحریک اور اشتراکی تحریک سے نفسیاتی اور تاثراتی تنقید کی طرف مائل ہوئے۔

رومانی تحریک ہو کہ ادب برائے ادب کا نظریہ، زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا۔ اُس کے ردِ عمل کے طور پر ایک ایسی تحریک ابھری جس نے ادب اور آرٹ کو بامقصد بنایا۔ مارکس اور اینگلز کے مطابق ادب صرف حسن کاری ہی نہیں بلکہ انسانیت کو بلند و برتر بنانے کا کام بھی اس کے تفویض ہونا چاہیے۔ گویا ادب کے افادی پہلو پر زور دیا گیا۔ اس تحریک نے ایک نئی حقیقت پسندی کی بنیاد رکھی۔ یہ تحریک باقاعدہ طور پر روسی انقلاب کے پس منظر میں ۱۹۳۵ء میں شروع ہوئی۔ جبکہ ترقی پسند مصنفین کا ایک اعلان شائع ہوا جس کے ذریعے طبقاتی بے انصافی اور سیاسی غلامی کے خلاف آواز اٹھائی گئی اور عقلیت کی روشنی کو عام

کرنے، اندھی روایت پرستی کو روکنے اور سستی جذباتیت اور مریضانہ رومانیت کا پردہ فاش کرنے کا عہد کیا گیا۔ اس ادب نے جسے ترقی پسند ادب کہا گیا، موضوع اور اسلوب کی دنیا میں کچھ تجربے کیے، بت سازی وبت شکنی کی۔ ترقی پسند ادب کے پہلے چند سال ادبی کم تبلیغی زیادہ تھے۔ تحریک نعروں، ترانوں اور ہنگاموں کا شکار ہوگئی۔ ادب کو پروپیگنڈہ کا آلہ قرار دیا گیا۔ ترقی پسند ادیب کے لیے وابستگی لازمی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ناقص اور مہمل ادب منظر عام پر آیا۔ یہ صورتِ حال زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہی جب اس ادب نے قدیم ادب کے قیمتی عنصر سے رشتہ جوڑا اور ترسیل وابلاغ کے مسائل پر توجہ کی تو ایک نیا ادب ظہور پذیر ہوا۔ ترقی پسند ادب کے ناقدین میں سجاد ظہیر، احتشام حسین، عبدالعلیم، اختر حسین رائے پوری، اختر انصاری، ممتاز حسین، سردار جعفری اور ڈاکٹر محمد حسن کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

احتشام حسین کی تنقید بنیادی طور پر سماجی ہے۔ جو اشتراکیت کے زیر اثر پروان چڑھی۔ سماجی تنقید نگاری کے مارکسی اسکول کی نمائندگی کا تاج اُن کے سر ہے۔ احتشام حسین، شعور، ادراک اور خیال کی حیثیتوں کو مادی تصور کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے خیال میں پہلے مادی وجود ہے۔ پھر شعور وادراک وغیرہ۔ اس طرح اشتراکی ادب میں مواد کی اہمیت مسلم ہے۔ اور ہیئت ان کی نگاہ میں ضمنی محض ہے۔ اشتراکی جمالیات میں بھی افادی رنگ جھلکتا ہے۔ اُن کے تنقیدی مجموعے تنقیدی جائزے، روایت اور بغاوت، تنقید وعملی تنقید، ادب اور سماج، ذوقِ ادب وشعور، اعتبار نظر اور عکس اور آئینے شائع ہو چکے ہیں۔ دیگر ترقی پسند نگاروں کی تصانیف میں اختر حسین رائے پوری کی ادب اور انقلاب، اختر انصاری کی افادی ادب، ایک ادبی ڈائری، ڈاکٹر عبدالعلیم کا مضمون ادبی تنقید کے بنیادی اُصول مطبوعہ نیا ادب اور سردار جعفری کی تصنیف ترقی پسند ادب قابلِ ذکر ہیں۔

ترقی پسند رویہ سے اختلاف کرنے والا ایک گروہ وہ حلقہ اربابِ ذوق کا بھی تھا جس نے وابستگی سے قطع تعلق کر کے آزادانہ روش اختیار کی اس رویے کے نمائندہ ادیب ونقاد م۔ ن۔ راشد، میراجی اور اختر الایمان تھے۔

تنقید کی ایک قسم سائنٹفک تنقید بھی ہے۔ جو ادبی فن پارے اور فن کار سے متعلق تمام پہلوؤں سے بحث کرتی ہے۔ اس تنقید کا سب سے بڑا علمبردار ٹین Taine تھا۔ اس قسم کے خیالات اُنیسویں صدی کے

شروع میں بہت عام ہوے۔ ہرڈر اور مادام ڈی اسٹیل بھی اس گروہ میں شامل تھے۔ یہ سب کے سب ادب کو سماجی پس منظر میں دیکھنے کے قائل نہ تھے۔ نہ صرف ادبی اور فنی بلکہ زندگی کے اقدار کا پتا لگانا ضروری سمجھتے تھے۔ اُردو میں اس تنقید کے علمبرداروں میں کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، حسن عسکری وغیرہ ہیں۔

پروفیسر کلیم الدین احمد کا شمار اُردو کے جری اور نہایت کھرے نقادوں میں ہوتا ہے۔ حامدی کاشمیری نے انھیں ''مردِ بے باک'' کہا ہے۔ اُن کے تنقیدی اُصول کی بنیاد مغربی نظریات ہیں۔ انھوں نے مشرقی ادب کا موازنہ مغربی ادب سے کیا۔ چونکہ غزل نام کی کوئی چیز مغرب میں نہیں تھی اس لیے اُسے نیم وحشی صنف قرار دیا۔ بے چاری اُردو تنقید تو ان کے پے در پے حملوں کی تاب نہ لا سکی۔ اپنی کتاب ''اُردو تنقید پر ایک نظر'' کا آغاز ہی انھوں نے اس سنسنی خیز جملے سے کیا ہے۔ ''اُردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر''۔ انھوں نے ساری اُردو تنقید کو تذکرہ نگاری سے لے کر دور جدید تک سطحی، داخلی، روایتی اور غیر ادبی قرار دیا۔ ان کے اس جارحانہ انداز نقد سے بیشتر نقاد چراغ پا ہوے۔ آل احمد سرور نے نظر اور نظریے میں لکھا کہ کلیم الدین احمد نے سخن فہمی کے بجائے طرفداری سے کام لیا۔ سید احتشام حسین کو پروفیسر کلیم الدین کی کتاب ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں روایت، ماحول اور سماجی شعور کہیں نظر نہیں آیا۔ اعجاز حسین نے بھی ''نئے ادبی رجحانات'' میں لکھا ہے کہ ''پروفیسر کلیم کو شاعری میں خرابی نظر آئی۔ ہر صنف داغدار دکھائی دی، کاش وہ اردو کی تلمیحات، رمزیات واستعارات کو مشرقی انداز سے سمجھنے کی کوشش کرتے، خواہ فن تنقید کے اصول سمجھتے یا نہ سمجھتے''۔ پروفیسر کلیم نے بھی ان نقادوں کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا کڑا جائزہ لیا ہے۔ یہاں تک کہ حسن عسکری جیسے نقاد کو بھی نہیں بخشا۔ انھیں ادبی دلال اور ادبی نامہ نگار کہا ہے۔ عسکری صاحب کا شمار تاثراتی نقادوں میں کیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی جیسے نقاد و ادبی تنقید کے مداح نے حسن عسکری کی کتاب ''انسان اور آدمی'' پر تبصرہ کرتے ہوے فرمایا تھا'' یہ کتاب تنقیدی مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ذہین آدمی کی فقرہ بازیوں اور پھبتیوں کا مجموعہ ہے۔ حسن عسکری ترقی پسند تحریک اور مارکسی فلسفے کا مضحکہ اُڑاتے رہے۔ نیز تنقید سے تصوف اور تصوف سے مابعد الطبعیات کا رُخ کرتے ہوے اسلامی ادب کی تخلیق کا مطالبہ کیا۔ جہاں تک کلیم الدین احمد کا تعلق ہے وہ رچرڈس سے متاثر ہیں جو سائنسی تنقید کا علمبردار ہے۔ پروفیسر کلیم نے اپنی کتاب اُردو شاعری پر ایک نظر میں ایک نہایت اہم

ادبی اصول کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ باوجود ملکوں اور تہذیبوں کے فرق، جغرافیائی حالات کے اختلاف اور تاریخ و تمدن کے علاحدہ علاحدہ ہونے کے ادبیات میں بعض مشترک اور عالمگیر اُصول ہیں انھوں نے کہا ہے کہ "حسن کا معیار مختلف سہی حسن کا احساس مختلف نہیں ہے"۔ انھوں نے ذہنی و روحانی علم و آگہی کو ادب کا مقصد قرار دیا اور اُسی کو بنیاد بنا کر ادبی فن پاروں کا جائزہ لیا۔

آل احمد سرور بھی ادب میں سائنسی تنقید کے علمبردار ہیں۔ اپنی نرم، معتدل اور متوازن تحریروں کے باعث ممتاز ہیں۔ ان کی تنقید انتہا پسندی کا شکار نہیں۔ میانہ روی ان کا شیوہ ہے۔ انھوں نے مارکسی تنقید کی بے راہ روی پر ضرب لگائی اور اُس کے اثباتی پہلوؤں کو سراہا۔ اس لیے فرماتے ہیں "ہماری تنقید پروپیگنڈہ کا آلہ نہیں نہ ہی وہ تحسین باہمی ہے۔" ایک اور جگہ سرور صاحب نے آج کی تنقید پر اس طرح زخمہ لگایا ہے "اُردو تنقید میں آج وکیل زیادہ ہیں۔ مبصر اور پارکھ کم"۔ آل احمد سرور نے اپنی دو کتابوں "نظر اور نظریے" "مسرت سے بصیرت تک" میں جمالیاتی پہلوؤں پر کھل کر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی دیگر اہم تنقیدی کتابیں "تنقید کیا ہے؟"، "تنقیدی اشارے"، "نئے اور پرانے چراغ" اور "ادب اور نظریہ" ہیں۔ اپنی تصنیف پہچان اور پرکھ میں میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، حسرتؔ، فانیؔ، جوشؔ اور فراقؔ کی شخصیات اور شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں شاعرانہ اندازِ بیان اور جذباتی اسلوب کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اور یہ وضاحت کی ہے کہ "میں جذباتیت کے خلاف ہوں مگر جذبے کے خلاف نہیں"۔ اس طرح وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ "اچھی تنقید کس طرح سے اچھی تخلیق سے کم نہیں بلکہ بعض وجوہ سے اس پر فوقیت رکھتی ہے۔"

ترقی پسندی کی ادعائیت، ہٹ دھرمی، تشہیر اور وابستگی کے خلاف ۱۹۶۰ء میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا جس کے نتیجے میں ایک نیا ادبی رجحان منظر عام پر آیا۔ اس رجحان کے نمائندہ نقادوں میں گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کو اولیت حاصل ہے۔ یہ رجحان جدیدیت کہلایا۔ جدیدیت نے ادب کی ادبیت اور ذہنی آزادی پر زور دیا۔ اقدار کی شکست و ریخت، تنہائی، ذات کی تلاش، ابہام، ترسیل و ابلاغ اس کے موضوعات تھے۔ اس پر کافی مباحث ہوئے کہ یہ تحریک ہے یا رجحان۔ ڈاکٹر وحید اختر نے اسے ترقی پسندی کی توسیع قرار دیا تھا۔ ن۔ م۔ راشد کے مطابق وہ اندازِ نظر ہے جو روایت کو ہر حال میں رد کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ جو ماضی سے زیادہ حال کے مسائل کی ترجمانی کو اپنا فرض گردانتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے

اس کا تعلق مخصوص زمانے اور حالات سے جوڑا ہے۔فرماتے ہیں۔"جدیدیت ہر اس دور میں اُبھرتی ہے جو علمی انکشافات کے اعتبار سے ہنگامہ خیز اور روایات و رسوم کی جکڑ بندی کے باعث رجعت پسند ہوتا ہے۔"

یہ حقیقت ہے کہ جس زمانے میں سکہ بند روایات، اُصول، ضابطے، نظریات، اعتقادات اور معیارات، شکست و ریخت کی زد میں آتے ہیں اور جب گذشتہ علمی و ادبی سرمایے کی ازسرِ نو تدوین و ترتیب انجام پاتی ہے تو اس کے نتیجے میں نئے رجحانات و میلانات کی بنیاد پڑتی ہے۔اس طرح جدیدیت وقوعوں سے ظاہر ہونے والا ایک جدلیاتی عمل ہے۔جو بنیادی طور پر ایک تخلیقی عمل ہے۔جدیدیت اور ترقی پسندی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جدیدیت فرد کی فردیت پر زور دیتی ہے جبکہ ترقی پسندی کے پیش نظر نظریاتی نصب العین ہوتا ہے۔

اُردو ادب میں جدیدیت کا آغاز شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے"شب خون" اور ان کے انتخاب" نئے نام" سے ہوتا ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی کا مطالعہ نہایت وسیع ہے مشرقیات و مغربیات کے جید عالم ہیں۔زبان، علمِ زبان، لسانیات، شعروادب، تحقیق اور تنقید ان کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔وہ کلاسیکل ادب کے پارکھ اور جدید ادب کے مبصر ہیں۔تنقید میں کولرج، رچرڈ سن اور ایک حد تک ایلیٹ ان کی پسند ہیں۔وہ شکسپیر اور غالبؔ سے بھی متاثر ہیں۔فاروقی صاحب کا مضمون"شعر، غیر شعر اور نثر" جو ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔خود ایک علاحدہ کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔اردو کے بیش بہا مضامین میں سے ایک ہے۔اس مضمون میں فاروقی نے کئی سوالات اٹھائے ہیں۔کیا شاعری کی پہچان ممکن ہے؟ کیا اچھی اور بری شاعری کو الگ الگ پہچاننا ممکن ہے؟ پہچان کے طریقے کیا ہوں گے؟ معروضی یا مصنوعی؟ کیا نثر کی پہچان ممکن ہے؟ انھوں نے مدلل جوابات دیے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جس تحریر میں موزونیت، اجمال، جدلیاتی لفظ اور ابہام ہوگا وہی شاعری ہوگی۔وہ خواص جو نثر کے ہیں یعنی بندش کی چستی، برجستگی، سلاست، روانی، ایجاز، زورِ بیاں وضاحت وغیرہ اپنی جگہ مستحسن سہی لیکن وہ شاعری کے خواص نہیں۔ادب کے غیر ادبی معیار کے بارے میں کہا ہے"اصل معاملہ شاعری اور شاعرانہ ذات کا ہے۔اگر کوئی شخص وابستہ رہ کر بھی شاعری کو قربان نہیں کرتا تو اس کی وابستگی سے کیا نقصان۔لیکن وابستگی محض کسی کو شاعر نہیں بنا سکتی جس طرح نا وابستگی شاعر بنانے کی کوئی کلید نہیں۔" فاروقی کا منطقی توضیحی انداز بیان جو یکتی ہے تقابلی طریقہ کار کے باعث بہت موثر ہے۔انھوں نے

کولرج، رچرڈسن اور ایلیٹ کے طریقہ کار اور طرز استدلال کو اپنایا ہے۔ فاروقی کی دیگر اہم کتابیں صورت و معنیٰ سخن، تعبیر کی شرح، تنقیدی افکار، جدیدیت کل اور آج، لفظ و معنی، تفہیم غالب، شعر شور انگیز وغیرہ ہیں۔

جدیدیت کے ایک اور نقاد وہاب اشرفی بھی ہیں۔ جن کی تصانیف تاریخ ادبیات عالم (۷ جلدیں) کہانی کے روپ، اردو فکشن اور، تیسری آنکھ، قطب مشتری کا تنقیدی جائزہ، مابعد جدیدیت ممکنات و مضمرات، راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری اور معنی کی تلاش اور آگہی کا منظر نامہ نہایت وقیع ہیں۔ وہ آفاقیت کے قائل نظر آتے ہیں۔ اپنے تنقیدی نقطہ نگاہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں "میری نگاہ میں کسی ادب پارے میں کیا کہا گیا ہے اتنا اہم نہیں جتنا کیسے کہا گیا ہے، اہم ہے"۔ انھوں نے کہا ہے کہ کسی ادب میں تعطل اور جمود اس کے زوال کی نشانی ہے۔ لہٰذا نئی ادبی تحریکوں یا نئے تجربوں کو رد کر دینا مستحسن نہیں ہے۔ ان پر غور و فکر ضروری ہے۔ اپنے تنقیدی نقطہ نگاہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ انھیں ترقی پسندی سے چڑ نہیں اور نہ ہی جدیدیت ان کا Ideal ہے۔ وہ تکرار اور فرسودگی کے مقابلے میں جدت اور انفرادیت کی قدر کرتے ہیں۔ وارث علوی بھی ہمارے جارح نقاد ہیں۔ ابتدا میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ بعد ازاں جدیدیت کو اپنایا۔ اُن کے مضامین تجسس سے پُر اور چونکانے والے ہیں۔

جدیدیت جب فیشن اور فارمولے کی طرح برتی گئی تو اس کا حشر بھی عبرتناک ہوگیا۔ جدیدیت نے نہ صرف سیاسی معنی کو ادب سے خارج کر دیا تھا۔ بلکہ مصنف کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی رد کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین کی نظر میں جدیدیت کا رجحان اب اپنی معنویت کھو چکا ہے۔ اسکی جگہ مابعد جدیدیت نے لے لی ہے جو ترقی پسندی اور جدیدیت کی ادعائیت، مطلقیت، حتمیت اور قطعیت کے خلاف ہے۔ اس طرح مابعد جدیدیت کسی ایک رجحان تک محدود نہیں بلکہ یہ رجحانات، میلانات اور کائناتی نقطہ نظر کی کثرت کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ جسے عمومی شناخت کے طور پر Post Modernism کا نام دیا گیا۔ یہ تخلیقی ادب اور نظریہ سازی دونوں پر محیط ہے۔ فوکو اور ژاک دریدا مابعد جدیدیت کے بنیادی مفکرین ہیں۔ جن کے افکار سے مابعد جدید عہد عبارت ہے۔ مابعد جدیدیت بعض ان تصورات کی نفی سے پیدا ہوتی ہے جو جدیدیت کی تحریک نے پیدا کیے تھے۔ ان میں سب سے اہم "موضوع" ذات کی نفی ہے۔ فوکو اور دریدا نے ذات کے طلسم سے نجات دلائی۔

اُردو کی معاصر تنقید، مابعد جدیدیت اور اسکی شاخوں کے چنگل میں ہے۔ معاصر تنقید کی صحیح صورتِ حال کا اندازہ بعض نامور ادبا و شعراء کی آراء سے کیا جاسکتا ہے۔ مظہر امام نے آج کی ادبی تنقید کو گمراہی کا منشور قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ ہماری بیشتر تنقید لفاظی کا شکار ہے۔ تنقید نگار نے مفتی اعظم کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ یعقوب یاور رقمطراز ہیں۔ "اُردو تنقید خود اپنے اگائے ہوئے جنگل میں کھوچکی ہے۔ اہل تنقید اپنی بنیادوں اور مقاصد سے دور جا پڑے ہیں۔ تخلیق سے تنقید کا رشتہ ٹوٹتے ٹوٹتے برائے نام رہ گیا ہے۔ اس کی جگہ تنقید پر تنقید کے ایک لامتناہی سلسلے نے لی ہے۔ اوچھے اور نا اہل نقادوں کے بے جا غرور نے تخلیق کو نہ صرف ایک حقیر شئے بنا کر رکھ دیا ہے۔ بلکہ اُسے ایسے دفاع پر وقت ضائع کرنے کی مجبوری بھی لاحق ہوگئی ہے۔"

پروفیسر گوپی چند نارنگ لسانیات، تحقیق اور تنقید، تینوں شعبوں میں امتیاز رکھتے ہیں۔ جدیدیت کے نہ صرف علمبردار ہیں بلکہ ان کا شمار اس رجحان کے اہم تنقید نگاروں میں ہوتا ہے۔ آج کل وہ اسلوبیاتی تنقید کے بنیاد گزاروں میں سرفہرست ہیں۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلوبیات کو ادبی تنقید کا حصہ بنا دیا ہے۔ اسلوبیات سے مراد وہ طریقہ کار ہے جس کی رو سے روایتی تنقید کے موضوعی اور تاثراتی انداز کے بجائے ادبی فن پارے کا تجزیہ معروضی، لسانی اور سائنٹفک بنیادوں پر کیا جاتا ہے۔ تنقید کا یہ نیا رویہ خود تنقیدی حلقوں میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اسلوبیات کی شاخیں ساختیات اور پس ساختیات Post Structuralism بھی ہیں۔ ناقدین کے ایک گروہ کے مطابق جدیدیت آج بھی زندہ ہے۔ مابعد جدیدیت کا کوئی وجود نہیں ہے۔

حامدی کشمیری اکتشافی تنقید کے قائل ہیں۔ نقاد جب اپنی نازک حسیت، بصیرت، لسانی شعور اور گہرے ادراک سے کام لے کر فن پاروں کے اسراری جلوؤں کی شناخت کرتا ہے تو اس نوع کی تنقید اکتشافی تنقید کہلاتی ہے۔ انھوں نے تنقید کی چار اقسام بتائی ہیں۔

۱۔ مکتبی تنقید ۲۔ مارکسی تنقید

۳۔ تمدنی تنقید۔ (ادب کی ماہیت انفرادیت اور اسکی اہمیت کے اسباب و علل کی چھان بین کے لیے علمیت کے ساتھ اپنی ذہنی قوت اور جمالیاتی حس سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ میراجی، حسن عسکری، سلیم احمد، باقر مہدی، وارث علوی، فضیل جعفری، وزیر آغا، وحید اختر اس کی نمائندگی کرتے ہیں۔

۴۔ ہیئتی تنقید۔ ادب کو سماجی، تہذیبی یا سیاسی تصورات وعقائد کے تابع کرنے کے بجائے اسکی ادبیت سے سروکار رکھا جائے اور پیش نظر تخلیق کے تجزیہ وتحلیل پر توجہ مرکوز کی جائے۔ میراجی، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، خورشید الاسلام، مغنی تبسم، سلیمان اطہر جاوید، اسلوب احمد انصاری، محمود ہاشمی، افتخار جالب، انور سدید، حامدی کاشمیری، عنوان چشتی، ابوالکلام قاسمی، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، مسعود حسن خان ہیئتی تنقید کے ترجمان ہیں۔ مغنی تبسم کی کتاب ''آواز اور آدمی'' اسلوبیاتی نظریہ تنقید کی عکاس ہے۔

اُردو تنقید کے تدریجی ارتقا کے جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بہت کم تنقید نگاروں نے اپنے منصب سے انصاف کیا ہے۔ ہر ایک نے اپنے رویے اور نقطہ نظر کی ترجمانی کی ہے۔ بیشتر تنقیدی تحریریں ذہنی، ذاتی اور علاقائی تعصب اور گروہ بندی کا شکار ہیں۔ ادبی خلوص اور دیانت داری کا تقاضا ہے کہ صرف معروضی تنقید ہی کو حرفِ آخر مانا جائے۔

●●

(ستمبر 2001ء)

گلبرگہ کا ادبی منظر نامہ

حیدرآباد کرناٹک کے موجودہ اضلاع گلبرگہ، بیدر، رائچور بشمول کپل، سقوط حیدرآباد ستمبر 1948 تک حکومت آصفیہ کے زیر نگیں رہے۔ نومبر 1956 کی لسانی تقسیم کے باعث وہ ریاست میسور (کرناٹک) کا حصہ بن گئے۔ سلاطین بہمنیہ نے گلبرگہ میں 1347 تا 1429 اور بیدر میں 1429 تا 1525 حکومت کی اس دور میں گلبرگہ اور بیدر دکنی ادب کے اہم مرکز رہے۔

بہمنی سلاطین میں فیروز شاہ بہمنی بہ لحاظ علم و دانش بلند درجہ پر فائز تھا۔ وہ کئی زبانیں جانتا تھا فارسی کے علاوہ اس نے دکنی میں بھی شعر کہے ہیں۔ فارسی میں عروجی اور دکنی میں فیروزی تخلص کرتا تھا۔ بہمنی دور کے جو ادبی نمونے دستیاب ہیں ان کا سرمایہ بہت محدود ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ، فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں 1400ء میں گلبرگہ تشریف لائے۔ حضرت کا شمار دکن کے اولین شعرا میں ہوتا ہے۔ دکنی میں پہلی نعت ان کی تحریر کردہ ہے۔ انھوں نے راگ، راگنیوں، لوریوں، گیتوں اور چکی ناموں کی صورت میں تصوف کے مسائل کو پیش کیا۔ انھوں نے سہیلا یعنی خوشی کے گیت بھی لکھے۔ یہ گیت آج بھی روضہ حضرت بندہ نوازؒ میں بند سماع میں گائے جاتے ہیں۔ دکنی میں معراج العاشقین سمیت بعض نثری رسائل بھی حضرت سے منسوب کیے گئے مگر جدید تحقیق کے مطابق معراج العاشقین، حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی تصنیف نہیں بلکہ گیارہویں صدی کے اواخر کے ایک صوفی بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی کاوش ہے۔

1429ء میں بہمنی پایہ تخت گلبرگہ سے بیدر منتقل ہوا تو زبان و ادب کے شیدائی بیدر میں اکٹھا ہوئے، ایرانی شاعر شیخ آزری نے بہمنی خاندان کی منظوم تاریخ بہمنی نامہ، دکنی میں لکھی۔ نظامی بیدری بھی سلطان احمد شاہ بہمنی کا درباری شاعر تھا۔ جس نے 1421 تا 1435 کے درمیان رومانی موضوع پر ایک مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' لکھی۔ سلطان محمد شاہ اور سلطان محمود شاہ بہمنی کے عہد میں مشتاق اور لطفی جیسے سخن گو، قصیدہ گوئی اور غزل گوئی میں امتیاز رکھتے تھے، ان دونوں کا ہم عصر فیروز تھا۔ فیروز ابراہیم قطب شاہ کی دعوت پر گولکنڈہ منتقل ہوا۔ گولکنڈہ کے ممتاز شعرا وجہی اور ابن نشاطی نے فیروز کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔ فیروز کی مثنوی، پرت نامہ، اہمیت کی حامل ہے۔ شاہ اشرف الدین اشرف بیابانی (پیدائش 1458ء) نے منظوم لغت 'واحد باری' مرتب کی اور 1503ء مثنوی ''نوسرہار'' تصنیف کی اس کا موضوع شہادت امام حسین اور

واقعات کربلا ہے۔ بیدر ہی کے ایک اور شاعر قریشی نے مثنوی ''بھوگ بل'' لکھی جو جنسیات کے موضوع پر اردو کی اولین مثنوی ہے۔

سیوا جو گلبرگہ کا باشندہ تھا اس نے سترھویں صدی میں فارسی مثنوی روضۃ الشہدا کا اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ اس نے مرثیے لکھے۔ اسی صدی کے ایک اور ممتاز صوفی شاعر حضرت محمود بحری (متوفی 1717ء) گوگی تعلقہ شاہ پور قدیم ضلع گلبرگہ کے متوطن تھے دکنی شاعری میں مثنوی من لگن، مثنوی بنگاب نامہ اور غزلیات کا ایک دیوان ان کی یادگار ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مشہور شاعر یگانہ چنگیزی کا قیام یادگیر میں رہا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انھوں نے ''غالب شکن'' اسی سرزمین میں لکھی۔

جدوجہد آزادی کے دوران گلبرگہ کے بعض ادبا و شعرا نے ریاست حیدرآباد کی آزادی و استقرار تو بعض نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ یہ ادبا و شعرا کم و بیش گلبرگہ کلب سے وابستہ تھے جو 1944ء میں قائم ہوا تھا۔ اس ادارہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس ادارہ سے ابراہیم جلیس، فضل گلبرگوی، نیاز گلبرگوی، سلیمان خطیب، شور عابدی، عثمان صحرائی، حسن خان نجمی، سحر قادری، وغیرہم، وابستہ تھے۔ محبوب حسین جگر، لطیف ساجد اور نظر حیدرآبادی کبھی کبھار اس کلب کی ادبی محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ محبوب حسین جگر نے ابتدا میں شاعری کی اور افسانے بھی لکھے مگر انھوں نے جب صحافت کو اپنایا تو وقف برائے روزنامہ 'سیاست' ہو گئے اور بہ حیثیت شریک مدیر اس سے اپنی آخری سانس تک وابستہ رہے۔ ابراہیم جلیس نے افسانے، انشائیے، خاکے، ڈرامے اور صحافتی کالم لکھے۔ رپورتاژ کے علاوہ ایک ناول (چور بازار) بھی تحریر کیا۔ وہ ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور لگ بھگ دو درجن کتابیں یادگار چھوڑ دیں۔ فضل گلبرگوی، نیاز گلبرگوی کی ادبی زندگی کا آغاز بیک وقت شاعری و افسانہ نگاری سے ہوا ان کے افسانے حیدرآباد دکن کے روزنامے 'میزان' میں شائع ہوا کرتے تھے۔ نیاز گلبرگوی کا پہلا شعری مجموعہ 'حرف وفا' 1983ء میں گلبرگہ ہی سے شائع ہوا اور اسی شہر میں اس کی رسم اجرا انجام دی گئی ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''حرف نیاز'' 1999 میں کراچی سے شائع ہوا۔ ان کا تیسرا شعری مجموعہ ''کلیات نیاز'' 2009ء میں حیدرآباد دکن میں شائع ہوا اور اس کی رسم اجرا کا جلسہ بھی گلبرگہ ہی میں منعقد ہوا۔ دکن کے ممتاز و موقر شاعر سلیمان خطیب اور شور عابدی کو اپنی مٹی ہی راس آئی انھوں نے ترک وطن نہیں کیا۔ خطیب صاحب کا شعری مجموعہ ''کیوڑے کا بن'' ان کے جلسہ اعتراف خدمات کے موقع پر 1975 سے شائع ہوا۔ تا حال سلیمان خطیب یادگار ٹرسٹ سے اس کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ شور عابدی کا مجموعہ کلام ''خم کا کل'' ان کی وفات کے

بعد 1975 میں شائع ہوا۔ عثمان صحرائی نے ابتدا میں شاعری کی پھر صحافت کو اپنایا۔ ان کے ہفتہ وار 'ہمدرد' کو گلبر گہ کی اردو صحافت کا نقش اول قرار دے سکتے ہیں۔ سقوط حیدر آباد کے بعد جن ادبا و شعرا نے پاکستان کا رخ کیا ان میں فضل گلبر گوی، نیاز گلبر گوی، عثمان صحرائی کے علاوہ رضی اختر شوق اور رشید شکیب قابل ذکر ہیں۔

ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی گلبر گہ کلب کا شیرازہ بکھر گیا تاہم انٹرمیڈیٹ کالج گلبرگہ کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ شہر میں منعقدہ ادبی محفلوں و مشاعروں کے باعث ادبی فضا قائم تھی۔ نامی کوہ سوار، اسماعیل شریف ازل، سلیمان خطیب، شور عابدی، تاب سہروردی، عبدالرزاق چاق گلبر گوی، خیر بندہ نوازی، غیرت صدیقی، حکیم بزمی، مختار ہاشمی، غلام علی اثر، ڈاکٹر فتح محمد فاتح، حافظ عبدالرشید، منہاج الدین شوکت، محمد حسن اختر، فخر الدین ارمان، قمر انصاری، سحر قادری، عبداللہ تمنا، محمود آغوش بے ڈھب، وغیرہم کی وجہ سے شعری محفلیں آباد تھیں۔ ان میں سلیمان خطیب اور شور عابدی کے شعری مجموعوں کا ذکر آچکا ہے۔ مابقی شعرا میں مخدوم علی، تاب سہروردی کے شعری مجموعے طاب تاب، شہاب تاب اور خطاب تاب شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح چاق گلبر گوی کا شعری مجموعہ باقیات چاق، مختار ہاشمی کا مجموعہ شعلہ رقصاں، حافظ عبدالرشید کا مجموعہ نوائے رشید، اور منہاج الدین شوکت کا کلیات شائع ہو چکا ہے۔ یہاں محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور نیاز گلبر گوی کے بعد نثر نگار خال خال ہی تھے اس جانب غلام حسین ساحل اور ڈاکٹر شکیب انصاری نے توجہ کی۔ غلام حسین ساحل نے استعداد کے باوجود بہت کم لکھا۔ البتہ شکیب انصاری نے 1955ء میں اپنے تخلیقی افسانوں سے متاثر کیا۔ بعد ازاں شاہد فریدی نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی اور بہت جلد ماہنامہ بیسویں صدی کے قارئین کے مقبول افسانہ نگار بن گئے۔ اُن کے افسانوں کا ایک مجموعہ کانٹوں کا سفر اور دو ناولٹ، " کہکشاں یادوں کی اور سانچا موتی حال ہی میں شائع ہو چکے ہیں۔

1956ء کی لسانی تقسیم کے بعد کئی ادبا و شعرا گلبر گہ میں یکجا تھے ان میں مبارز الدین رفعت، عاقل علی خان، عبدالکریم کاظمی، غیرت صدیقی، عبدالقادر ادیب، ڈاکٹر مدنا منظر، حمید الماس، سرور مرزائی، صابر شاہ آبادی، اخگر شاہ آبادی، اعظم اثر، قاضی حسام الدین فاضل، عبدالستار خاطر، نصیر احمد نصیر قابل ذکر ہیں۔ 1955 میں گلبر گہ ہی سے ایک ادبی ماہنامہ 'گلبرگ' کا اجراء عمل میں آیا جس کے مدیر حسام صدیقی الدین اور معاون مدیر اکرام صہبائی اور عظیم یوسف زئی تھے۔ اس ماہنامے کے صرف چار شمارے ہی شائع ہوئے۔ ممتاز افسانہ نگار واجدہ تبسم کا پہلا افسانہ اسی ماہنامہ میں شائع ہوا تھا۔

فروری 1960ء میں بارگاہ بندہ نواز کے زیر اہتمام ایک علمی ادبی و مذہبی ماہنامہ 'شہباز' کا

اولین شمارہ منظر عام پر آیا پروفیسر مبارز الدین رفعت اور حکیم لئیق احمد نعمانی اس کی مجلس ادارت میں شامل تھے یہ 15 سال تک ماہنامہ رہا اور اب سالنامہ کی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔

عصری تحریکوں اور رجحانات نے بھی گلبرگہ کے ادب کو متاثر کیا آزادی سے چند سال قبل دکن میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو اس علاقے کے ادباء و شعرا بھی متاثر ہوئے۔ ابراہیم جلیس، سلیمان خطیب، شور عابدی، فضل گلبرگوی، نیاز گلبرگوی، حسن خاں نجمی، عبدالقادر ادیب، ابراہیم ماموں، عبدالرحیم آرزو، قادر جاوید، سید مجیب الرحمن، نجم الثاقب شحنہ، مجتبیٰ حسین، وہاب عندلیب، اسماعیل بدر، تنہا تماپوری، حمید الماس، سلام نورس، رشید جاوید، اور جلیل تنویر کی تحریروں میں ترقی پسند خیالات کا پرتو ملتا ہے۔ بعد ازاں حمید الماس پر حلقہ ارباب ذوق کا اثر غالب رہا۔

1960ء کے بعد شب خون کی تحریروں اور احمد ہمیش کے افسانوں کے زیر اثر حیدرآباد کرناٹک کا ادب جدیدیت کی لہر سے متاثر ہوا۔ اکرام باگ، حمید سہروردی، ریاض قاصدار، بشیر باگ، علیم احمد، اور نجم باگ کی افسانوی تحریریں جدید معیاری رسائل میں جگہ پانے لگیں۔ اکرام باگ اور حمید سہروردی کے تجریدی و علامتی افسانوں نے برصغیر کے نقادوں کو متوجہ کیا۔ لطیف، حکیم شاکر، حامد اکمل اور خالد سعید نے بھی افسانے لکھے مگر افسانہ نویسی ان کی پہلی ترجیح نہیں رہی۔ سب ہی نے شاعری پر توجہ مرکوز کی ان میں حکیم شاکر اور حامد اکمل نے منفرد شعری اظہار کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی رشتہ استوار کیا اور نئی نسل کی حوصلہ افزائی کی۔ جدیدیت کے علم بردار شمس الرحمن فاروقی نے 'نئے نام' کے عنوان سے جدید شعرا کا جو انتخاب شائع کیا تھا اس میں حیدرآباد کرناٹک سے صرف حمید الماس شامل تھے مگر یہ امر باعث طمانیت ہے کہ 1972ء میں 229 شعرا کا منتخب کلام ''شیرازہ'' ادارۂ تحریک کی جانب سے مخمور سعیدی اور پریم گوپال متل نے ترتیب دیا تھا جس میں گلبرگہ کے فن کار راہی قریشی، صابر شاہ آبادی، حمید الماس، وقار خلیل، تنہا تماپوری، حمید سہروردی، اکرام باگ، حامد اکمل اور خمار قریشی بھی شامل تھے۔

جدیدیت کو اپنانے میں گلبرگہ کے شعرا خمار قریشی، جبار جمیل، تنہا تماپوری، نصیر احمد نصیر، حکیم شاکر، حامد اکمل، بدر مہدی اور صابر فخر الدین پیش پیش تھے۔ خمار قریشی تخلیقی تہہ داری اور نئے لب و لہجے کے باعث ممتاز تھے۔ جبار جمیل نے منفرد نظم گو اور کھرے نقاد و مبصر کی حیثیت سے اپنی پہچان بنائی۔ خالد سعید نے اپنی فطری ذہانت اور جودت طبع سے متاثر کیا۔

1980 کے آس پاس فکشن و شاعری میں جو نام ابھرے ان میں صبیح حیدر صبیح، وحید انجم، امجد جاوید،

کوثر پروین، میر شاہ نواز شاہین، خالدہ بیگم، منظور وقار، نور الدین نور، رزاق اثر، خلیل مجاہد، مظہر مبارک، حشمت فاتحہ خوانی، اکرم نقاش، خورشید وحید، ثنا بھنڈاری، اعجاز مصور، فضل افضل، قاضی انور، وقار ریاض، صادق کرمانی، امجد علی فیض، فاروق نشتر، مختار احمد منو، سراج وجیہہ، عبید اللہ، عبدالباری، چندا حسینی اکبر، سعید عارف اور حنیف قمر قابل ذکر ہیں۔

ماقبل آزادی خواتین شعرا میں حمیدہ بانو مخفی، سعیدہ بیگم، راحت النسا، راحت کے بعد صغریٰ عالم ایک منفرد شاعرہ کے روپ میں ابھریں ان کی شاعری کے سات مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ جدیدیت کے دور میں ترسیل کے المیے کے بعد جس رجحان کو تقویت پہنچی اسے مابعد جدیدیت یا جدیدیت کا دوسرا روپ کہہ سکتے ہیں۔ جس سے ادب میں بے ماجرائی اور بے سمتی کا دور ختم ہوگیا ہے۔ اس تناظر میں گلبرگہ کے ادب کا ایک سرسری جائزہ لیں تو مسرت ہوتی ہے کہ اس علاقہ میں ادب کی مختلف اصناف کی آبیاری کی وجہ سے ہمارے فنکار نہ صرف کرناٹک بلکہ سارے ملک اور بیرون ملک اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔ شکیب انصاری، شاہد فریدی، حمید سہروردی، اور اکرام باگ کے بعد ریاض قاصدار، جلیل تنویر، کوثر پروین اور وحید انجم کے نام فکشن میں نمایاں ہیں شعر گوئی میں شور عابدی، حمید الماس، تنہا تماپوری، راہی قریشی، خمار قریشی، نصیر احمد نصیر، جبار جمیل، صابر شاہ آبادی، وقار خلیل، عبدالقادر ادیب، حامد اکمل، محب کوثر، صغریٰ عالم، خالد سعید، اکرم نقاش، صابر فخر الدین، رزاق اثر وغیرہ ہم استناد رکھتے ہیں۔

مزاحیہ شاعری میں سلیمان خطیب کے علاوہ قبلہ گلبر گوی، سرور مرزائی اور پرویز دھمروی کو خصوصیت حاصل ہے۔ جہاں تک فکاہی نثر نگاری کا تعلق ہے اس میں ابراہیم جلیس، سلیمان خطیب، عاقل علی خاں، ڈاکٹر لئیق صلاح، مجتبیٰ حسین، حلیمہ فردوس، رؤف خوشتر، ڈاکٹر شمیم ثریا، عابد مرزا، خالدہ بیگم، منظور وقار، فاروق نشتر اور رشید سگری نے اپنے جوہر دکھائے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ سیشن جج نے اپنے قیام گلبرگہ کے دوران اس صنف کے لیے زمین ہموار کی تھی۔

تحقیق وتنقید اور تالیف کے شعبے میں سید مبارز الدین رفعت، وزیر علی سہروردی، محمد ہاشم علی، سید مجیب الرحمن، ڈاکٹر قیوم صادق، شہناز سلطانہ، طیب انصاری، ڈاکٹر لئیق صلاح، ڈاکٹر اکرام باگ، پروفیسر حمید سہروردی، پروفیسر خالد سعید، ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی، ملنسار اطہر احمد، ڈاکٹر سید شاہ خسرو حسینی، ڈاکٹر وہاب عندلیب، فضل الرحمن شعلہ، ڈاکٹر انیس صدیقی۔ پروفیسر عبدالحمید اکبر، ڈاکٹر منظور احمد دکنی، ڈاکٹر خلیل مجاہد، اور ڈاکٹر ماجد داغی امتیاز رکھتے ہیں۔

خاکہ نگاری میں مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر طیب انصاری، وہاب عندلیب، امجد علی فیض، فوزیہ چودھری، منظور وقار اور ڈاکٹر وحید انجم کے علاوہ ڈاکٹر انیس صدیقی، جلیل تنویر، اور مختار احمد منو کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

جاریہ صدی کے پہلے دہے میں گلبرگہ کے قلم کاروں کے دو انتخاب منظر عام پر آئے۔ پہلا افلاک (2003)، مرتبین اکرم نقاش، انیس صدیقی، دوسرا آفاق ترتیب و جائزہ ڈاکٹر وحید انجم، واجد اختر صدیقی (2005)، یقیناً افلاک کڑا انتخاب ہے مگر اس میں ایک دو اور نام شامل کیے جاسکتے تھے۔ دوسرے انتخاب آفاق سے کچھ نام آسانی سے خارج کیے جاسکتے ہیں۔ بہر حال ان دونوں کے منظر عام پر آنے سے اس علاقے کی ادبی سرگرمیوں اور ان کے معیار و رفتار کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ہماری نئی نسل بھی پر عزم و حوصلہ کے ساتھ میدان ادب میں وارد ہے اور نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اپنا مقام بنا رہی ہے ان میں فضل افضل، حامد اشرف، جوہر تماپوری، ڈاکٹر غضنفر اقبال، اطہر معز، واجد اختر صدیقی، ڈاکٹر رفیق سوداگر، آفتاب صمدانی اور مسعود علی تماپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ جدید تر نسل میں حسن محمود، ناصر عظیم، راشد ریاض، باسط فگار، عتیق اجمل، سید عارف مرشد، شکیل صدف اور نور فاطمہ کی شاعری ان کے روشن مستقبل کی غماز ہے۔

علاقائی ادب کی اپنی اہمیت و انفرادیت ہوتی ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ ان دنوں ملک کی ہر ریاست اور ریاست کے مختلف علاقوں میں تخلیق پانے والے ادب اور ان کی اصناف کا محاسبہ و محاکمہ کیا جارہا ہے، کیا جانا ضروری بھی ہے۔ اس طرح کے تجزیوں اور محاکموں سے نہ صرف ادب فروغ پارہا ہے بلکہ وہ علاقائی سرحد کو بھی پھلانگ رہا ہے۔ بلاشبہ گلبرگہ کل اور آج ادبی اعتبار سے نہ صرف کرناٹک بلکہ ملک اور ملک کے باہر نمایاں مقام کا حامل ہے۔ امید ہے کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم ہمارا یہ کاروان ادب منزل کی جانب رواں دواں رہے گا اور یہ علاقہ ریاستی، ملکی اور عالمی سطح پر فکر و خیال کی نئی شمعیں جلائے گا۔

●●

(اکتوبر 2013ء)

ابراہیم جلیس، وزیر علی سہروردی اور سلیمان خطیب
ایک تاثر

گذشتہ دو سال کے عرصہ میں اردو کے بہت نامور ادیب و شاعر دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے درمیان سے اُٹھ گئے۔ شہر گلبرگہ کو بھی موت کے دستِ تطاول سے رستگاری نہ ملی۔ ابراہیم جلیس، مولانا وزیر علی سہروردی اور سلیمان خطیب کی رحلت کا صدمہ بڑا جانکاہ ہے۔ یہ اکابر ثلاثہ ہمارے شہر کی آبرو وادب کی ناموس اور اپنے عہد کی آواز تھے۔ سرزمین گلبرگہ اپنے ان عظیم سپوتوں کی صحابت اور فیضان سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی۔

ابراہیم جلیس:

برصغیر کے ممتاز طنز نگار، معروف افسانہ نویس اور منفرد کالم نویس ابراہیم جلیس کا تعلق گلبرگہ ہی سے تھا جہاں وہ 22 ستمبر 1923ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے انٹرمیڈیٹ تک گورنمنٹ کالج گلبرگہ ہی میں تعلیم حاصل کی۔ جلیس، جناب احمد حسین تحصیلدار کے تیسرے فرزند تھے جن کا دولت کدہ ''اقبال منزل'' محلّہ جگت گلبرگہ میں واقع تھا۔ جلیس محبوب حسین جگر شریک مدیر ''سیاست'' کے چھوٹے بھائی اور ممتاز مزاح نگار مُجتبیٰ حسین کے بڑے بھائی تھے۔ بیگم جلیس (کنیز فاطمہ) گلبرگہ کے ممتاز تاجر حاجی حیدر صاحب مرحوم کی صاحبزادی ہیں۔ گلبرگہ، فرزندان جلیس (شہریار، افتخار، شاہنواز اور شاہین) اور دخترانِ جلیس (ثریا، روبینہ اور زبیدہ) کا بھی مولد ہے۔ جلیس کے کئی قریبی اعزہ آج بھی گلبرگہ میں رہتے ہیں۔ یہاں کی قدیم ادبی انجمن ''گلبرگہ کلب'' سے بھی جلیس صاحب وابستہ رہے۔

ابراہیم جلیس نے 1942ء میں علی گڑھ سے گریجویشن کی تکمیل کی۔ اور علی گڑھ میں قیام کے دوران افسانہ نگاری کے ذریعہ ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ 1948ء میں پاکستان جانے سے قبل اپنی تصانیف زرد چہرے (افسانے) تکونا دیس (مضامین) چالیس کروڑ بھکاری (افسانے) چور بازار (ناول) بھوکا ہے

بنگال (تالیف)، ترنگے کی چھاؤں میں (سیاسی مضامین) اور اُجالے سے پہلے (ڈرامہ) کے باعث ادبی حلقوں میں کافی مقبول تھے۔ پاکستان جانے کے بعد ان کی دیگر تصانیف دو ملک کی ایک کہانی، پبلک سیفٹی ریزر، جیل کے دن جیل کی راتیں، پاکستان کب بنے گا، صرف ایک پیسے کی خاطر، کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں، دیوار چین اوپر شیروانی اندر پریشانی، شگفتہ شگفتہ، ہنسے تو پھنسے، نیکی کر تھانے جا اور آسمان کے باشندے وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔ زرد چہرے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ اور آسمان کے باشندے ان کے مضامین کا آخری مجموعہ ہے۔

جلیس پاکستان میں اردو صحافت کے لیے وقف ہو گئے تھے اور اسی کی خاطر اپنی جان دے دی انھوں نے روزنامہ امروز، جنگ، انجام، حریت اور پیپلز پارٹی کے اخبار مساوات کی ادارت کی اور ان میں مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ اکتوبر 1977ء میں مساوات کی اشاعت بند ہو جانے سے وہ چراغ پا ہو گئے ان کے پیش نظر صحافت کی آزادی اور عامل صحافیوں کے حقوق کا تحفظ تھا، چنانچہ انھوں نے 25/ اکتوبر 1977ء کی صبح معتمد داخلہ پاکستان سے اس مسئلہ پر کڑی تلخ بحث کی اور مساوات کے دفتر واپس ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے کہ اچانک ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ یوں بھی وہ دل کے مریض تھے۔ مساوات کی مسدودی کے صدمے سے ان کے دماغ کی شریانیں پھٹ گئیں۔ 26/ اکتوبر 1977ء کی صبح ڈاکٹروں کی تمام تر کوششوں کے باوجود جلیس صاحب کراچی کے جناح ہاسپٹل میں اپنے بے شمار چاہنے والوں کو داغِ مفارقت دے گئے اور شہیدِ صحافت کا مرتبہ حاصل کیا:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مولانا وزیر علی سہروردی:

مولانا وزیر علی سہروردی کا شمار گلبرگہ کے بزرگ ادیبوں اور ادب نوازوں میں ہوتا ہے۔ مرحوم اردو اکادمی گلبرگہ اور سلامتی ادبی تہذیبی فورم گلبرگہ کے سرپرست تھے۔ مولانا اس قدیم دکنی تہذیب کے آخری نمائندے تھے جس کی سرشت میں وضعداری، شرافت اور مروت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ سراپا عجز و انکسار تھے۔ مولانا آخری عمر میں بھی جلسوں، کمیٹیوں اور ادبی محفلوں میں بلاناغہ شرکت کرتے تھے۔ علمی و ادبی کاموں میں ہمیشہ لگے رہتے تھے۔ انہوں نے نصف درجن سے زیادہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔

اہل گلبرگہ مولانا کے علمی وادبی احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے۔انھوں نے جدید گلبرگہ کی ادبی تاریخ مرتب کی۔اپنی گراں قدر تصانیف یادصد برگ، یادسبز برگ، یادگلبرگ اور گلرنگ کے ذریعہ گلبرگہ کے ادبی تہذیبی اور معاشرتی تاریخ کے علاوہ آج سے 50 سال قبل کے گلبرگہ کے ادیبوں، شاعروں، صوفیوں اور مجذوبوں کے حالات زندگی اور کارہائے نمایاں کو محفوظ کردیا۔ 17/اگست 1975ء کی شام گلبرگہ میں اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام مولانا موصوف کی تصنیف گلرنگ کی رسم اجراء انجام دیتے ہوئے جدید لہجہ کے منفرد شاعر جناب مشتاق علی شاہد (دہلی) نے بھی فرمایا ''گلبرگہ کی تاریخ وتہذیب مولانا وزیر علی سہروردی کی تصانیف کے ذریعہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئی۔جناب شاہد نے کہا کہ قدیم مکتب خیال سے وابستگی کے باوصف مولانا کا انداز بیاں جدید اور صاف ستھرا ہے اگر چہ وقائع نگاری ادب کی خشک صنف ہے مگر مولانا نے ''گلرنگ'' میں دلنشین انداز اختیار کیا ہے''۔

مولانا کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے برادر بزرگ مولانا مخدوم علی تاب سہروردی کے کلام کے تین مجموعے طاب تاب، شباب تاب اور خطاب تاب شائع فرمائے۔تاب سہروردی دکن کے کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔مولانا کی شخصی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ ایسے بلند پایہ شاعر کا کلام زمانے کی دست برد سے محفوظ ہوگیا۔

مولانا کے حلقہ احباب میں ہر مسلک اور ہر عمر کے لوگ شامل تھے۔خصوصاً نوجوانوں سے انھیں بے حد انسیت تھی اور نوجوان بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔وہ گلبرگہ کی قدیم تہذیب کی آخری بہار اور اس کی شرافتوں کا نادر نمونہ تھے۔مولانا کا 3/جنوری 1978ء کی سہ پہر سیول اسپتال گلبرگہ میں 70 سال کی عمر میں مختصر سی علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ان کی پیچی باتیں، مروت، وضعداری اور دردمندی دل سے کبھی محو نہیں ہوسکتی۔مگر ان کی وفات سے ہم نے ایک شفیق سرپرست اور بزرگ دوست کھودیا اب کون ہمیں ہماری کوتاہیوں پر ٹوکے گا؟ ہم کس سے مشورہ لیں؟ اب کون ہماری خاطریں کرے گا؟ سخن فہمی، وضعداری اور مردم شناسی مولانا کے ساتھ ختم ہوگئی۔خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے، (آمین)۔

سلیمان خطیب:

دکنی کے دلنواز شاعر، اردو اکادمی گلبرگہ کے صدر سلیمان خطیب کا 22/ اکتوبر 1978ء کی صبح دواخانہ عثمانیہ حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایسے منسوڑ، زندہ دل اور بے ضرر شاعر پر بھی موت آسانی سے فتح پا سکتی ہے۔ ان کے انتقال سے ارض گل و برگ اپنے مایہ ناز فرزند اور دکنی زبان اپنے عاشق صادق سے محروم ہوگئی۔

ادبی محفلوں اور شاعروں میں اب وہ طمطراق کہاں؟ یہ محفلیں، خطیب صاحب کے بغیر سونی سونی ہیں۔ سلیمان خطیب ملک کے مقبول ترین عوامی شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے لیے جس زبان کا انتخاب کیا وہ عوام کی بولی تھی۔ اس زبان میں طبع آزمائی کرنا آسان نہیں تھا۔ انھوں نے دکنی کو نہ صرف اظہار خیال کا ذریعہ بنایا بلکہ اس زبان کے وقار اور اعتبار کو بلند کیا۔ بقولِ شخصے ایک "لچر" سی زبان کو سنوار کر درجہ کمال تک پہنچایا اور ثابت کر دیا کہ اس زبان میں بھی لطیف سے لطیف احساس کو شعری جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ خطیب صاحب کی زبان قدیم دکنی سے مختلف ہے۔ ہم اسے جدید دکنی کہہ سکتے ہیں جدید دکنی کا چلن آج بھی سارے جنوبی ہندوستان میں عام ہے اور یہ زبان شمالی ہند میں بھی اجنبیت محسوس نہیں کرتی یہی وجہ ہے کہ سلیمان خطیب کی شاعری کو کنیا کماری سے کشمیر تک یکساں طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔

خطیب صاحب نے کم و بیش 30 سال تک شاعری کی مگر ان کی مقبولیت کا دور 1960ء سے شروع ہوتا ہے۔ خطیب صاحب جدید دکنی کے صاحب طرز دیدہ ور شاعر تھے۔ ان کے کلام میں جذبات کی شدت کے ساتھ ساتھ ندرتِ خیال اور علوے فکر جیسے محاسن بھی پائے جاتے ہیں۔ انوکھی اور اچھوتی تشبیہوں نے ان کی شاعری میں رس گھول دیا ہے۔ پگڈنڈی، یاد، ندی اور دکنی عورت کا انتظار، خطیب صاحب کی شاہ کار نظمیں ہیں جن میں شاعر نے منظر کشی اور فطرت نگاری کا کمال دکھایا ہے اور جذبات کی کامیاب ترجمانی کی ہے۔ ان کی نظمیں پہلی تاریخ، ساس بہو، سانپ، چھورا چھوری، ہراج کا پلنگ، اٹھائیس تاریخ وغیرہ سماجی حقیقت نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ بیچارگی، (پیروڈی) اور "ہمالہ کی چاندی" (ترانہ) بھی مقبول اور متاثر کن نظمیں ہیں۔

سلیمان خطیب 1922ء میں معین آباد (چٹگوپہ) ضلع بیدر کے خطیب خاندان میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم رائچور میں اور ثانوی تعلیم میدک میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان نامپلی ہائی اسکول سے کامیاب کیا۔ بعدازاں جامعہ نظامیہ سے منشی فاضل کی تکمیل کی کلکتہ سے آبرسانی کی تربیت حاصل کرنے کے بعد 1945ء میں گلبرگہ کے واٹر ورکس (پانی محل) کے مہتمم مقرر ہوئے اور اسی منصب سے 1977ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

سلیمان خطیب خوش نصیب شاعر ہیں کہ ان کی زندگی میں ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ 1964ء میں بزم اردو گورنمنٹ کالج نے خطیب نمبر شائع کیا۔ کچھ عرصہ بعد مبارزالدین رفعت نے "سلیمان خطیب اور ان کا کلام" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جس میں نمونہ کلام کے علاوہ شاعر پر مضامین شامل ہیں۔ پروفیسر سری رام شرما کی ہندی کتاب "دکنی کے گدوپد" میں بھی خطیب صاحب کا منتخب کلام شریک ہے۔ فروری 1974ء میں سلامتی ادبی، تہذیبی فورم گلبرگہ کے ایک عظیم اجتماع میں خطیب صاحب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں اعزاز سے نوازا گیا۔ اسی سال "یوم تاسیس کرناٹک" کے موقع پر حکومت کرناٹک نے بھی انھیں اسٹیٹ ایوارڈ عطا کیا۔ زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان ماہنامہ شگوفہ کے دو خطیب نمبر شائع ہوئے۔ ایک خطیب صاحب کی زندگی میں ان کے جشن کے موقع پر اور دوسرا ان کے انتقال کے بعد گلبرگہ کی ادبی انجمنوں کی جانب سے 7 /دسمبر 1975ء کو شاعر کے شایانِ شان "جشن سلیمان خطیب" کا انعقاد عمل میں آیا، اس موقع پر سلیمان خطیب کا مجموعہ کلام "کیوڑے کا بن" اردو اور دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوا۔ گلبرگہ کے اردو روزنامے "سلامتی" کی جانب سے بھی جشن کے موقع پر "خطیب نمبر" کی اشاعت عمل میں آئی۔ ان دنوں پونا یونیورسٹی کے ایک طالب علم خطیب صاحب کی شخصیت اور شاعری پر ریسرچ بھی کر رہی ہے۔

حیف! وہ باغ و بہار ہستی، جس کے دم سے محفلوں کی رونق قائم تھی ہمیشہ کے لیے ہمارے درمیان سے اُٹھ گئی۔ اب وہ آواز اپنے مخصوص لب و لہجے کے ساتھ کبھی سُنائی نہیں دے گی۔ خطیب صاحب کی موت ایک البیلے شاعر اور ایک محبوب و مخلص دوست کی موت ہے۔ ایسے فنکار روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ہم ان پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں:

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

خدا انھیں اپنی رحمت بے پایاں سے سرفراز کرے۔ (آمین)۔ ●●

(دسمبر 1978ء)

مظہر محی الدین : صالح اقدار کا باکمال شاعر

''لفظ لفظ روشنی'' فکر اسلامی کے ممتاز شاعر مظہر محی الدین کا تیسرا شعری مجموعہ ہے قبل ازیں ان کے دو مجموعے ''جاگتی دہلیز'' (1984ء) اور ''اعتبار'' (2003ء) شائع ہو کر مقبولِ عام ہو چکے ہیں۔ مظہر محی الدین کی شاعری رومان اور جدید رجحانات سے گذر کر فکر اسلامی تک کئی زینے طے کر چکی ہے۔ کتاب کے آغاز میں ۲ مناجاتوں، ۲ نعتوں اور آخر میں ۳ نظموں کے سوا باقی اوراق پر غزلوں کا ایک جہاں آباد ہے۔ جس سے صنفِ غزل سے شاعر کی گہری اُنسیت کا اظہار ہوتا ہے۔

مظہر محی الدین کی شاعری صحت مند اقدار اور زندگی کے مثبت پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ نظریاتی پیچیدگی اور فلسفیانہ موشگافی سے پاک یہ شاعری اپنا ایک مقصد رکھتی ہے۔ شاعری اُن کے ہاں تفریحِ طبع کا ذریعہ نہیں بلکہ مقصدِ حیات ہے۔ یہ مقصدیت موقتی نہیں بلکہ اس میں آفاقیت پائی جاتی ہے جو اسلام شناسی کا نتیجہ ہے۔ اسلام نے سربلندی، عزم و استقلال، خودداری، عزتِ نفس اور بلند حوصلگی کی جو تعلیم دی ہے، اُسی کو شاعر نے اپنے پیغام کی اشاعت کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ ماضی کی اساس پر روشن مستقبل کا خواہاں ہے شاعر اپنے متعینہ مقصدِ حیات کو فراموش نہیں کرتا بلکہ اوروں کو بھی اس سے باخبر کرتا ہے:

یہ باعث نجات بھی ہے، فرض عین بھی
روشن قدم قدم پہ چراغ حرا کرو

شاعر اس راہ پر آگے بڑھتا ہوا حکم ناطق بھی صادر کرتا ہے:

صدقِ مقال، مشعلِ راہِ حیات ہے
اس روشنی سے ہٹ کے نہ ہرگز چلا کرو

شاعر کارزارِ زندگی کا ایک ایسا جہدکار ہے جو معاشرتی کوتاہیوں پر آنسو نہیں بہاتا بلکہ ''حرفِ لافانی'' کی روشنی میں قدم آگے بڑھاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس کے دل میں خوفِ خدا موجود ہے وہ مصلحتوں کا شکار نہیں ہوتا، وہ بے خوف و خطر اپنا راستہ خود بناتے ہوئے آگے بڑھتا ہے بلکہ اپنی بات حرفِ جلی میں کرتا ہے:

یہی تو بات کھٹکتی ہے نکتہ چینوں کو
جو بات کرتے ہیں حرفِ جلی میں کرتے ہیں

منزلِ مقصود کی رسائی تک شاعر کے پیشِ نظر ایک ہی راستہ ہے وہ ہے خوفِ خدا۔ شاعر دنیوی جاہ و عز و شرف کا طلب گار نہیں، دیکھیے وہ خدا سے کیا مانگ رہا ہے:

نہیں اس سے بڑھ کر عطا میرے مولا
ترا خوف دل میں سدا میرے مولا

شاعر صرف خوفِ خدا کا آرزومند نہیں بلکہ اس کی معنویت سے بھی آگاہ ہے:

وہ خوف، خوف نہیں ایک لفظِ بے معنی
خدا کا خوف اگر دل کا پاسباں نہ بنے

نظم ہو کہ غزل، مناجات ہو کہ نعت، ہر صنف شاعر کے حق میں کارِ رسالت رساں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بہر صورت یہ متاعِ نطقِ حق کی ترجمان بنی رہے:

تری گفتار میں، رفتار میں اور پارسائی میں
نمونہ بن کے اُبھرے ہر عمل کارِ رسالت کا

جو شاعر ایک خاص مقصد کو اپنی شاعری کا ذریعہ بناتا ہے اُسے روایتی عشق اور پامال مضامین سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یقیناً مظہر محی الدین کی شاعری لُطف و چٹخارے کی شاعری نہیں ہے۔ اُن کا یہ شعر:

یہ فرضی عاشق و معشوق جزوِ شاعری کب تک
سخن سنجی ہے کچھ کارِ دیگر ہم بھول جاتے ہیں

مظہر کی شاعری میں طنز بھی ایک نمایاں وصف ہے جس کی بدولت کلام میں دلکشی اور تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ طنز کا یہ رنگ ملاحظہ ہو:

زعمِ سخن میں کتنے ہی طفلانِ کم سواد
اک جست میں زمین و فلک پار کر گئے

کوئی لکھتا، کوئی سناتا ہے
شعر گوئی بھی کاروبار ہے کیا؟
بے نام تھے تو اپنے پرائے کا تھا خیال
مسند نشین ہوتے ہی سب کچھ بسر گئے

مظہر محی الدین کی تلمیحات بھی قابل توجہ ہیں جن کا خوشگوار اثر قاری کے ذہن پر تادیر قائم رہتا ہے، ملاحظہ ہو:

مانا کے درِ ثور میں خطرہ بھی بہت تھا
مکڑی کا وہ اک ہلکا سا جالا بھی بہت تھا
فرشتے ہم نفس ہو جاتے، رحمت ہم نوا ہوتی
جلا کر کشتیاں دریا میں اپنا راستہ کرتے
اب اس سے بڑھ کے بھلا اور کیا ہو ضبطِ الم
کہ خالی ہانڈی میں پتھر اُبال رکھا ہے

تاریخی بصیرت، طنزیہ رنگ، جدید لب ولہجے، شستہ زبان اور عمدہ تراکیب کے باعث، مظہر محی الدین کا شمار اہم سخنوروں میں ہوتا ہے اس وصف کا شاعر کو بھی عرفان ہے:

ہمارا کارِ ہنر معجزے سے کیا کم ہے
کہ کائنات کو ضم شاعری میں کرتے ہیں

●●

(اکتوبر 2011ء)

ڈاکٹر راہی فدائی : شناور بحر رمز و معنی

مولانا ظہیر احمد باقوی المعروف بہ راہی فدائی، اردو عربی اور فارسی کے باکمال عالم اور اردو کے نامور سخن ور ہیں۔ جامعہ الباقیات الصالحات عربی کالج ویلور میں بحیثیت عربی استاد قابل قدر خدمات نیز تحقیق وتنقید اور شعر وسخن کے شعبوں میں نمایاں سرفرازی کے باعث ان کی شخصیت خود باقیات الصالحات سے کم نہیں۔ مدراس یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ سینیٹ اور اکادمک کونسل کے رکن کی حیثیت سے ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ خدمت خلق کے علاوہ ادب پروری وادب نوازی کے باعث سارے جنوب میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ بیک وقت آندھرائی، مدراسی اور کرناٹکی ہونے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ وہ درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ حال میں شائع شدہ "یا صاحب الجمال ﷺ وہ مختصر منظوم سیرت طیبہ ہے جس کے ذریعہ انھوں نے سیرت طیبہ کے بحر ذخار کو کمال فن کے ذریعہ کوزے میں بند کردیا ہے۔

فی الحال "فیہما" کلیات راہی فدائی پیش نظر ہے جس میں تازہ کلام کے علاوہ تصنیف 1981ء اناال 1987ء ترقیم 1990ء الیھا الناس 1998ء اور نبراس 2003ء کی غزلیں بھی شامل ہیں۔

شاعری وہبی ہے یا کسبی، ایک عرصے سے بحث ہوتی رہی ہے ہوتی رہے گی۔ شاعری کو الہام، القاء یا نوائے سروش بھی کہا گیا ہے۔ اچھی شاعری پر جزوییت از پیغمبری کا اطلاق ہوتا ہے۔ مگر شاعری وہبی بھی ہے کسبی بھی۔ وہ فکر انسانی سے ماورا نہیں۔ موزونیت طبع وہبی ہے مگر فکر وفن کی جولانی ریاضت چاہتی ہے۔ دراصل جذبہ واحساس کے مربوط نظام کا نام شاعری ہے۔ اسی احساس ونظریے کے نقیب ڈاکٹر راہی فدائی ہیں جو گذشتہ تین دہائیوں سے گیسوئے اردو سنوارنے میں مصروف ہیں۔

ان کی شاعری کے موضوعات عصری حسیت سے معمور ہیں۔ خصوصاً معاصر زندگی کی نیرنگیوں اور انسانی اقدار کے زوال کو موضوع بنایا ہے۔ اس ضمن میں ان کا کہنا بجا ہے:

کہنہ عادات و روایات کے محرابوں میں
نئے افکار کی قندیل جلا لیتا ہوں

'فہما' کی شاعری تقریباً 600 صفحات پر محیط ہے۔ میں ان اوراق پر پھیلی ہوئی ارفع شاعری کی چند خصوصیات کے ذکر پر اکتفا کر رہا ہوں خود شاعر نے مشورہ دیا ہے:

فہرست پر ٹھہر، ورق انتساب دیکھ
تفصیل ساری چھوڑ دے لب لباب دیکھ

عربی اور مذہبیات سے تعلق خاطر کے باعث ان کے لفظیاتی نظام پر عربی حاوی ہے اور اخلاقی مضامین کی فراوانی بھی۔ فارسی وعربی الفاظ وتراکیب کا استعمال عام ہے۔ مجموعے کے آغاز میں خدائے لم یزل ولایزال کی شان اقدس میں جو حمد یہ اشعار کہے گئے ہیں وہ خدائے قدوس کی قدرت وعظمت کا احاطہ کرتے ہیں۔ سادگی و پرکاری کا یہ نمونہ دیکھیے:

غنی وہی ہے سخی بھی وہی، وہی جواد — کبھی فقیر ہیں سائل ہیں یا اولی الالباب
ازل سے تا ابد رحمتوں کے چرچے ہیں — غضب کا ذکر مگر ہے حقیقتاً کم یاب
اسی نے بخشی ہے زلف سحر کو ظلمت شب — عطا کی شام کے چہرے کو صبح آب وتاب
وہی تو خالق ومالک ہے کل جہانوں کا — ہر ایک نام، اسی کا اسی کے سب القاب

نعت بھی کہتے ہیں تو ایمان وہ یقین کی پختگی کے ساتھ ملاحظہ ہو:

تکمیل دیں کا مژدہ ملا آپ کے طفیل
پایا نہ کوئی دین یہ اعزاز دیکھنا

راہی کی غزلوں میں روایتی مضامین کی کمی ہے۔ اپنے صوفیانہ مزاج کے باعث روایتی مضامین سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ جہاں بھی اظہار کی نوبت آئی شائستگی کا مظاہرہ کیا:

روح روشن نہ ہوئی اور نہ دل ہی بہلا — وقت برباد کیا جسم کی آرائش میں
در پہ دیتا ہے صدا رات گئے — دیکھ یادوں کا مسافر ہوگا
جلتی راتوں کی ضیا پاشی میں — کون خوابوں کا مشاور ہوگا
دھیمی دھیمی ہی سہی اب ترے ذکر کی آنچ — میرے اشعار کی تاثیر کو گرماتی ہے
سوچتا ہوں تو نکل آتی ہے اک قوس قزح — دیکھتا ہوں تو تری شکل نظر آتی ہے

الفاظ کا انتخاب اور عمدہ تراکیب کا استعمال انھیں ایک نادرہ کار شاعر کے روپ میں پیش کرتا ہے۔
شاعر معنی الفاظ کو رد کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے:

سجدے کریں گے فکر و نظر کے ملائکہ
معنی کی روح لفظ کے پیکر کو دیجیے

لفظ کے پیکر میں معنی سمونے والا شاعر شناور بحر رمز معنی ہی تو ہے۔ پامال راستوں سے گریز کرتے ہوئے شاعر نے اپنی راہ خود بنائی ہے۔ انھوں نے خیال کہنہ و بے کیف استعاروں کے ذریعہ شاعری کو بوجھل نہیں بنایا۔ غزل میں ان کی یہ راہ الگ سے پہچانی جاتی ہے۔ انھوں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا:

صراط مستوی سنسان ہے کب سے
چلو راہی یہ راہ احتیاط اچھی

راہی نے شاعری کے ذریعہ پیغام کا کام نہیں لیا بلکہ داخلی محرکات کے تحت شعر کہے ہیں۔ ان کی شاعری ان کی قوت اختراع اور مشاہدات و تجربات کی دین ہے۔ ان کی آزادئ روش اور تقلید گریزی پر رشک آتا ہے۔ شاعر اس احساس سے بے خبر نہیں:

آزادئ روش ہے نئی منزلوں کی یافت
راہؔی کبھی کسی کی نہ تقلید کیجیے

فیشن زدہ جدیدیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ ابہام کے باوجود ان کی شاعری رمز بے معنی نہیں بلکہ قابل فہم ہے۔ اشتراکیت سے دوری کے باوصف وہ طبقاتی نظام میں مجبوروں کے ساتھ نظر آتے ہیں جو اسلام کی دین ہے۔ ملاحظہ ہو۔

عیش و عشرت کو سیم تن کی تلاش
ننگے جسموں کو ہے کفن کی تلاش

ہر ایک مسند عشرت کو مل گئے تختے
صلیب و دار کو شہرت کی بھیک بھی نہ ملی

ان کی شاعری کا ایک اہم وصف طنز نگاری ہے جس سے انھوں نے جابجا حربے کے طور پر

استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو طنز کی یہ کاٹ:

علم و عرفان چھپ گئے ہیں زیرِ زیبِ پیرہن
عظمتیں موقوف ہیں بس جبہ و دستار پر

گھر کے اندر سو رہا ہے انتقام
گھر کے باہر شورشِ ایثار ہے

باہر لکھا تھا خوں سے خوش آمدید
اندر کوئی اخلاص کا داعی نہ تھا

آج کے دیدہ وران ذی ہوش
فیل خانے میں بھی خرد ڈھونڈتے ہیں

اس مجموعہ میں شامل اس طرح کے سینکڑوں اشعار قاری کو اپنی پوری گرفت میں لیتے ہیں:

سخنوران عہد نو میں راہیا
ہنوز آپ مستند کہاں ہوئے

یقیناً انھوں نے عجز و انکسار سے کام لیا ہے۔ وہ تو اب ایک مستند سخنور کی حیثیت سے برصغیر میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔

ان ہی کا یہ شعر

بحمد اللہ غزل راہیؔ کی سُن کر
ہوئے ہیں معترف اہلِ زبان تک

●●

(اکتوبر 2008ء)

مداحِ پیمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم : ڈاکٹر تابش مہدی

چند سال پہلے 2002ء میں راقم کو آندھرا پردیش کے شہر کڑپہ میں ایک کل ہند نعتیہ مشاعرے کی نگرانی تفویض کی گئی تھی۔ امید تھی کہ اس مشاعرے میں ممتاز شاعر و "کڑپہ میں اُردو" کے مصنف جناب راہی فدائی سے بازدید ہوگی مگر وہ مستقر پر موجود نہیں تھے۔ اس مشاعرے میں جن شعرا نے نعت سرائی کی، ان میں برق کڑپوی کے علاوہ عزم شاکری (ایٹہ، یوپی) اور تابش مہدی (دہلی) نے متاثر کیا۔ خصوصاً تابش مہدی کو سنتے ہوئے محسوس ہوا کہ دل کی آواز، دل میں پیوست ہورہی ہے۔ کلام اور پیرایہ اظہار نے سماں باندھ دیا۔ کڑپہ کے بعد بھی بنگلور اور گلبرگہ میں ان کی نعتوں اور غزلوں کی سماعت کا موقع ملا۔ اُن سے شناسائی اور قربت میں اضافہ ہوا۔ اور آج بھی اُن سے ربط قائم ہے۔

تابش مہدی ایک طویل عرصے سے غزل گوئی کے علاوہ نعت گوئی کے لیے بھی ملک اور ملک کے باہر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انھیں نثر نگاری سے بھی شغف ہے۔ علوم شرقیہ اور اسلامیات میں درک رکھتے ہیں۔ اُردو ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی ہے۔ بارگاہ ایزدی میں ان کی یہ دعا کہ:

کفر و باطل پہ تنقید کرتا رہوں
ایسا اُسلوب ایسا قلم دے مجھے

مقبول ہوگئی ہے اور انھیں ایسا قلم اور اسلوب مل گیا ہے۔ جن کے ذریعے وہ کفر و باطل کے خلاف نبرد آزما ہیں۔

تابش صاحب دینی گھرانے کے زائیدہ اور علمی ماحول کے پروردہ ہیں۔ موصوف کی زندگی کو مذہبی رُخ دینے میں ان کے نانا مرحوم میاں ثابت علی ناجیہ پوری کی خصوصی توجہ رہی ہے۔ جنھیں اپنے وقت کے اکابر علما و صلحا سے وابستگی اور قربت حاصل تھی۔ علاوہ ازیں تابش مہدی نے نامور اساتذہ سے کسب فیض کیا ہے۔ طوطیِ ہند مولانا ابوالوفا عارف شاہ جہاں پوری، حسان الہند علامہ بلالی علی آبادی اور سلطان سخن علامہ شہباز صدیقی امروہی کا شمار ان کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ شہباز امروہی کی فیضِ نظر کا انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے:

حضرت شہباز امروہی کا ہے فیضِ نظر
شعرِ تابش میں جو علم وفن کی یہ تنویر ہے

تابش کی شاعری کا باقاعدہ آغاز نعت گوئی سے ہوا۔ انھوں نے نعت گوئی کے لیے غزل کے فارم کا انتخاب کیا اور عبادت سمجھ کر نعت گوئی پر توجہ فرمائی۔ ملاحظہ ہو:

نعت کہتا ہوں اس لیے تابش
نعت گوئی بھی اک عبادت ہے

اس صنف میں ان کے جذب ومحویت کا اندازہ ذیل کے شعر سے بھی ہوتا ہے:

مشغول جب سے نعت شہِ انبیا میں ہوں
محسوس ہورہا ہے، جوارِ خدا میں ہوں

تاحال ان کی نعتیہ شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''لمحات حرم'' دسمبر 1975ء میں امروہہ کی انجمن طلبہ ''دائرۃ الفکر'' نے شائع کیا۔ ''سلسبیل'' ان کی نعتیہ شاعری کا دوسرا مجموعہ ہے جو 2000ء میں شائع ہوا۔ ''صبح صادق'' ان کی نعتیہ ومنقبتی شاعری کا تیسرا مجموعہ ہے۔ جو 2008ء میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ اس سلسلہ کا چوتھا مجموعہ ''طوبیٰ'' 2012ء میں منظرِ عام پر آیا۔ جس میں حمد، نعت ومناقب شامل ہیں۔ اب انھیں اس صنف میں اعتبار واستناد کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ جسکا انھیں عرفان بھی ہے:

اک شاعر کہ تابش کہیں جسے
نعت کے فیض سے معتبر ہو گیا

وہ گذشتہ پانچ دہوں سے شعر کہہ رہے ہیں اور اپنی اس نعت گوئی کے طفیل حضرت حسانؓ کی ہمسائیگی کے متمنی ہیں:

تابش یہ کیا عجب کہ تجھے نعت کے طفیل
حسانؓ نعت گو کی بھی ہم سائیگی ملے

نعت گوئی یوں تو آسان نظر آتی ہے مگر وہ دشوار بھی ہے۔ اس میں جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے: باخدا دیوانہ باش وبا محمد ہوشیار

اس میں کسی قسم کی بے احتیاطی اور لغزش روا نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ سے محبت وعقیدت ہمارے ایمان کا جز ہے لیکن اس محبت وعقیدت کی حد وہاں ختم ہوتی ہے جہاں سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کی حد شروع ہوتی ہے۔ تابش مہدی کو حمد و نعت گوئی کا عرفان ہے۔ کہتے ہیں:

نعت نبیؐ کا مرحلہ دشوار ہے بہت
میں نے حصارِ فکر میں آ کر کہی ہے نعت

وہ الوہیت اور نبوت کے درجات سے بدرجہ اتم واقف ہیں۔ انھوں نے محبت کی سرشاری میں کبھی بھی افراط اور غلو کو روا نہیں رکھا، جس کی تصدیق اُن کے ان اشعار سے ہوتی ہے:

یہ نعت کی محفل ہے، نہ بڑھ حد ادب سے
شائستہ ہو، جو بات بھی نکلے ترے لب سے

یہ ارضِ نعت ہے تابشؔ سنبھل کے چلو
وفورِ شوق میں کوئی نہ بھول ہو جائے

نہ بڑھ جاؤں کہیں حدِ ادب سے
تیری سرکار میں کیسے بولوں

جب بولنے پر آتے ہیں تو انھیں احساس ہوتا ہے کہ "ذکر نبیؐ" ہے لب کشائی سے پہلے زبان کو مشک وعنبر سے دھو لیں:

پئے ذکر نبیؐ میں لب جو کھولوں
زباں کو مشک سے عنبر سے دھو لوں

تابش مہدی اپنی زندگی میں "اطیع اللہ واطیع الرسول" پر کاربند ہیں۔ انھیں رسول اکرمؐ سے عقیدت کے ساتھ ساتھ شریعت کی پاسداری کا بھی لحاظ ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اللہ نے قرآن میں یہ صاف کہا ہے
جو پیروِ احمدؐ ہے وہ محبوبِ خدا ہے

مصطفیٰ ہیں جس سے راضی اس سے راضی ہے خدا
جو نہیں ہے مصطفیٰ کا کب خدا کا ہے میاں

نقش پائے رسولؐ پر چلیے
درحقیقت یہی شریعت ہے

رہ صواب سے ہٹنا محال ہے میرا
رسول پاک کا اُسوہ میری نگاہ میں ہے

تابش صاحب کی نعتوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں سرزمیں مدینہ سے بے حد چاہت وانسیت ہے۔ انھوں نے شہر مدینہ کو ''ارض نعت'' کہا ہے۔ اور اسکی افضلیت کے یوں قائل ہیں:

دنیا کے شب و روز میں افضل نہیں کوئی
اے شہر مدینہ ترے دن سے تری شب سے

دیکھ لینا بھی شہر طیبہ کو
خوش یقینی کی اک علامت ہے

مدینے سے عقیدت جزو ایماں
مدینہ رحمت عالم کا گھر ہے

یہی وجہ ہے کہ شاعر زندگی، آگہی اور روشنی کے حصول کے لیے مدینہ چلنے کی تلقین کرتا ہے:

روشنی چاہیے تو مدینے چلو
زندگی چاہیے تو مدینے چلو
آگہی کے لیے کیوں بھٹکتے ہو تم
آگہی چاہیے تو مدینے چلو

غرض تابش مہدی کی نعتوں میں رسول اکرمؐ اور شہر مدینے سے محبت وشیفتگی کی والہانہ کیفیتیں ملتی ہیں۔ ان نعتوں کو پڑھتے ہوئے سیرت پاکؐ اور اخلاق حسنہ کے مختلف گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ اُن کی

نعتیں ہمارے ثقافتی ورثے اور نعتیہ شاعری کی دیرینہ ومثبت روایت کا حصہ ہیں۔ نہ صرف دانشوروں کی رائے بلکہ خود اپنی دلی خواہش کے مطابق اب اُن کی شاعرِ دربارِ مصطفیؐ اور مداحِ پیمبرؐ کی حیثیت سے پہچان ہوگئی ہے:

تابشؔ کے سلسلے میں ہے دانشوروں کی رائے
کہیے اسے بھی شاعرِ دربارِ مصطفیؐ

اب تو یہی ارمان ہے تابشؔ میرے دل میں
پہچان ہو مداحِ پیمبرؐ کے لقب سے

(2012ء)

●●

سلیمان خطیب بحیثیت نثر نگار

سلیمان خطیب کا بحیثیت شاعر دور دور تک شہرہ ہے۔ مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ اچھی نثر لکھنے پر بھی قادر تھے۔ دراصل سلیمان خطیب نے طالب علمی کے دور ہی سے لکھنا شروع کیا تھا، ابتدا میں لطائف اور پہیلیاں لکھیں اور رسائل کو روانہ کرتے رہے۔ سگریٹ نوشی کے مضر اثرات کے بارے میں انکا ایک مضمون اگست ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ اتالیق اورنگ آباد میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت سلیمان خطیب میدک ہائی اسکول کی جماعت نہم کے طالب علم تھے۔ ان کے لطائف اور پہیلیاں ماہنامہ سب رس حیدرآباد کے شمارہ اگست ۱۹۳۹ء میں جگہ پا چکی تھیں۔ انہوں نے ابتدا میں اپنے مضامین مختلف ناموں گمنام حیدرآبادی، حق گو، بشب سالومن (Bishopsoloman) اور ایک مزاحیہ مضمون ''کیا خوب زمانہ ہے'' ہنس مکھ لال کے نام سے لکھا۔

سلیمان خطیب کی نثری تخلیقات میں ڈراموں، افسانوں، مضامین، انشائیوں کے علاوہ ان کے خطوط کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان کے مضامین ملک کے معیاری رسائل، نگار، سب رس، رباب، ساقی، ہمایوں، شباب، جہانگیر عطارد، آج کل، منادی۔ اتالیق، عالمگیر، پرچم، آندھرا پردیش ہمدرد، انسان، زاویے، جام حیات، گلبرگ، صبا، نقوش (ناندیڑ)، رہبر دکن، میزان، پیام اور سیاست حیدرآباد میں شائع ہو چکے ہیں۔ مگر ان کی تمام تحریریں دستیاب نہیں ہیں، عبارت میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ تحریر عام فہم، بے تکلف اور روزمرہ اور محاورات سے عبارت ہے۔ سلیمان خطیب مشرقی تہذیب کے حامل اور مغربی تہذیب سے نالاں تھے۔ جس کا اظہار شاعری کے علاوہ انکی نثری تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ ان کی تحریروں کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ لطیف مزاح سے کام لے کر معاشرہ کی ناہمواریوں پر گہری چوٹ کرتے ہیں۔ یہاں مختلف اصناف کے تحت ان کے بعض رشحاتِ قلم کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

ڈرامے : نثر سے انھیں ابتدا ہی سے دلچسپی رہی ہے۔ گلبرگہ میں اپنے دور کے کامیاب ڈائرکٹر رہے ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں ''حق نمک'' کی ہدایت کاری کی تھی۔ جوانی میں کالج کے طلبہ کے لیے خواجہ احمد عباس کا

ڈرامہ "یہ امرت ہے" ڈائرکٹ کیا۔ مجتبیٰ حسین گلبرگہ کالج کے ایک ڈرامے کے بارے میں لکھتے ہیں۔ جب ہم لوگوں نے گلبرگہ کالج میں "یہ امرت ہے" اسٹیج کرنے کا فیصلہ کیا تو پتا چلا کہ اس ڈرامے کے ہدایت کار سلیمان خطیب ہیں۔ سلیمان خطیب نے جب ڈرامے کی ہدایت کاری شروع کی تو ہم موصوف کی زبردست صلاحیتوں سے آگاہ ہوئے" ۔[2]

سلیمان خطیب کے تحریر کردہ ڈراموں میں پنگھٹ، نمک، زنجیریں اور بھائی کو خصوصیت حاصل ہے۔ یہ ڈرامے اسکولوں اور کالجوں میں اسٹیج کیے جاتے رہے۔ پہلی جھگی اور پانچواں رسم ان کے ریڈیائی ڈرامے ہیں۔ پہلی جھگی منظوم ڈرامہ ہے۔ پانچواں رسم بھی ریڈیائی ڈرامہ ہے جو جہیز کی لعنت کیخلاف لکھا گیا ہے۔ یہ ڈرامہ دکنی زبان میں ہے جو ہفت روزہ نقوش میں شائع ہو چکا ہے۔[3] ۔ ڈراموں سے دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے شاعری میں بھی ڈرامائی عنصر کو برقرار رکھا۔ ان کی نظمیں ساس بہو، پہلی تاریخ، پہلی جھگی، شاعر کی بیوی اس کی کامیاب مثالیں ہیں۔ اول الذکر دونوں نظموں کو اکثر تعلیمی اداروں میں اسٹیج کیا جاتا ہے۔

افسانے : سلیمان خطیب نے افسانے بہت کم لکھے، جو بھی افسانے دستیاب ہیں وہ ان کی ابتدائی تحریروں کا نمونہ ہیں۔ ان کے ایک افسانے "پنگھٹ" کا موضوع خطیب صاحب کے الفاظ میں "جوان پتری کو بڈھے کھوسٹ کے پلو باندھنا" ہے۔ بے جوڑ شادی کا انجام یہ ہوا کہ پرشانت (ہیرو) کو گولی ماردی جاتی ہے اور لیلا (ہیروئن) خودکشی پر مجبور ہوتی ہے۔ اس افسانے کو ڈرامے کی شکل میں بھی پیش کیا گیا ہے۔[4]

دوسرا افسانہ ہم سفر ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔ یہ دو دلوں کے بچھڑنے کا قصہ ہے۔ یہ افسانہ روزنامچے کی شکل میں ہے، اس میں محبت میں ناکامی کے باعث مرد کی پشیمانی اور اس کی نفسیاتی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک اور افسانہ "سانپ کا بچہ" ذات پات کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ یہ افسانے اور ڈرامے ان کی تحریروں کے اولین نمونے ہیں۔ انکی تحریر کے اصل جوہر ہمیں ان کے مضامین، انشائیوں اور مکتوبات میں نظر آتے ہیں۔

مضامین : سلیمان خطیب نے میری خواہش پر دو مضامین سپرد قلم کیے۔ پہلا مضمون "آپ بھی عجیب آدمی ہیں" گلبرگہ اسٹوڈینٹس کالج حیدرآباد کے سالانہ ترجمان "انسان" کے لیے تحریر فرمایا۔ دوسرا مضمون

شور عابدی مرحوم کے شعری مجموعے "خم کاکل" کی اشاعت کے موقع پر بعنوان "گلبرگہ کلب کا ایک شاعر" لکھا۔

"انسان" میں شامل "آپ بھی عجیب آدمی ہیں" پر لطف مضمون ہے۔ معاشرہ میں جھوٹ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اصول پسند اور سچ بولنے والوں کو زندگی کے ہر مرحلے میں شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ مضمون نگار نے دلچسپ پیرائے میں مختلف مثالوں کے ذریعے "الحق مرّ" (سچ کڑوا ہوتا ہے) اور "الکذب حلو" (جھوٹ میٹھا ہوتا ہے) کی وضاحت کی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ صداقت کے پیکر اور عدم تشدد کے دیوتا کو سچ بولنے کی قیمت جان دے کر ادا کرنا پڑی۔ اس خصوص میں خطیب صاحب رقمطراز ہیں۔ "۱۹۴۸ء کی ایک شام کو مادر وطن کے ایک سپوت نے اتنا شدید سچ پسند نہیں فرمایا فوراً اٹھا اور اٹھ کر انتہائی متانت سے تڑ تڑ تڑ تین گولیاں سچائی کے پیکر کے سینے میں ماردیں۔ سچائی مسکرائی، پرنام کیا اور ہمیشہ کے لیے بیکنٹھ باشی ہوگئی۔ سچائی تو مرگئی اب اپنے گھر میں سچائی کہاں ہے؟ پھر آپ سچ بولتے ہیں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ سچائی کو یونان میں زہر کا پیالہ دیا گیا۔ بیت المقدس میں سولی دی گئی۔ کربلا کے میدان میں شہید کیا گیا اور سچائی دیوانی یہ کہتی رہی کہ:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا ۵

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہے کہ سلیمان خطیب کی تحریر میں طنز کی کاٹ غضب کی ہے۔

"گلبرگہ کلب کا شاعر" سلیمان خطیب کا تحریر کردہ ایک عمدہ خاکہ ہے۔ شور عابدی اور سلیمان خطیب دونوں گلبرگہ کلب کے سرگرم رکن تھے۔ آپس میں بڑا یارانہ تھا۔ دیرینہ رفاقت کے باعث انھوں نے شور عابدی کی شخصیت کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ شور صاحب ملازمت کے سلسلہ میں بیدر میں تھے۔ خطیب ایک مشاعرہ پڑھنے بیدر آگئے تو ان سے ملاقات کا جو تاثر پیش کیا ہے اس کا انداز بیاں شگفتہ اور بے تکلفانہ ہے۔

"مدتوں بعد ایک دن شورؔ سے بیدر میں ملاقات ہوئی ہے۔ میکدہ بردوش تشریف لارہے ہیں۔" فرماتے ہیں، "میں گلبرگہ میں ہوں یا تم بیدر آئے ہو؟ بیدر اور گلبرگہ بغل گیر ہوتے ہیں۔ حضرت اکمل صاحب کی خانقاہ میں ہماری صدارت میں مشاعرہ ہے۔ شور تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملارہے ہیں۔ یہ تو شور کا خلوص ہے ورنہ خطیب کہاں اور کہاں شور!" ۶

خطیب صاحب کا ایک مضمون ''میری زندگانی اور دروغ بیانی'' بہ لحاظ اسلوب اہمیت کا حامل ہے۔ طنز، شگفتگی، شوخی اور سلاست سے متاثر کرتا ہے۔ زندگی میں جھوٹ اس قدر سرایت کر گیا ہے کہ اس کے بغیر زندگی کی گاڑی ہانکی نہیں جا سکتی۔

شوہر بیوی سے جھوٹ بولتا ہے، امیدوار رائے دہندوں کو جھوٹے وعدوں پر ٹرخاتا ہے۔ نام نہاد قلمکار، ادب میں اعتبار حاصل کرنے کے لیے نت نئے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ دروغ بیانی کا منظر خطیب صاحب کے الفاظ میں پیش ہے۔

''۲ بجے شب گھر واپس ہونے پر بیوی کے سوال پر شوہر نے یوں جواب دیا'' بابا ننگے شاہ کا وعظ سن رہا تھا۔ دس بارہ ہزار کا مجمع ہوگا، قیامت کا وعظ تھا۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ دستیاں بھیگ رہی تھیں، داڑھیاں بھیگ رہی تھیں۔ آنچل بھیگ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی رو رہے تھے۔ اس لیے میں بھی دو بجے تک روتا رہا''۔

سچ تو یہ ہے کہ رات دیر گئے دوستوں کی محفل میں رمی چلتی رہی اور وہ رم پیتا رہا۔ ے

''الیکشن کا موسم'' بھی ایک پر لطف مضمون ہے جو غیر مطبوعہ تھا۔ یہ مضمون حال میں سہ ماہی طنز و مزاح بنگلور میں شائع ہوا ہے۔ الیکشن کا موسم جب بھی آتا ہے، سیاسی جماعتوں کے امیدوار شناساؤں اور غیر شناساؤں کے گھروں کا طواف کرتے ہیں، بقول خطیب

> ''وہ رخ انور جو صرف ڈنر اور سرکاری تقریبوں کے موقع پر جلال و جمال کے کرشمے دکھاتا تھا ہر دروازے پر کاسہ گدا گری لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔''

الیکشن کے دنگل میں کیا ہوتا ہے کس طرح امیدوار اپنے مفاد کی خاطر امن میں خلل ڈالتے ہیں اور فرقہ پرستی کو ہوا دیتے ہیں اور غیر محسوب دولت لٹاتے ہیں۔ سلیمان خطیب اس خصوص میں رقمطراز ہیں۔

''الیکشن کا دنگل بڑا خوبصورت ہوتا ہے۔ حسین سے حسین مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ کبھی رائی اور پہاڑ کا مقابلہ ہوتا ہے تو کبھی برابری کا، سچائی اور جھوٹ دست و گریباں ہو جاتے ہیں۔ طرفین کے کارکن باہم متصادم ہوتے ہیں۔ دولت کی ریل پیل ہوتی ہے۔ آپس میں زبان چلتی ہے، لٹھ چلتی ہے، جوتی چلتی ہے، گھونسا بازی ہوتی ہے، بعض اشرار دانستہ فرقہ پرستی کو ہوا دیتے ہیں۔ مسجد و مندر، دیر و حرم، کعبہ و کلیسا کو الجھا

کر اپنا معاملہ سلجھالیتے ہیں۔ 9

''چند یادگار مشاعرے'' مشاعروں کی ایک روئیداد ہے۔ جس میں سلیمان خطیب نے شرکت کی تھی۔ ایک دلچسپ رپوتاژ ہے۔ مشاعروں کی روئیداد بیان کرتے ہوئے سلیمان خطیب نے انجمن خیرالاسلام ممبئی کے ایک مشاعرہ کا احوال بیان کیا ہے۔ جس میں ماہنامہ تجلی کے ایڈیٹر حضرت عامر عثمانی بھی شریک تھے۔ جنہوں نے شعر سناتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔ خطیب صاحب نے اس منظر کی اس طرح عکاسی کی ہے۔

''حضرت گلزار دہلوی نے حضرت عامر عثمانی سے کلام سنانے کی خواہش کی مولانا نے یہ شعر پڑھا:

ایک ریت کی دیوار تھی دھیرے سے گری ہے

احساس کی دلہیز پہ کوئی لاش پڑی ہے

اور ختم ہو گئے۔ مشاعرہ برخواست ہوا۔ میں نے آج تک کسی شاعر کو اسٹیج پر مرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مولانا سفید چادر میں محوخواب تھے۔ وہ عمر بھر ماہنامہ تجلی مرتب کرتے رہے۔ ان کے چہرے پر وہی نور تھا گویا سورج غروب ہونے کے بعد شفق پھیل گئی ہے۔'' 10

مندرجہ بالا سطور اس امر کی غمازی کر رہے ہیں کہ سلیمان خطیب کو ماحول کی تصویر کشی میں کمال حاصل تھا۔

سلیمان خطیب کے تحریر کردہ دیگر مضامین ''کیا خوب زمانہ ہے'' (مزاح) ''ان بچوں کو مار دو'' ''ٹیبل ٹاک'' (ترقی پسند شاعروں کے مابین مکالمہ) ''لوک گیت اور ثقافتی پہلو''، ''پھر نئی کونپل پھوٹی'' قابل ذکر ہیں۔ ''پھر نئی کونپل پھوٹی'' میں حمید الماس کی شاعری پر یوں رائے زنی کی ہے۔ حمید الماس کی شاعری میں شکستہ شیشہ کی دھار، مہکتے بدن کی گرمی، عود اور لوبان میں بسائی ہوئی زلفوں کی دھیمی دھیمی خوشبو ہے۔ ایک خوشبو جو داغ دل بنکر شاعری میں شامل ہوگئی۔ 11

انشائیے: سلیمان خطیب ایک اچھے انشائیہ نگار بھی تھے، انکے تحریر کردہ انشائیوں میں ''کتاب پڑھنے کی تکنیک'' ''ماضی پر ایک نظر، آنکھیں، خیریت اور حرام زادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں آنکھیں، خیریت اور حرام زادی غیر مطبوعہ انشائیے ہیں۔ انشائیہ ''کتاب پڑھنے کی تکنیک اور'' ماضی پر ایک نظر'' شائع ہو چکے ہیں۔

"کتاب پڑھنے کی تکنیک" ایک عمدہ انشائیہ ہے، جس میں نام نہاد عاشقان کتب و مطالعہ کنندگان اپنی جیب پر بار ڈالے بغیر نت نئی ترکیبوں و تکنیکوں سے راستہ چلتے ہوئے، ٹرین کے سفر میں، بک اسٹال پر کھڑے کھڑے یا اپنے گھر کے قرب و جوار میں کتب و رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان مانگے تانگے کی کتابیں پڑھنے والوں میں طرح طرح کے لوگ ہیں۔ ایسے ہی چند اشخاص کا خطیب صاحب نے خاکہ اڑایا ہے۔

"آپ کبھی کوئی خوبصورت کتاب لے کر گھر سے باہر نہ نکلیے آپ اپنی طبیعت سے مجبور ہیں۔ لہٰذا ایک قدیم کرم فرما جو سائیکل پر طوفان کی طرح گزر رہے ہوں گے آپ کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر فوراً سائیکل سے اتر پڑیں گے۔ کیا کوئی نئی کتاب ہے خطیب صاحب؟" "جی ہاں" ذرا دیکھ لوں تو اور پھر وہ آپ کو سڑک پر آدھے گھنٹہ تک دھوپ میں تپا دیں گے اگر یہ صاحب نہیں ملے تو دوسرے دوست دکان سے اٹھ کر آئیں گے، فرمائیں گے رسالہ بڑا شاندار معلوم ہو رہا ہے۔ ذرا لکھنے والوں کو دیکھ لوں کون ہیں بس ایک نظر تکلیف تو ہوگی۔ ان کی تکلیف کا سلسلہ بھی پندرہ بیس منٹ سے کم نہیں ہوگا۔ خواہ آپ دواخانہ جاتے ہوں یا ریلوے اسٹیشن یا آفس وہ آپ کو نہیں چھوڑیں گے۔ اتنے میں دوسرے بے تکلف قسم کے دوست کہیں سے نکل پڑیں گے پیچھے سے ایک زور کا گھونسا کمر میں رسید کریں گے۔ پھر فرمائیں گے "سڑک پر کیا کر رہے ہو"، یہ دوست بھی وہی عمل دہرائیں گے یعنی کتاب کا از سر نو مطالعہ، اگر آپ عجلت کریں تو کہہ دیں گے، "ہاں میں جانتا ہوں تم بڑے کام والے ہو شام میں آ کر لے جانا کتاب محفوظ رہے گی۔" [12]

خطیب صاحب نے اس انشائیہ میں کتب و رسائل مانگ کر پڑھنے والوں کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ انشائیہ قدرت بیان کے ساتھ بات میں بات پیدا کرنے کے وصف سے معمور ہے۔

انشائیہ "آنکھیں" میں آنکھوں کی مختلف اقسام اور ان کی کرشمہ سازیوں کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ انشائیہ نگار نے نئی اصطلاحات گھڑی ہیں جیسے واحد النور، انجمن عین الواحدین، معرکہ سر کرنے والی آنکھیں، پس پردہ آنکھیں، لال پیلی آنکھیں، مخمور غلافی آنکھیں وغیرہ انشائیہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

جس کو تیری آنکھوں سے سروکار رہے گا
بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا

آنکھیں دو ہوتی ہیں لیکن بنانے والے دو سے چار بھی بناتے ہیں۔ جب آنکھیں چار ہوتی ہیں تو دو دل ایک ہو جاتے ہیں اور پھر کسی چنبیلی کے منڈوے تلے گانے لگتے ہیں۔ ع

دو نگاہیں تیری دو نگاہیں میری مل کر چار ہوئے [۱۳]

اس انشائیہ میں قوت متخیلہ کی کارفرمائی عروج پر ہے۔

''ماضی پر ایک نظر'' بھی لوازمات انشائیہ سے پر ہے، جو خاص رو اور خاص طرز سے لکھا گیا ہے۔ سال ۱۹۷۴ء کی تکمیل پر انشائیہ نگار مختلف مسائل سے گزرتے ہوئے فیشن کی بدلتی قدروں پر اظہار خیال کرتا ہے اور ۱۹۷۴ء سے یوں مخاطب ہے۔

> ''مسٹر ۱۹۷۴ء آپ نے میرے بچے نور نظر بلکہ لخت جگر کو فٹ پاتھ سے نکال کر بیل باٹم (Bell Bottom) بیرل باٹم (Barrel Bottom) اور ایلی فینٹ باٹم (Elephant Bottom) میں اتار دیا یعنی اس کا پاؤں ہرن کا پاؤں تھا آپ نے ہاتھی کا پاؤں بنا دیا بلکہ فیل پا کر دیا جو ایک قسم کی خطرناک بیماری ہے جس میں پاؤں بھاری ہوتا ہے، خواہ عورت کا ہو یا مرد کا۔ میرے بچے کے بش شرٹ پر اخبار کے نمونے چھاپ دیے اور فلم اسٹار کی تصاویر پرنٹ کر دیے اور بش شرٹ کو ناف سے بڑھا کر گھٹنے تک پہنچا دیا کمر تنگ کر دی اب وہ بوڑھی عورتوں کی کرتی یا فراک معلوم ہوتا ہے۔'' [۱۴]

اس مختصر سے اقتباس میں لطیف مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کا عنصر بھی غالب ہے۔

''خیریت'' غیر مطبوعہ انشائیہ ہے لوگ وقت نا ساعت، موقع بے موقع تکیہ کلام کی طرح لفظ ''خیریت'' سے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے رہتے ہیں جہاں کہیں ہم اپنے شناساؤں سے ملتے ہیں۔ اسی ایک لفظ خیریت سے مخاطب کی عافیت جاننا چاہتے ہیں۔ مخاطب بھی صورتحال چاہے کتنی ہی سنگین ہو جواباً لفظ خیریت ہی کا سہارا لیتا ہے۔ چاہے آپ بیمار ہوں یا آپ کے گھرانے کے افراد، جواباً خیریت ہی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس مضمون پر سلیمان خطیب نے مثالوں کے ذریعہ موقع بے موقع خیریت دریافت کرنے کی روایت پر سخت نشتر زنی کی ہے۔ ایک اور غیر مطبوعہ انشائیہ ''حرام زادی'' میں حیدرآباد کے

باغ عام کے پھولوں، پودوں، سبزہ زاروں، فواروں، نرسری اور کیا ناز (Cannas) کے تختوں کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اس انشائیہ میں سقوطِ حیدرآباد سے پہلے کی ثقافت اور معاشرتی آداب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوابوں یا اس عہد کے افسروں کے رکھ رکھاؤ اور تہذیب کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ اس دور میں گھروں کی ملازمائیں بھی اس طرح رہتی تھیں کہ ان پر گھر کے افراد کا گمان ہوتا تھا۔ اس انشائیہ میں باغ عام میں واقع داروغہ کے بنگلہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جہاں کی ایک شعلہ بدن ملازمہ وضع وقطع ولباس میں خاتون خانہ معلوم ہو رہی تھی۔ مگر جب درون خانہ سے عتاب نازل ہوا کہ ''کہاں مرگئی حرام زادی'' تو یہ حقیقت واشگاف ہوئی کہ وہ شعلہ بدن، خاتون خانہ نہیں ملازمہ ''نوبہار'' تھی۔

''سلیمان خطیب افسانوں اور ڈراموں میں رنگ نہیں جما سکے ان کی تحریر کے اصلی جوہر انشائیوں اور خطوط میں نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر شمیم ثریا (صاحبزادی سلیمان خطیب) نے اپنے تحقیقی مقالے ''سلیمان خطیب۔ شخصیت اور فن'' میں اعتراف کرتی ہیں ''جہاں تک سلیمان خطیب کے افسانوں کے اسلوب کا تعلق ہے وہ ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتے، افسانے لکھنے کے لیے جس سنجیدگی، استقلال اور متانت کی ضرورت ہوتی ہے وہ سلیمان خطیب میں مفقود تھی۔ ان کی طبیعت کی شگفتگی، بذلہ سنجی، بے باکی اور آزادروی انھیں ایک کمزور افسانہ نگار بناتی ہے۔'' [15]

خطوط: سلیمان خطیب نے اپنے دوستوں، مداحوں اور رشتہ داروں کو جو خطوط لکھے ہیں وہ بے تکلفی، اپنائیت، شگفتگی اور بذلہ سنجی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے خطوط سے قاری ''نصف ملاقات'' کے تاثر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ سلیمان خطیب کے مکتوب الیہ میں مبارز الدین رفعت، نجم الثاقب شحنہ، کاوش بدری، مجتبیٰ حسین، آمنہ ابوالحسن، مسز ابراہیم جلیس، ڈاکٹر طیب انصاری، محمود عشقی، عظمت عبدالقیوم، حافظ محمد جیلانی، ملنسار اطہر احمد، عظمت بھلاواں وغیرہ کے علاوہ نصف بہتر، محترمہ راشدہ ثریا اور فرزندان و دختران شامل ہیں۔ سلیمان خطیب کے خطوط میں سیاحتی مقامات کی منظر نگاری کے علاوہ انکی نجی زندگی اور مسائل حیات بھی در آتے ہیں۔ بعض خطوط ادبی تنقید کا عمدہ نمونہ ہیں۔ سرسید اور حالی کے خطوط میں سنجیدگی اور متانت پائی جاتی ہے جبکہ سلیمان خطیب کے خطوط میں موجود شگفتگی، شوخی اور بے باکی انہیں غالب کے قریب کرتی ہے۔

مئی ۱۹۶۳ء کے اواخر میں خطیب صاحب مشاعرے کے لیے مدراس میں تھے۔ مدراس سے انھوں نے اپنی صاحبزادیوں تسنیم وشمیم کے نام خط لکھتے ہوئے مدراس اور اس کے ساحل کے بارے میں درج ذیل تفصیلات فراہم کیں۔

"مدراس کیا ہے؟ نیلگوں سمندر کے کنارے ایک سفید براق سا فرشتہ پر کھولے ہوئے کھڑا ہے۔ اس کا دلفریب ساحل دنیا کا دوسرے درجہ کا ساحل ہے۔ جہازوں کو اندر آنے کے لیے ایک مصنوعی نہر بنائی گئی ہے۔ جہاز کیا ہیں، چھوٹے چھوٹے محل ہیں۔ سمندر کا نظارہ بڑا ہی دل آویز ہوتا ہے۔ خصوصاً طلوع آفتاب کا منظر، سمندر کے کنارے شام میں ایک میلا سا نظر آتا ہے لوگ سمندر کے کنارے ریت پر کھڑے ہوجاتے ہیں اور شوریدہ موجیں قدموں کو اٹھ اٹھ کر چوم لیتی ہیں۔" [16]

دہلی اور کشمیر کے مشاعروں میں شرکت کے بعد بھی انھوں نے وہاں کے اہم مقامات کے بارے میں اپنے افراد خاندان کو خطوط لکھے۔

سلیمان خطیب کثیر العیال تھے اور ذرائع آمدنی محدود، اسی جز معاشی میں قلندرانہ زندگی بسر کی۔ ساجد صدیقی لکھنوی شفاعت بکڈپو، ناندیڑ کی جانب سے آخری ایام میں وی پی وصول ہونے پر جواب میں جو لکھا اس سے صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"پچیس روپے بارہ آنے دے کر وی پی کیا چھڑائی کہ جان چھڑائی، ۲۳ر تاریخ کو وی پی ملی، مہینے کے آخری دن رمضان کے ہم شکل ہوتے ہیں۔ گھر میں اٹھتے بیٹھتے اللہ اللہ رہتا ہے۔ چہرے پر محرم کی اداسیاں رہتی ہیں ایسے میں والا جناب کی نوازش بے کراں، خدا یاد آ گیا۔ مرتے کو مارے شاہ مدار، حضور کا چہرہ آنکھوں میں پھر گیا۔ صدق دل سے دعائیں دیں۔" [17]

مندرجہ بالا تحریر بے ساختگی اور سلاست کا عمدہ نمونہ ہے۔ روزمرہ، محاورے اور ضرب الامثال کے استعمال نے تحریر کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ سلیمان خطیب کی مکتوب نگاری کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ عمدہ

تنقیدی بصیرت کے حامل تھے۔ انھوں نے اپنے بعض خطوط میں ادبی تنقید کا حق ادا کیا ہے، کاوش بدری کے نام اپنے ایک مکتوب میں انکی طویل نظم ''کاویم'' پر اس طرح تبصرہ کیا:

''کاویم'' خود کلامی، خوررسوزی اور خودسوزی کی پہلی کتاب ہے جسمیں آہ بھی ہے، واہ بھی، کوہ بھی ہے کاہ بھی (کاہ اس لئے کہ بعض مقامات پر بلاوجہ نظم طویل ہوگئی ہے) محراب علم وادب میں ایک نیا دماغ ہے تاک تازہ سے چھلکتا ہوا نیا ایاغ ہے۔ شب دیجور میں ایک روشن چراغ ہے۔ دیکھیں کتنے تشنہ لب فیضاب ہوتے ہیں۔ کتنی آندھیاں اس کو بجھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس قدر پاکیزہ، طویل، بلند وبالا، ارفع و اعلیٰ نظم ایک زمانے کے بعد نظر سے گزری۔ نو آغاز غنچوں کی طرح شگفتہ الفاظ کا انتخاب، مسائل کی گہرائی اور گیرائی لاجواب ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کریں۔ ۱۸

نجم الثاقب شحنہ مدیر گجر نے سلیمان خطیب سے گجر کے بارے میں رائے مانگی تھی۔ خطیب صاحب گجر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''گجر کی ترتیب وتبویب آفتاب و ماہتاب ہے، ڈرتا ہوں کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کی تخلیقات کی حیثیت اس نو بہ نو تازہ بہ تازہ گجرے میں باسی پھول کی سی ہے۔ گو کلام کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن مطبوعہ چیزوں سے رسالے کا وزن گر جاتا ہے۔ لکھائی چھپائی پر آپ نے کوئی توجہ نہیں دی۔ سچ مانیے دو چار صفحات پڑھتا ہوں تو آنکھ میں پانی اتر آتا ہے۔ لکھنے والوں میں خاص تنوع ہے متقدمین اور متاخرین بیک صف شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں۔ یوں میں سب ہی سے گزر گیا لیکن شاذ تمکنت سے گزر نہ سکا۔ شاذ تمکنت میں چونکا دینے والی بات ہے۔ نیا تجربہ ہے، تجسس ہے، تلاش ہے، کشمکش ہے اور انچ ہے۔ ایک بات کہوں، کان ادھر لائیے۔ یہ حیدرآباد کا مستقبل ہے۔''

شاذ کی نظم ''میرا فن میری زندگی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''شاذ کی زبان و بیان میں بڑا الجھاؤ ہے وہ تحیر خیز پیچیدہ تراکیب سے قاری کے ذہن کو سلجھنے اور سمجھنے سے زیادہ الجھنے اور بھٹکنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ وہ خط مستقیم سے زیادہ خط منحنی کے گرد گھومنے میں تلذذ حاصل کرتے ہیں جس سے فضائے شعر و سخن میں ایک قسم کی نامانوسیت، اجنبیت، بیگانگی اور حبس پیدا ہو جاتا ہے۔ دم گھٹنے لگتا ہے اور قاری ایک دم بھاگ نکلتا ہے۔'' ۲۰

پس سلیمان خطیب نے جہاں دکنی شاعری میں اپنے ان مٹ نقوش چھوڑے وہیں وہ اپنی نثر کی وجہ سے بھی ادب میں یاد رکھے جائیں گے۔

●●

(اگست 2013ء)

ماخذ و مراجع:

۱: ''سلیمان خطیب۔ شخصیت اور فن'' ڈاکٹر شمیم ثریا، تحقیقی مقالہ، ستمبر ۱۹۹۲ء

۲: ''سلیمان خطیب'' مجتبیٰ حسین (خاکہ)، روزنامہ سیاست حیدرآباد، ۲۴ر جنوری ۱۹۸۲ء

۳: ''پانچواں رسم'' سلیمان خطیب ہفت روزہ، نقوش، ناندیڑ، ۱۶ تا ۲۴ر جنوری ۱۹۸۲ء

۴: ''پنگھٹ'' سلیمان خطیب، ماہنامہ سب رس، حیدرآباد، جون ۱۹۳۹ء

۵: ''آپ بھی عجیب آدمی ہیں'' سلیمان خطیب، سالنامہ ''انسان'' گلبرگہ اسٹوڈنٹس کامیج،
حیدرآباد، فروری ۱۹۵۴ء، ص ۷۱

۶: ''گلبرگہ کلب کا ایک شاعر'' سلیمان خطیب، خم کا کل (شور عابدی) جنوری ۱۹۷۵ء، ص ۱۱

۷: میری زندگانی اور دروغ بیانی، سلیمان خطیب، جامِ حیات، انجمن حیاتِ نو، شاہ پور، ۱۹۷۴ء

۹،۱۰: ''الیکشن کا موسم'' سلیمان خطیب، سہ ماہی طنز و مزاح بنگلور، (سلیمان خطیب نمبر)
جنوری تا مارچ ۲۰۱۲ء، ص ۷۰

۱۱: ''چند یادگار مشاعرے'' سلیمان خطیب، سالنامہ زاویے، ۱۹۷۶ء
(ترجمان اردو اکاڈمی گلبرگہ)، ص ۵۹

۱۲ : ''پھر نئی کونپل پھوٹی'' سلیمان خطیب، ''سلیمان خطیب۔ شخصیت اور فن''
ڈاکٹر شمیم ثریا، تحقیقی مقالہ، ستمبر ۱۹۹۲ء
۱۳ : ''کتاب پڑھنے کی تکنیک'' سلیمان خطیب، ماہنامہ صبا، حیدرآباد، ۱۹۵۶ء
۱۴ : ''آنکھیں'' (غیر مطبوعہ) سلیمان خطیب، ''سلیمان خطیب۔ شخصیت اور فن''
ڈاکٹر شمیم ثریا، تحقیقی مقالہ، ستمبر ۱۹۹۲ء
۱۵ : ''ماضی پر ایک نظر'' سلیمان خطیب، ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد، ڈسمبر ۱۹۷۵ء، ص ۶۸
۱۶ : سلیمان خطیب۔ شخصیت اور فن'' ڈاکٹر شمیم ثریا، تحقیقی مقالہ، ستمبر ۱۹۹۲ء، ص ۳۰۰
۱۷ : مکتوب بنام تسنیم و شمیم (دختران خطیب) ''سلیمان خطیب۔ شخصیت اور فن'' ڈاکٹر شمیم ثریا،
تحقیقی مقالہ، ستمبر ۱۹۹۲ء، ص ۳۸۴
۱۸ : مکتوب بنام ساجد صدیقی، شفاعت بکڈپو، نانڈیڑ، ''سلیمان خطیب۔ شخصیت اور فن''
ڈاکٹر شمیم ثریا، تحقیقی مقالہ، ستمبر ۱۹۹۲ء، ص ۷۷۔۲۷۶
۱۹ : ''سلیمان خطیب۔ شخصیت اور فن'' ڈاکٹر شمیم ثریا، تحقیقی مقالہ، ستمبر ۱۹۹۲ء، ص ۳۲۱
۲۰ : ''سلیمان خطیب۔ شخصیت اور فن'' ڈاکٹر شمیم ثریا، تحقیقی مقالہ، ستمبر ۱۹۹۲ء، ص ۳۰۲، ۳۰۳۔

●●

محبؔ کوثر : عصری احساس کا شاعر

محبؔ کوثر کو اپنے عہد کے کہنہ مشق و ممتاز شعرا پنڈت دامودر پنت ذکی ٹھاکر اور ڈاکٹر علی احمد جلیلی سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔ اُسی کا اثر ہے کہ انھیں غزل گوئی میں استناد کا درجہ حاصل ہے۔ ۱۹۵۶ء سے شعر کہہ رہے ہیں، ان کا پہلا شعری مجموعہ ایاغ تازہ ۱۹۸۹ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ دوسرا شعری مجموعہ ''سود و زیاں'' ۱۹۹۷ء میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ اصناف شعر میں صرف غزل ہی محبؔ کوثر کی فکر کا موضوع ہے ویسے انھوں نے قطعات کے علاوہ حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی اشعار بھی کہے ہیں۔ انھیں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے اولین منظوم سوانح نگار ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ محبؔ کوثر نے جاپانی صنف شعر ہائیکو میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل ہی ان کا خاص میدان ہے۔ مجموعی طور پر کسی تحریک یا رجحان سے کلیتاً متاثر نہیں ہیں لیکن ان کی شاعری کلاسکیت کے علاوہ ترقی پسند اور جدید رجحانات سے عبارت ہے۔ ان کی غزلوں میں لب و رخسار کی چاندنی سے زیادہ جہادِ زندگی کی تمازت نمایاں ہے۔ محبؔ کوثر کی شاعری کو ہم ہوسنا کی سے بھی معریٰ قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے حدیث دل کے بیاں کرنے میں بھی بڑی احتیاط روا رکھی ہے۔ خود ان ہی کے الفاظ میں:

کسی کا نام بھی لینے سے ڈرتا ہوں زمانے میں
بہت محتاط رہتا ہوں حدیث دل سنانے میں

ذیل کے اشعار بھی محولہ بالا ادعا کی تصدیق کرتے ہیں:

دل میں انجان سی یادوں کے دیے روشن ہیں
وہ جو مل جائیں تو میں نام و نسب پوچھوں گا

زندگی وقت کی رفتار سے آگے ہے بہت
بات پازیب کی جھنکار سے آگے نہ بڑھی

محبؔ کوثر اردو شعرا میں میر اور جوش کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

میر و غالب ہی کا فیضان ہے کہ ان کی شاعری سلاست و روانی، تغزل کی چاشنی اور سادگی و پرکاری کی عمدہ مثال ہے۔ ان کے کلام میں خطابت کا عنصر بھی نمایاں ہے جو جوش کی دین ہے خود اعترافی ملاحظہ ہو:

غالب و میر و جوش سے اکتساب کر
کوثر غزل میں شوکت اردو سمیٹ لے

طبقاتی کشمکش میں شاعر کی ہمدردیاں مظلوم و کچلے ہوئے طبقے کے ساتھ ہیں جس کی توثیق ذیل کے اشعار سے کی جاسکتی ہے:

تمہارے ساتھ تو دنیا ہے زر پرستوں کی ہمارے ساتھ ہیں خانہ خراب جتنے ہیں
جب تک وہ کسی کام میں مخلص نہیں ہوتا مزدور کے چہرے پہ پسینہ نہیں آتا
مہر و وفا خلوص پھٹے پیرہن میں ڈھونڈ انسانیت کو صرف دوشالوں میں دیکھ مت

محبؔ کوثر نے جہاں ترقی پسند ہونے کا ثبوت دیا ہے وہیں جدت تنوع اور سحر طرازی سے کام لے کر ترسیل کے نئے پیکر بھی تراشے ہیں۔ ذیل کے اشعار نہ صرف عصری احساس سے مملو ہیں بلکہ نئے لب و لہجے کے غماز بھی:

صدیوں کی عنایت ہے یہ پیاس درختوں کی شبنم کے برسنے سے سیراب نہیں ہوں گے
دن کے ہنگاموں سے نالاں ڈوبتا خورشید بھی اک سلگتی شام کی تنہائیاں دے جائے گا
کہتا ہے کون درد کے آنسو سمیٹ لے آنکھوں میں انتظار کے جگنو سمیٹ لے
پھول سے جسم پہ زخموں کی قبا کیسی ہے وقت کی دھوپ سے احساس کے پر جلتے ہیں
مہر و وفا خلوص نصابوں میں قید ہے انسا نیت تو صرف کتابوں میں قید ہے
میرے بہتے ہوئے آنسو کی قیمت کچھ نہیں لیکن یہ قطرہ پھیل جائے تو سمندر ڈوب جائے گا

محبؔ کوثر نے زندگی کی دھوپ چھاؤں سے گزر کر مسکرانا سیکھا ہے۔ وہ قطعاً زندگی کی تلخیوں سے مایوس نظر نہیں آتے۔ ہر دم مصائب پر قابو پانے کا عزم لیے رواں دواں ہیں۔ غم دوراں نے ان کی ذہنی کشادگی اور دامن فکر کو وسیع کر دیا ہے۔ کہا ہے:

غم کا احساس اگر حد سے زیادہ ہو گا
دامن فکر و غزل اور کشادہ ہو گا

تمام عمر حوادث نے نغمہ ریزی کی
تمام عمر نہ ٹوٹا وہ ساتھ کیسا تھا
جھانکتی ہے مایوسی ذہن کے دریچوں سے
سوچ کے مکانوں کی کھڑکیاں بدل ڈالو
مسلسل جستجو سے جب کہ پہنچے ہیں بلندی تک
فرازِ دار سے ہم کو اتر جانا نہیں آتا

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ رواداری کے امین اور ظاہر سے زیادہ باطن کے پرستار نظر آتے ہیں۔ فرقہ واری آویزش سے انہیں بیر ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ بلا تخصیص مذہب وملت وفا کی راہ اختیار کی جائے۔ ذیل کے اشعار ان کے نظریہ مذہب کے خوشہ چیں ہیں:

خلوص و جذب سے خالی ہیں ہر جگہ سجدے | اب اہل ہیں دل کہاں اعتکاف مشکل ہے
فرقہ واری ذہنیت کا ایک جنونِ بے اماں | عہدِ حاضر کو فقط رسوائیاں دے جائے گا
جدا جدا ہی سہی غور و فکر کی راہیں | جو مشترک ہو وفا اختلاف مشکل ہے

ایک اور وصف جو محبؔ کوثر کو دیگر شعرا سے ممیز کرتا ہے وہ ترنم کے بغیر گرجدار آواز سے مشاعرہ پر چھا جانے کی ادا ہے۔ مشاعرہ میں اگر وہ موجود ہوں تو سامعین بے تابی سے منتظر کہ محبؔ کوثر کلام سنائیں۔ جب وہ مقطع پر پہنچتے ہیں: سب نے اپنے شعر سنائے | بات تو جب ہے کوثر بولے
تو سامعین بھی ان کے اس احساس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ محبؔ کوثر دور حاضر کی غزل اور اس کے مستقبل کے بارے میں تشویش کا اظہار کرتے ہوئے سوال کناں ہیں:

سود و زیاں کی زد پہ ہے اس دور کی غزل
بازارِ فن سے کیا سبھی اہل ہنر گئے

بلاشبہ گیسوئے غزل سنوارنے کے لیے ہنوز اہل ہنر باقی ہیں جن میں محبؔ کوثر کو بھی امتیاز حاصل ہے۔

●●

(اگست 2013ء)

امجد علی فیض : بحیثیت خاکہ نگار اور مبصر

امجد علی فیض، پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھے مگر فطری ذوقِ ادب اور کتب ورسائل کے مطالعہ نے انھیں ادیب کا منصب بخشا۔ انھوں نے اپنے لیے طنز و مزاح کی صنف کا انتخاب کیا اور اپنے فکاہیہ مضامین کے ذریعے خوش ذوقی و خوش مزاجی کو فروغ دیا۔ اُن کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "جستہ برجستہ" 2004 میں شائع ہو کر مقبولِ عام ہو چکا ہے۔ اُن کے ان مضامین سے یہ تاثر اُبھر رہا تھا کہ وہ مستقبل قریب میں اپنے فن میں یکتائی و کمال حاصل کریں گے مگر عمر نے وفا نہ کی۔ "جستہ برجستہ" کی اشاعت کے ایک سال بعد ہی ابھرتا ہوا یہ فن کار ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا۔ مرحوم کے احباب جناب صادق کرمانی اور ڈاکٹر غضنفر اقبال مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے مرحوم دوست کے خاکوں اور تبصروں کو نہ صرف یک جا کیا بلکہ اشاعت کے ذریعے اُن کی یاد کو زندہ جاوید کر دیا۔

اُردو ادب کی اصناف میں خاکہ نگاری کو قبولیت عام حاصل ہے۔ یوں تو انیسویں صدی کے اواخر میں اس صنف کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں مگر خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ہوتا ہے اس سے قبل کا دور، سوانح اور تذکروں کا دور ہے۔ تذکرہ نگاروں میں محمد حسین آزاد پہلے شخص ہیں جنھوں نے تذکروں میں خاکہ لکھنے کی شعوری کوشش کی۔ آبِ حیات میں جابجا اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اسی طرح حالی کی تصنیف کردہ سوانح "یادگارِ غالب" بھی خاکہ نگاری کے اوصاف سے خالی نہیں۔ حالی نے غیر جانبداری سے غالب کے محاسن و معائب کا جائزہ لیا ہے۔ ۱۹۲۷ میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" لکھی تو اُسے اُردو کا پہلا خاکہ قرار دیا گیا۔ آبِ حیات کے دیباچہ میں آزاد نے وضاحت کی کہ "بزرگوں کے حالات، جہاں تک ممکن ہو، اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، پھرتی چلتی تصویریں سامنے آ کھڑی ہوں" محمد حسین آزاد کی یہ خواہش آج بھی خاکہ نگاری کی بنیادی شرط ہے۔ خاکہ میں کسی بھی شخصیت کو اسی طرح پیش کیا جاتا ہے جیسے وہ ہوتی ہے۔ کامیاب خاکوں کے لیے ضروری ہے کہ قلم کار کی قوتِ مشاہدہ تیز ہو اور وہ اپنے مراسم و واقفیت کے ذریعے موضوع تک رسائی حاصل

کرے۔ خاکہ نگار، موضوع کی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر اس کی خوبیوں و کوتاہیوں کی بلا جھجک نشان دہی کرے۔ خاکے میں شخصیت کی ہیئت کذائی، رہن سہن، نشست و برخاست، آداب، عادات و اطوار کی تفصیل بھی ملتی ہے۔

امجد علی فیض کے خاکوں و تبصروں کا مجموعہ ''خاک کے پردے سے'' پیش نظر ہے۔ جس میں سات خاکے، چار تبصرے اور ایک سفر سے متعلق مضمون شامل ہے۔ خاکہ نگاری میں امجد نے ذاتی مشاہدے شخصی روابط اور موضوع کے نفسیاتی تجزیے کو ملحوظ رکھا ہے۔ جہاں جہاں انھوں نے اس ہنر سے کام لیا ہے خاکوں میں جان پڑ گئی جہاں دست کشی اختیار کی تصویر میں رنگ اُبھر نہ سکا۔ ہم عمروں (وحید انجم، فاروق نشتر، منظور وقار) پر لکھے گئے اُن کے خاکے کامیاب ہیں۔ ''آدمی دھنک سا'' وحید انجم کا خاکہ دل چسپ اور اُن کی شخصیت کا عکاس ہے۔ ''منظور داخل وقار خارج'' ہم عصر مزاح نگار پر لکھا گیا خاکہ ہے۔ توقع تھی کہ امجد اپنی پر مزاح تحریر سے اپنے موضوع کا خاکہ اُڑائیں گے۔ مگر خاکے کا ایک تہائی حصہ منظور وقار کی زود نویسی کی نذر ہو گیا۔ خاکے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ موضوع خاکہ کے صرف ایک وصف کو زیادہ نمایاں روشن کریں، اس سے دیگر اوصاف کی حق تلفی ہوگی۔

''نشتر کہیں جسے'' صاحب خاکہ کے نام کے جزو سے کردار کو ابھارنے کی سعی مؤثر ہے۔ اس خاکے میں سراپا نگاری کے جوہر بھی کھلے ہیں۔ شخص کا عکس پوری طرح اُجاگر ہے ملاحظہ ہو

> ''سجے سنوارے بال، نکلتا ہوا قد، صحت مند جسم، رنگ سلونا، چہرہ تیکھا، رویہ ہمدردانہ، لہجہ خطیبانہ، پیرہن شریفانہ، مزاج ظریفانہ، ذہن فلسفیانہ پایا ہے۔ آنکھوں میں فکر و طمانیت کا ملا جلا احساس، چہرہ پر تراشی مونچھیں، فرنچ کٹ داڑھی، آنکھوں پر چوڑے عدسوں کی عینک، گردن کو دائیں جانب اُٹھائے ذہن نت نئی شرارتیں لیے اپنی دھن میں مگن، اطراف واکناف کے ماحول سے بے خبر، تیز مگر مضبوط قدم ڈال کر یوں چلتے ہیں جیسے دنیا والوں سے خفا ہو کر بن باس تشریف لے جا رہے ہوں''

دیگر اوصاف سے خاکے میں جو رنگ بھرا گیا ہے وہ بھی نمایاں ہے۔

سردار سلیم کا خاکہ جو انھوں نے کھینچا ہے وہ شخصی قرب کا پتہ نہیں دیتا۔ دور سے یا کسی قدر فاصلے سے اُن کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ تاہم اس سعی سے جو نقوش اُبھرے ہیں اُن سے موضوع کا تعارف ہو جاتا ہے ۔بقیہ خاکے بزرگوں پر لکھے گئے ہیں جن میں حرمت کا پاس ولحاظ ہے۔''کانچ کا گڈا'' (راہی قریشی) میں خاکہ نگار نے شخصیت کی رنگت اور سراپا کے لیے ایک واقعہ کا سہارا لیا ہے۔ دو پیراگراف پر مبنی واقعہ سے قاری کی معلومات میں اس قدر اضافہ ہوا کہ ''دھلے دھلائے، بجے سجائے، بانکے راہی صاحب کرسی پر بیٹھے نصابی مضمون پر گوہر فشاں ہیں۔''

''ڈاکٹر خالد سعید.....ایک نامکمل تصویر'' ایک تاثراتی خاکہ ہے۔ پڑھیے تو لگتا ہے یہ موضوع کی نامکمل تصویر نہیں ہے۔ یہ خاکہ ڈاکٹر صاحب کی سیاسی، ادبی وتہذیبی سرگرمیوں پر محیط ہے۔ خاکہ نگار نے صرف مداحی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک دو کمزوریوں کی جانب بھی توجہ مبذول کی ہے۔

''حمید سہروردی.....ادب کا یکا سو'' اس مجموعے کا سب سے خوبصورت خاکہ ہے۔ جو لوازم خاکہ پر بھی کھرا اُترتا ہے۔ ایک بات یہ محسوس ہوئی کہ خاکہ، موضوع کی زندگی کے کسی بھی کمزور پہلو سے عاری ہے ۔خاکہ کا ابتدائیہ وخاتمہ خاصے کی چیز ہے۔ زبان وبیاں کے لحاظ سے بھی یہ خاکہ دوسرے خاکوں پر سبقت رکھتا ہے۔ غالباً یہ آخری خاکہ ہے جو اُن کے قلم سے نمو پذیر ہوا۔ امید تھی کہ وہ مستقبل میں مزید اعلیٰ تخلیقی خاکوں کے ذریعے فنِ خاکہ نگاری کو جلا بخشیں گے، مگر عمر نے وفا نہ کی:

خدا بخشے عجب آزاد مرد تھا

خاکہ نگاری کے اس مجموعے میں کتب پر تبصرے بھی شامل ہیں اس سے اندازہ کرنا بعید از فہم نہیں ہے کہ امجد علی فیض کو نہ صرف کتابیں اور رسائل پڑھنے کا جنون تھا بلکہ وہ تبصرہ نگاری میں بھی درک رکھتے تھے۔ ''دیگر احوال یہ ہے کہ'' ایک دل چسپ تبصرہ ہے جس میں ایقان کے ''راہی قریشی نمبر'' کی اشاعت کا احوال دل نشین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے جو آنکھوں دیکھا حال کی یاد دلاتا ہے۔

''انیس تجھ کو نہ لگ جائے.....'' مصنف نے ڈاکٹر انیس صدیقی کی تحقیقی، عرق ریزی کا نتیجہ ''کرناٹک میں اُردو صحافت'' کے مشمولات کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ زبان معیاری اور انداز

بیان دلکش ہے نمونہ تحریر ملاحظہ ہو

''کتابوں کے اس انبار میں معیاری کتاب کی تلاش کنواں میں تلاش سوزن سے کم نہیں''

اس جملے سے فن تحقیق کے عمق کا پتہ لگایئے ''فن تحقیق ناخن سے کنواں کھودنا ہے چند جیالے ہی عشق کے امتحان میں پورے اُترتے ہیں''

''خدا جھوٹ ہرگز نہ بلوائے'' عظیم الدین عظیم کی مزاحیہ پیش کش ہے۔ عظیم الدین عظیم کے مزاح کو مبصر نے اس طرح خراج تحسین پیش کیا ہے

''اُن کا مزاح، مزاح لطیف کے زمرے میں آتا ہے۔ جو قاری کے چہرے پر مونالیزا سی مسکان سجا کر چپ چاپ چلا جاتا ہے''

''بہر کیف ...... ماشاء اللہ'' امتیازی حیثیت کی حامل مزاح نگار ڈاکٹر حلیمہ فردوس کی تصنیف بہر کیف پر غائبانہ تبصرہ ہے اور غالباً اپنی نوعیت کا پہلا تبصرہ بھی۔ مصنفہ کی جانب سے بھیجی گئی کتاب تبصرہ نگار کو وقت پر نہ مل سکی۔ جب انتظار کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو مبصر نے کتاب پڑھے بغیر تبصرہ سپرد قلم کیا۔ اس بارے میں اس کے سوائے کیا کہا جاسکتا ہے ''بہر کیف پر تبصرہ ماشاء اللہ''

کتاب کے آخر میں امجد علی فیض کا ایک مضمون ''دہلی کا ایک سفر.... مجتبیٰ حسین کے حوالے سے'' شامل کیا گیا ہے جو رواروی میں تحریر کردہ ہے۔ یہ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی خاکوں اور تبصروں سے مختلف ہے۔ دہلی کے اس سفر کی سرگزشت کا ماحصل یہ ہے کہ ''مجتبیٰ حسین زندہ دل آدمی ہیں'' اس میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ امجد علی فیض کے خاکوں اور تبصروں پر مشتمل کتاب ''خاک کے پردے سے'' ادب میں خوش گوار اضافے کا باعث ہوگی اور قارئین کے لیے یقیناً خوش ذوقی اور خوش وقتی کا سامان بھی مہیا کرے گی۔

●●

(2007ء)

مطالعے

شب رنگ نمو : خالد سعید

''شب رنگ نمو'' جدید شاعر خالد سعید کے احساس وفکر کا اولین نقش ہے۔ اس مجموعے پر یہ چند سطور میرے مطالعہ کی غماز ہیں نہ یہ تنقید ہے نہ محاکمہ۔ محاسبہ تو دور کی بات ہے، تجزیہ بھی نہیں۔ نقد ونظر ایک ہمہ گیر معیار کا تقاضا کرتی ہے۔ اس منصب کیلئے تو وہی شخص اہل ہے جو اپنی پشت پر درجن بھر کتابوں کا بار لیے خمیدہ، 'شب رنگ نمو' کی جانب دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ میں اس کار خیر کو اسی شخص کے سپرد کرتا ہوا بہ حیثیت قاری اپنے تاثرات پیش کر رہا ہوں۔

الطاف حسین حالی سے وارث علوی تک مختلف ناقدین کی جانب سے شعری صداقتوں کے مختلف پیمانے تراشے گئے ہیں، مگر ہر دور میں شاعر سے صرف قافیہ پیمائی کا نہیں بلکہ شعریت اور تہہ داری کا تقاضا کیا گیا۔ دور قدیم ہو کہ جدید، رومانی دور ہو کہ اصلاحی، ترقی پسندی کا غلبہ رہا ہو کہ وجودیت کا، ان ادوار میں اسی شاعری کو پنپنے کا موقع ملا جس نے ادعائیت، تشہیر اور انتہا پسندی سے دامن بچاتے ہوئے شعریت پر توجہ مرکوز کی۔ کسی بھی ادیب وشاعر کی تحریریں اس کے فکر وفن کا آئینہ ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر تخلیق کو سند واعتبار کا درجہ حاصل ہو جائے مگر جو تحریر سچی تخلیقی استعداد کا نتیجہ ہوتی ہے وہ ہر دور کے قارئین سے پسندیدگی کا جواز حاصل کرتی ہے۔ یہی وجہ ہیکہ میرؔ وغالبؔ کی شاعری پر عوام وخواص دونوں آج بھی سر دھنتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آج کی شاعری دور حاضر سے مطابقت رکھتی بھی ہے کہ نہیں؟ اس کے لیے ہمیں آج کے غالب ادبی رجحان جدیدیت پر نظر ڈالنی ہوگی۔ جدیدیت نے ترقی پسندی کی ادعائیت کے خلاف بروقت علم بغاوت بلند کیا۔ مگر جدید حسیت اور نئے تجربے کے نام سے ادب کو گنجلک و ناقابل فہم تحریروں کا مجموعہ بنا دیا۔ کیا جدید ادب کی ساری تحریریں گنجلک وناقابل فہم ہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو یہ صداقت آشکار ہو جاتی ہے کہ ادب بلا تخصیص عہد ونظریہ اپنی تخلیقی استعداد کے بل بوتے زندہ رہتا ہے۔ اس لیے کسی ادیب یا شاعر پر کوئی لیبل لگا کر اس کی تحسین وتنقیص ایک احمقانہ عمل ہے۔ آج یہ نقطہ نظر بھی وقعت کھو چکا ہے کہ بعض ادبا وشعرا کو قاری کی ضرورت نہیں وہ صرف اپنی تسکین کی خاطر لکھتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کے حامل فنکاروں کا وجود اگر اب

بھی کہیں ہو تو انھیں چاہیے کہ اپنے افکار عالیہ اور اذکار سے قرطاس ابیض کو سیاہ کرتے رہیں۔ کسی سامع و قاری کی تلاش میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع نہ کریں۔

'شب رنگ نمو' کا شاعر اپنے مجموعے میں تشنہ اور شکستہ دل ہی سہی مگر جری اور سرکش نظر آتا ہے۔ جہاں وہ فرد کی تنہائی، مایوسی اور اعصاب زدگی کے اظہار پر قادر ہے وہیں انسانی عظمت اور فرد و سماج کے باہمی ربط کا ترجمان بھی ہے۔ اس مجموعے میں شاعر نے زندگی کی چھوٹی موٹی حقیقتوں، مسرتوں، غموں، معصوم خواہشوں اور خوابوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ نئی زبان سے استفادہ کرتے ہوئے لفظیات کے برتنے میں سلیقہ کا ثبوت بھی دیا ہے۔ الفاظ کی پرکھ اور اس کا مناسب استعمال بھی تو خاصہ دشوار عمل ہے۔ بقول جاں نثار اختر:

ہر لفظ کو چھوتے ہوئے جو کانپ نہ جائے

برباد وہ الفاظ کی اوقات کرے ہے

خالد سعید نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور نظمیں بھی۔ نظموں کے مقابلے میں ان کی غزلیں زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ انھوں نے غزلوں میں ماضی سے اپنا رشتہ برقرار رکھا ہے اور کلاسیکی غزل کو اپنی حسیت میں جذب کرلیا ہے۔ ان کے پیش نظر جدید دور کے وہ شعرا ہیں جنھوں نے غزل کا احیا کیا اور اسے نئی بلندیوں پر پہنچایا ان میں ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، جاں نثار اختر، ظفر اقبال، شکیب جلالی اور بانی قابل ذکر ہیں۔ جدید دور کے بعض نمائندہ شعرا نے بھی ایسے اشعار کہے ہیں جو پھکڑپن اور ہزل کے ذیل میں آتے ہیں۔ سلمیٰ تصدق کہتی ہیں:

کس کو فرصت ہے بیٹھ کے ان کی یاد میں اپنی جان گنوائے

آ ج نئی شلوار سلا کر نیا مسافر آیا تھا

سلمیٰ تصدق کو چھوڑیے شاید انھیں کوئی نہیں جانتا۔ محمد علوی کہتے ہیں:

بتی بجھا کے ہیرو ہیروئن لپٹ گئے

قصہ بہت ہی پھر تو مزیدار ہو گیا

کمار پاشی رقمطراز ہیں:

لوگ بولے اب نیا ہو جا پرانا پن اتار
میں بھی کیا کرتا سر بازار ننگا ہو گیا

ظفر اقبال خاصے نامور شاعر ہیں انھوں نے نے بعض عمدہ غزلیں کہی ہیں، ان کے ہاں بھی یہ رجحان ملتا ہے۔

کہے گا وصل اس کو کون کنجر
ہو نہ کوئی انجر نہ پنجر
گھٹنے تڑوائے فرش پر ہی
کھیلے نہ پلنگ پر کبڈی
انگیا میں ڈوبتا ہے سورج
خوش بو سی چھوڑتی ہے چڈی

یہ امر باعث طمانیت ہے کہ خالد سعید نے اپنی غزلوں کو جنس زدگی ہزل اور اینٹی غزل سے محفوظ رکھا ہے۔ انکی غزلوں اور نظموں میں ڈھونڈنے سے بھی ایسے اشعار نہیں ملتے۔ کہیں ایک آدھ شعر مل بھی جاتا ہے تو جنسی تلذذ سے مبرا۔ جیسے

ناف سے کھلتی ہوس نظریں الجھتیں جانگھ سے
ہم نے اے شہر طرب یہ رنگ تو دیکھے نہ تھے

غزل کے زیادہ تر اشعار روایت سے باخبری اور نئے پیرایہ اظہار سے استفادہ کا ثبوت ہیں۔ جیسے۔

ہماری بستی میں کون پھر معتبر رہے گا
کہ آئینوں میں اُتر رہا ہے غبار سا کچھ

اک تو کہ سود و نفع کا قائل ہے ہر گھڑی
اک میں کہ خرچ ہوتا ہوں بے کار بے سبب

کبھی شفق ، کبھی حیا، کبھی گلاب شاخ پر
چھلک کے دل سے ایک قطرہ خوں کہاں کہاں گیا
اتنا بھی اے خدا تہی مایہ نہیں ہوں میں
پلکوں کی نوک نوک پہ شاید نمی تو ہے
ریزہ ریزہ شکل تیری، قطرہ قطرہ آنکھ ہے
یہ بتادے بے سبب تجھ کو تھکا تا کون ہے

بعض اشعار سادگی و پرکاری کی عمدہ مثال ہیں، جن میں موجودہ عہد کے ذہن اور اس کے اضطراب کو فن کے سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے۔ مثلاً:

کسے سجدہ کریں تم ہی بتاؤ
خداؤں کا یہاں تو سلسلہ ہے

ٹوٹنے کو سبھی ٹوٹے تھے مگر
رات بھر کوئی نہ مجھ سا ٹوٹا

وہی قصہ ہوا بہت مقبول
جس میں دل کا شمار آدھا تھا

اپنے ہونے کی کچھ دلیل تو ہو
پہلو سے دل سے تھوڑا شر باندھو

ایک ذرا سانس قریب کیا چمکی
ہوئی تابندہ قبا رات گئے

اس مجموعے میں مختصر، مختصر تر اور مختصر ترین ہر قسم کی نظمیں شامل ہیں جن کو نئے شاعر زیادہ تر فیشن اور فارمولے کے طور پر برت رہے ہیں۔ ان نظموں میں جدید عام روش کے باوصف شاعر کا اپنا ذاتی تجربہ اور

احساس بھی جھلکتا ہے۔ نظموں کے موضوعات موجودہ زندگی کے المیے جیسے بیزاری، بے یقینی، تنہائی، خستگی، بے بضاعتی، تشنگی سے عبارت ہیں۔

''عرصہ تہی آفاق'' اپنی ہیئت اور رویے سے متاثر کرتا ہے۔ ''ہجر دائم'' اور ''بے تاب تنہائیوں کا کرب'' شاعر کو سراپا مدوجزر بنا دیتا ہے۔ اس کی سانسوں کی شاخوں پر بیٹھا ہوا تشنگی کا پرندہ آفاق میں ہر سو پرواز کرتا ہے مگر اس کی تشنگی بجھتی نہیں اور دل کا اضطراب بدستور قائم رہتا ہے۔ اس طرح عرصہ حیات کے لیے تہی آفاق بن جاتا ہے۔ ''بے ریا جی چکے بے ریا مر چکے''، میں فلسطینی مجاہدین کو خراج تحسین اور شہدا کو نذر عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ خون کی ارزانی کا منظر نامہ ملاحظہ ہو:

مانگ تیری لہو کے ستاروں سے بھرنے لگی

کیا کوئی دشت و صحرا کو بھی دھو سکا ہے؟

''خستگی کا موضوع بھی انتشار، بیزاری اور بے یقینی ہے:

دل سا آتش فشاں سرد ہے جز سسکتا دھواں

مگر شاعر پر امید ہے کہ اس دھند کی سخت دیوار میں بھی شائد دریچہ کھلے مگر اس کی امید بر نہیں آتی۔ اس کے لیے خشک پلکوں سے قطرے چننا مشکل ہو گیا کیوں کہ آنکھیں پھوڑا ہو گئی تھیں۔

رات اور چاندی کا گھنگرو، گھل جانے کے بعد، ٹوٹتی پیالیوں کے درمیان، شاخ شاخ بوسے بے بضاعتی اور نیند مختصر نظمیں ہیں ان میں گھل جانے کے بعد، شاخ شاخ بوسے اور بے بضاعتی براہ راست اور فوری اثر پذیری کی مثال ہیں۔ رات اور چاندی کا گھنگرو ایک علامتی نظم ہے۔ قاری اپنی فکری استعداد و ذوق کے لحاظ سے نظم کی گرہیں کھول سکتا ہے۔ یہی حال ٹوٹتی پیالیوں کے درمیان اور نیند کا ہے۔ ان نظموں میں استعارے اور علامتوں کے استعمال کے بارے میں مجھے کچھ کہنا نہیں ہے اس کا فیصلہ میں قارئین پر چھوڑ دوں گا کیوں کہ شاعر نے اس باب میں اپنا یہ قول فیصل دیا ہے وہ ابھی تک شعریت کی ادنیٰ منزل میں ہے۔ پیکروں کو برتنے کے مرحلے میں ہے۔ مختصر نظموں میں شاعر کہیں اچھوتے احساس کو سمیٹتا ہے تو کہیں صرف قاری کو متحیر کر دیتا ہے۔

مجموعے کے چوتھے حصہ کی مشمولات کو میں نثر لطیف ہی کے زمرے میں شامل کرنا پسند کروں گا۔

یہ حصہ بھی قاری کی دلچسپی و دلجمعی کو برقرار رکھتا ہے۔

نئے شعرا کی اکثریت شعوری طور پر اظہار کے مستعمل اسالیب سے گریز کی کوشش کرتی ہے۔ مگر خالد سعید نے مانوس اسالیب اظہار کے ذریعہ اپنے احساسات کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ احساس و اظہار کے دوران انھیں قاری کی موجودگی کا بھی احساس ہے مگر بعض اشعار دھندلے اور تجریدی تصویروں سے بھی لبریز ہیں۔ غزلوں کے مقابلے میں ان کی نظموں میں عدم ابلاغ قدرے محسوس ہوتا ہے۔ ان کے تخلیقی جذبے میں شدت اور احساس میں تیزی پائی جاتی ہے۔ اگر اس میں فکر کی صلابت بھی شامل ہو جائے تو ان کی شاعری اور زرخیز و تازہ کار ہو جائے گی اور ان کا شمار ان جدید شعرا میں ہوگا جن کی اپنی علاحدہ شناخت ہوگی۔ مجموعے کا سرورق شب رنگ نمو بھی یہ تاثر دے رہا ہے کہ شب کی سیاہی چھٹ رہی ہے اور رنگ نمو نمایاں ہونے کو ہے بقول مخدوم:

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

●●

(1985ء)

پروفیسر عنوان چشتی : محقق، ناقد اور شاعر : ڈاکٹر صغریٰ عالم

پروفیسر عنوان چشتی: محقق، ناقد اور شاعر، مصنفہ ڈاکٹر صغریٰ عالم پیش نظر ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تلخیص کو کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی کی طرح ڈاکٹر صغریٰ عالم بھی شعر گوئی، تحقیق اور تنقید و تبصرہ نگاری سے شغف رکھتی ہیں۔ اُن کی اولین ترجیح شاعری ہے تاحال ۵ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نثر کے ریگ زاروں میں بھی ان کا اشہب قلم دوڑتا رہتا ہے۔ انھوں نے ہم عصر قلم کاروں کی تخلیقات کا محاکمہ بھی کیا ہے۔ اُن کے تبصروں کی پہلی کتاب ''کفِ میزان'' حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

عصری ادب میں پروفیسر عنوان چشتی ایک معروف نام ہے۔ شاعر، تنقید نگار، مبصر، خاکہ نگار اور فن عروض کے ماہر کی حیثیت سے انھوں نے بیش بہا ادبی میراث چھوڑی ہے۔ ڈاکٹر صغریٰ عالم نے عنوان چشتی کی شخصیت اور ادبی کارہائے نمایاں کو ہفت رنگوں میں مقید کیا ہے۔ یہ قوسِ قزح حیات و شخصیت، شاعری، عروضی تنقید، ادبی تنقید، تحقیق، تبصرہ نگاری اور خاکہ نگاری پر محیط ہے۔ پہلا رنگ (باب اول) حیات اور شخصیت کے تحت ڈاکٹر صغریٰ عالم نے چہرے کے نقوش کو دلکش اور دل چسپ انداز میں پیش کرتے ہوئے اپنے موضوع کی خوش پوشاکی، خوش گفتاری، وضع داری اور سیرت کی پاکیزگی کا جو نقشہ کھینچا ہے اور اس سے جو شبیہ اُبھرتی ہے وہ ہر حال اور ہر صورت میں ''نسخۂ آدمیت'' کہلائے گی۔ ''دوسرا رنگ'' عنوان چشتی کی شاعری کا احاطہ کرتا ہے۔ اس باب کی تفصیلات سے آگہی ہوتی ہے کہ عنوان چشتی نے ۱۹۴۹ء سے شعر کہنا شروع کیا۔ انھوں نے ابتدائی کلام پر علامہ ابر احسنی گنوری سے اصلاح لی جو صف اول کے شاعر ہی نہیں بلکہ اُستاد کامل بھی تھے۔ اس باب میں پروفیسر عنوان چشتی کے دو شعری مجموعوں ''ذوقِ جمال'' اور ''نیم باز'' کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنفہ نے ثابت کیا ہے کہ عنوان چشتی کی غزلیات میں تطہیر فکر کے ساتھ اقدار حیات کی اکائیاں بھی ملتی ہیں۔

''نیم باز'' کی غزلوں کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

تر آستیں ہی کی ہے نہ دامن بھگوئے ہیں
آنکھوں کی رسم چھوڑ کے ہم دل سے روئے ہیں
عنوانؔ ہم نے مقتلِ ہستی میں بارہا
اپنے لہو سے زخم خود اپنے ہی دھوئے ہیں

''ذوقِ جمال'' کی غزلیات کے تغزل اور جمالیاتی عنصر کے بارے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہے۔

''ہم 'ذوق جمال' کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے غزل کی زمین پر گلاب کی پنکھڑیوں کی بارش ہو رہی ہے'' ص ۶۰

ذیل کے اشعار میں عنوان چشتی کے تغزل کا رنگ ملاحظہ ہو:

وہ چاند چہرہ گلاب آنکھیں ،غزل سراپا
مگر اُسے میرا دل دُکھانے کی ضد عجب تھی
لبوں کا معبد ، بدن کی خوشبو ،نظر کے جگنو
مگر پھر بھی مُسکرانے کی ضد عجب تھی

عنوان چشتی کی شاعری میں مذہبی افکار خصوصاً تصوف کا گہرا اثر ملتا ہے۔ عنوان چشتی کو عروضی و فنی مسائل پر عبور حاصل تھا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے ''حرف برہنہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''عنوان چشتی کو علم عروض اور زبان و بیان سے گہرا شغف و درک ہے'' ص ۷۰

مصنفہ، عنوان چشتی کے کلام سے فنی و عروضی چابک دستی کی مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''عنوان چشتی کا کلام شکست ناروا، ایطا اور شتر گربہ کے عیوب سے پاک ہے نیز اجتماع ردیفین، خارج از بحر مصرعے، فنی یا عروضی عیب کا اُن کی شاعری میں گذر نہیں''۔

قوسِ قزح کا تیسرا رنگ ''ادبی تنقید'' کے تحت مصنفہ نے عنوان چشتی کی تنقیدی تصانیف عکس و شخص، تنقیدی پیرائے ،تنقید سے تحقیق تک ، اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے، اُردو میں کلاسیکی تنقید، معنویت کی تلاش، اُردو شاعری میں جدیدیت کی روایت اور حرف برہنہ کے مضامین کا جائزہ لیتے ہوئے شاعر کے

تنقیدی اُسلوب اور رویّوں پر روشنی ڈالی ہے اور تنقید کے ہر دبستان سے استفادہ کیا ہے۔ عکس اور شخص میں صرف خاکے اور تبصرے ہی نہیں بلکہ تنقیدی مضامین بھی ہیں۔ عکس اور شخص کے مضامین میں عنوان چشتی نے جمالیاتی اور تاثراتی تنقید سے کام لیا ہے۔ اس میں کلاسیکی تنقید کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ان کا تنقیدی نکتۂ نظر متوازن ہے ان کا نظریہ تنقید، ادب کو جمالیاتی اور نفسیاتی اُصولوں کی روشنی میں پرکھنا ہے۔ انھوں نے نظریاتی اور عملی دونوں سطحوں پر تنقید کے دائرے کو وسیع کیا ہے۔ ان کی تنقیدی رائے گنجلک نہیں واضح ہے۔ وہ کسی کی تعریف وتوصیف میں زمین وآسمان کے قلابے نہیں ملاتے۔ حق گوئی و بے باکی ان کی تنقید کا شعار ہے۔ ان کی ایک تنقیدی کتاب کا نام ''حرف برہنہ'' ہے۔ انھوں نے حرف برہنہ میں بشیر بدر کے شعری مجموعے ''آمد'' پر یوں رائے زنی کی ہے۔

''بشیر بدر کی ''آمد'' اردو شاعری کے لیے خوش آئند نہیں بلکہ یہ ادھ کچری شاعری پر مشتمل ہے زیادہ سے زیادہ اس کتاب کو صحیفۂ اغلاط کہا جاسکتا ہے''۔

اس کتاب کا چوتھا باب (چوتھا رنگ) عنوان چشتی کی عروضی تنقید پر مشتمل ہے۔ عروضیات اور شعریات کے مسائل پر عنوان چشتی کی گہری نظر تھی۔ ان کے ہم عصروں میں پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر گیان چند جین، رشید حسن خاں اور دیگر ادیبوں اور نقادوں نے اس جانب توجہ کی ہے۔ مگر عنوان چشتی کی کاوشیں اس ضمن میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں شاعری کی قدر شناسی کے سلسلے میں عنوان چشتی نے مغربی افکار کے ساتھ ساتھ مشرقی شعریاتی اُصولوں سے استفادہ کیا ہے جن کی جھلکیاں ان کی تصانیف عروضی وفنی مسائل، حرف برہنہ اور اردو میں کلاسیکی تنقید میں ملتی ہیں۔ ''ابراحسنی اور اصلاح سخن'' کی اشاعت سے اصلاح سخن کے دلدادہ و اردان بساط سخن مدتوں فیضان حاصل کرتے رہیں گے۔ پانچواں رنگ تحقیق سے متعلق ہے۔ مصنفہ نے ہماری جامعات میں جاری تحقیقی کام پر زخمہ لگایا ہے اور کہا ہے کہ تحقیق کو جس علم اور شعور و تجسس کی ضرورت ہے اس کا وہاں فقدان ہے۔ مصنفہ نے اس باب میں دس بارہ صفحات تحقیق اُس کی اقسام اور متن کی ترتیب تدوین کے لوازمات کے بارے میں مختص کیے ہیں۔ پروفیسر عنوان چشتی کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ عنوان چشتی کے تحقیقی کارنامے نامور محققین سرسید، حالی، شبلی، عبدالحق، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، سید مسعود حسین رضوی، سید محی الدین قادری زور، خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر

نورالحسن ہاشمی، گیان چند، رشید احمد خاں، نثار احمد فاروقی کے ہم پلہ ہیں۔ اس خصوص میں ان کے تحقیقی مقالے "اردو شاعری میں ہیت کے تجربے" کو تحقیقی کارناموں کی روشن مثال قرار دیا ہے۔ نیز عنوان چشتی نے اپنی ایک اور تصنیف "معنویت کی تلاش" میں خواجہ میر درد، اکبرالہ آبادی، حسرت موہانی اور اقبال کے تحقیق تنقید کے تجربوں میں نفسیاتی پہلوؤں کو ملحوظ رکھا ہے۔

چھٹے باب کی ابتدا میں مصنفہ نے اُردو میں تبصرہ نگاری کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے تبصرہ نگاروں اور ان رسائل کا ذکر کیا ہے جن میں تبصرے شائع ہوتے رہے ہیں۔ مصنفہ نے "نگار" کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا ہے کہ نیاز فتح پوری نے اپنے تبصروں کے ذریعے اصلاح سازی کو راہ دی۔ صغریٰ عالم نے سوغات کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمود ایاز نے سوغات کے ذریعے تبصروں کی اہمیت کو دوبالا کر دیا۔ قومی آواز (ہفتہ وار ایڈیشن) ماہنامہ آج کل (دہلی) کے تبصروں کو اوسط درجے کے تبصروں میں شمار کیا ہے۔ مزید یہ کہا ہے کہ احتشام حسین، آل احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی، رشید احمد صدیقی، علی جواد، زیدی، حامدی کاشمیری، اور جگن ناتھ آزاد کے تبصرے اس ضمن میں آتے ہیں۔ (ص ۱۴۱) گویا مذکورہ ادیبوں اور ناقدوں کے تبصرے بھی اوسط درجے کے ہیں۔ مگر دوسرے صفحہ ہی پر (ص ۱۴۲) قاری کی نظر فاضل مصنفہ کی تضاد بیانی پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے "آل احمد سرور اور ان کے معاصر احتشام حسین کے تبصرے بھی معیاری تبصروں میں شمار کیے جاتے ہیں"۔

شاعر اور صبا میں شائع شدہ وحید اختر اور عالم خوندمیری کے بعض تبصروں کو قابلِ قدر قرار دیا ہے تو سہ ماہی عصری ادب اور کتاب نما اور اردو دنیا کے تبصروں میں انھیں فکر انگیزی کا فقدان محسوس ہوا۔ تبصروں کا اہتمام کرنے والے جن رسائل کے نام گنوائے گئے ہیں ان میں اردو بک ریویو دہلی شامل نہیں ہے جو نہ صرف اپنی اشاعت کے دس برس مکمل کر چکا ہے بلکہ واحد رسالہ ہے جس کے صفحات کے صفحات نئی کتب و رسائل کے تبصروں کے لیے مختص ہیں۔ مصنفہ نے اعتراف کیا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی نے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ تبصرے لکھے ہیں مگر فاروقی صاحب کی تبصرہ نگاری کے بارے میں ان کی خاموشی تحیر خیز ہے۔ جہاں تک عنوان چشتی کا تعلق ہے ان کے تبصرے بے باکی اور غیر جانب داری سے مملو ہیں۔ "حرف برہنہ" میں شامل ان کے دس طویل اور چودہ مختصر تبصرے تاثر اور تعصب، لاگ اور لگاؤ سے بے نیاز ہیں۔ اختر الایمان

کے شعری مجموعے ''بے سروساماں'' پر عروضی تبصرہ کرتے ہوئے نشاندہی کی ہے کہ 'گھاؤ' کا صحیح وزن 'فاع' ہے فعلن نہیں جبکہ شاعر نے 'گھاؤ' کو 'فعلن' (نازک) کے وزن پر باندھا ہے جو ثقہ شاعروں کی روایت کے خلاف ہے اس طرح بشیر بدر کی ''آمد'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی شاعری میں پائی جانے والی جذباتیت کو غیر مہذب اور غیر صحت مند قرار دیا ہے۔ انھوں نے بشیر بدر کی غزلوں میں ذہنی نابالغی و ناپختگی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ صغیر النساء کی کتاب ''غزلیات غالب کا عروضی تجزیہ'' پر ان کا تبصرہ غیر جانب داری و بے باکی کی عمدہ مثال ہے۔ اس کتاب میں گیان چند جین اور شمس الرحمٰن فاروقی کی آراء کو بطور سند شامل کیا گیا ہے۔ فاروقی صاحب نے رائے دی ہے کہ ''صغیر النساء بیگم کو عروض پر کامل دست گاہ ہے۔ انھوں نے غالب کی بحروں کے سلسلے میں پوری مہارت کا ثبوت دیا ہے''۔ عنوان چشتی نے اپنے تبصرے میں عروضی اغلاط کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''فاروقی صاحب نے کتاب کے مطالعے کے بغیر رائے دی ہے'' عنوان چشتی نے تبصروں میں ہمیشہ اپنی بات دلیل کے ساتھ پیش کی ہے۔ مصنف کی شہرت یا صاحب کتاب سے اپنے تعلقات کو تبصروں میں حائل ہونے نہیں دیا۔ قوسِ قزح کا آخری رنگ خاکہ نگاری ہے۔ ابتدا میں مصنفہ نے خاکہ نگاری کی تاریخ، تعریف، محرکات اور لوازمات کا جائزہ لیا ہے اور اس کی روشنی میں عنوان چشتی کی خاکہ نگاری کا مطالعہ کیا ہے۔

عنوان چشتی کے تحریر کردہ خاکے ان کی کتاب ''عکس و شخص'' میں شامل ہیں۔ عکس و شخص صرف خاکوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں تبصرے اور تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں۔ اس لیے مصنفہ نے کبھی اسے تنقید نگاری (صفحہ ۱۸) تو کبھی خاکہ نگاری تو کبھی تبصرہ نگاری (صفحہ ۸۲) کے زمرے میں شامل رکھا ہے۔ ویسے عنوان چشتی نے خود اس کتاب کی نوعیت کے بارے میں فیصلہ کا حق قاری کو دیا ہے کہتے ہیں ''یہ مضامین تعارف ہیں یا خاکہ یا تبصرہ ہیں یا تنقید یا ان سب کا مجموعہ ہیں۔ یا کچھ بھی نہیں اس کا فیصلہ انھیں پڑھ کر آپ خود کیجیے''۔ عکس و شخص میں ادیبوں اور شاعروں کے دس خاکے اور باقی تنقیدی مضامین ہیں۔ ان خاکوں میں حلیہ نگاری، سیرت، سوانحی اشاروں کے علاوہ ادبی تنقید کے پہلو نمایاں ہیں۔ عنوان چشتی کو شخصیت کے خد و خال کی تصویر کشی میں کمال حاصل تھا۔ وضع قطع کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ قاری کے سامنے ہو بہو شخصیت کھڑی ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے موضوعات کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ

بہت سے پوشیدہ گوشوں کے ساتھ مکمل شخصیت ان خاکوں میں بے نقاب ہوتی ہے۔ ان کے خاکوں میں سوانحی اشارے بھی موضوع کی مکمل شخصیت کی تکمیل میں ممد ومعاون ہوتے ہیں۔ عنوان چشتی نے خاکہ نگاری میں اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے۔ بعض ناقدین خاکوں میں سوانحی مواد اور ادبی تنقید سے روگردانی کے حامی ہیں ان کے مطابق اس سے خاکے میں دل چسپی کا عنصر کم ہوجاتا ہے۔ میری رائے میں سوانحی مواد اور ادبی تنقیدی تاثرات بکمال اختصار شامل کیے جائیں تو قاری فنکار کے علاوہ اس کے فن پارے سے بھی روشناس ہوگا۔ عنوان چشتی نے سوانحی اشاروں اور تنقید سے خاکوں کی روح کو مجروح ہونے نہیں دیا۔
ان کے خاکوں کا اُسلوب شگفتہ، انداز بیان اور الفاظ کی شیرینی متاثر کُن ہے۔ ۱۹۱ صفحات پر پھیلی ہوئی قوس قزح کے ان سات رنگوں میں آٹھواں رنگ ماحاصل / ماحصل کی آمیزش کا جواز نا قابلِ فہم ہے۔ کتاب کا نام اس لحاظ سے تشنہ ہے کہ وہ موضوع کے تمام سات رنگوں کا احاطہ نہیں کرتا۔ کتاب کے صفحہ ۱۸ پر عنوان چشتی کی جو مطبوعہ کتابوں کی فہرست دی گئی ہے وہ نامکمل ہے صرف ۸ کتابوں کے نام درج ہیں۔ حالانکہ مصنفہ نے اپنے موضوع کی شخصیت اور فن کی تفہیم کے لیے ان کی تحریر کردہ ۱۵ کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صغریٰ عالم کی یہ کتاب پروفیسر عنوان چشتی کے انتقال کے بعد ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی ہے بہتر ہوتا کہ توقیت نامے (ص ۱۴ تا ۱۷) میں تاریخ وفات بھی درج ہوتی۔
تاہم ڈاکٹر صغریٰ عالم مبارک باد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے اردو ادب کی ایک ہمہ جہتی شخصیت کے کارہائے نمایاں کو کتابی شکل میں محفوظ کیا۔ ان کا یہ تحقیقی کارنامہ لائق ستائش ہے۔

●●

(اکتوبر 2008ء)

تصوف بہ یک نظر : قدیر زماں

راقم سطور ارباب ادارہ تہذیب کا سپاس گزار ہے کہ انھوں نے ممتاز فکشن رائٹر، ڈرامہ نگار و مترجم جناب قدیر زماں کو دین کے ایک اہم شعبہ علم باطن یعنی تصوف کی جانب راغب کیا، جس کے نتیجے میں ''تصوف بہ یک نظر'' آج ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ۱۱۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب بلاشبہ تصوف کو سمجھنے اور سمجھانے میں اپنا کردار ادا کرے گی۔

زیر نظر کتاب کے (۱۵) ابواب ہیں۔ ان ابواب کے ذریعے تصوف کی اساس، اشتقاق، مفہوم، راہ سلوک، شرعی جواز، وجودی و شہودی نظریات، صوفی سلسلوں، چند صوفی اصطلاحوں و عقائد نیز تصوف و ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان موضوعات کی تفہیم میں مصنف نے کہیں تفصیل تو کہیں اختصار سے کام لیا ہے۔ پہلا باب ''اساس تصوف'' ۲۲ صفحات پر محیط ہے۔ اس باب سے خلفائے راشدین، ان کے عہد میں مسلمانوں کے درمیان لڑی گئی جنگوں، بنی امیہ اور بنی عباسیہ کے دور کے مظالم اور راہ خدا میں ائمہ کی اذیت رسانی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ تصوف کی اساس کے سلسلے میں جناب قدیر زماں نے ڈاکٹر وحید اختر کے ایک لکچر اور انسائیکلوپیڈیا برطانیہ کے چودھویں اڈیشن کی نویں جلد کے حوالے سے لکھا ہے کہ بنی امیہ کے حاکموں کی دنیاداری اور ان کے ظالمانہ رویہ کے خلاف چند متقی اور پرہیزگار لوگوں کے ردعمل کی صورت میں تصوف آشکار ہوا۔ اس ادعا کے برخلاف صوفیہ اپنے عمل کا جواز قرآن اور حدیث سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق قرآن اور حدیث کی اصطلاح میں جسے احسان کہا گیا ہے وہی تصوف ہے۔ شریعت، حدیث، فقہ اور کلام کی اصطلاحیں جب شروع سے نہیں تھیں تو پھر اسلام کے ابتدائی دور میں صرف تصوف کی اصطلاح پر اصرار اور اس کی تلاش کہاں تک مناسب ہے۔ جس طرح فقہ و شریعت کا سرچشمہ قرآن ہے، اسی طرح صوفیہ کرام کے مطابق تصوف کا منبع قرآن ہے۔ اس خصوص میں ممتاز فلسفی و صوفی ڈاکٹر میر ولی الدین کی تصنیف ''قرآن اور تصوف'' دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ ابوہاشم عثمان بن شریک (م ۱۵۷ھ) کو پہلا صوفی قرار دیا گیا ہے اور ان کے ساتھ جابر بن حیان (م ۱۶۰ھ) کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ گویا ڈیڑھ سو سال تک تصوف کا لفظ عربی میں نہیں تھا۔ لیکن تصوف کے عوامل زہد و تقویٰ و توکل، مجاہدہ و مواخذہ، حلم و رواداری، عفو و درگزر،

توازن وانصاف، خوف وخشیت، صبر وقناعت، ریاضت وعبادت جیسے دینی صفات تصوف کا حصہ تھے۔ مسجد نبویؐ کے شمال میں واقع چبوترے پر ۱۰۰ تا ۱۱۲ اصحاب اکثر عبادت وریاضت کرتے تھے۔ ان میں حضرت بلالؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوالدرداؓ وغیرہم شامل تھے۔ ان کا شمار اصحاب صفہ میں ہوتا تھا۔

گیارھویں صدی عیسوی کے اہم صوفی سید علی ہجویری (۱۰۰۹ء۔۱۰۷۲ء) کی تصنیف ''کشف المحجوب'' تصوف پر پہلی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ سید علی ہجویری نے اہل صفہ و دیگر صحابہؓ کو اہل تصوف کے پیشواؤں میں شمار کیا ہے۔ عہد حاضر کے دانشور وصوفی حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی نے اپنی تصنیف ''تصوف۔ رسم یا حقیقت'' میں حضور اکرم ﷺ کو پہلا صوفی اور مسجد نبوی کو پہلی خانقاہ قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بات اظہر ہے کہ ۱۵۰ ہجری تک تصوف کی اصطلاح کے عدم رواج کے باوصف تصوف کا تعلق اسلام کے ابتدائی دور سے رہا ہے۔

اسلام میں تصوف کہاں سے آیا؟ اس کتاب کا ایک اور اہم باب ہے۔ قدیر زماں نے اس خصوص میں غلام احمد پرویز کی کتاب ''تصوف اور اسلام'' اور ''زماں و مکاں'' مصنفہ وزیر حسن اور ایک مستشرق آرتھر جے آربیری کی تصنیف (An Introduction to History of Sufism, Arthur J Arberry) سے استفادہ کیا ہے۔ جن کے مطابق دوسری صدی ہجری کے اختتام پر اسلامی افکار میں یونانی فلسفہ خاص طور پر نو افلاطونیت (Neoplatonism) اور عرفانیت (Gnostinism) ہندوستانی فلسفہ ویدانت، یہودیوں کے نظریہ زہاد، عیسائیوں کی رہبانیت، زرتشت کی تعلیمات، فنا کا نظریہ یعنی بدھ مت کے فلسفہ نروان کی آمیزش ہوئی جس کے باعث تصوف کو ایک درآمد شدہ چیز سمجھا گیا۔ خاص طور پر یوروپ کے مستشرقین نے تصوف کو یونانی، ہندی، ایرانی اور عیسائی اثرات کا آمیزہ قرار دیا اور تصوف کی علاحدہ علاحدہ تعبیریں ہونے لگیں۔ کسی نے گوشہ نشینی کو تصوف جانا تو کوئی فاقہ کشی اور ترکِ علائق کو تصوف سمجھتا رہا، کہیں صرف مجاہدے ومراقبے کو تصوف کا نام دیا گیا۔ بعض نام ونہاد صوفیوں نے اپنے طریقہ کار میں تبدیلیوں کے ذریعے شریعت کو ساقط کیا اور مطعون ہوئے۔ بعض لوگوں نے اسے شریعت کا مقابل یا اس کی ضد گمان کرلیا۔ درحقیقت تصوف صرف گوشہ نشینی خرقہ پوشی اور رہبانیت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ شریعت باطن کا ایک نظام ہے۔ جس کی بنیاد قرآن کی تعلیمات، احادیث نبویؐ، صحابہ کی پاک زندگی اور تابعین وتبع تابعین کی

پاک سیرت پر ہے۔ اس خصوصیت کے باعث تصوف ہر دور کی بڑی اکثریت کے لیے قلبی وابستگی کا باعث رہا ہے۔ اس باطنی نظام نے ممتاز فلاسفہ ابن سینا و ابن طفیل اور علم کلام کے علمبردار امام غزالی اور امام ولی اللہ کو بھی متاثر کیا۔ نیز ائمہ کرام حضرت امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور حضرت امام مالکؒ نے بھی صوفیہ سے استفادہ کیا۔ صوفیہ کرام کو شریعت کی پابندی کا کس درجہ لحاظ تھا ان کے ان اقوال سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا ہے۔ ''ہمارے طریقہ کی بنیاد کتاب و سنت پر قائم ہے اور جو کچھ کتاب و سنت سے خارج ہے، وہ باطل ہے''۔ حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا فرمان ہے۔ ''حقیقت جس کی شریعت تائید نہ کرے الحاد و زندقہ ہے''۔ برگزیدہ صوفی مخدوم جہانیان جہان گشتؒ فرماتے ہیں۔

''ایک ولی کیلئے ممکن ہے ہوا میں اڑے، پانی پر چلے، اس کے لیے زمین و آسمان کی طنابیں کھینچ جائیں لیکن وہ اس وقت تک ولی نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنی گفتار، رفتار اور کردار میں اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کا پیرو نہ ہو''۔ خواجہ دکن حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کا ارشاد ہے۔

''اگلے پچھلے سب کہتے ہیں کہ حقیقت سر الٰہی ہے مگر میں محمد الحسینی یہ کہتا ہوں کہ شریعت سر الٰہی ہے اس لیے کہ حقیقت کی باتیں تو میں نے ملحدوں، قلندروں، جوگیوں اور زندیقوں سے بھی سنی ہیں لیکن شریعت کی باتیں اہل دین اور اہل یقین کے سوا کسی کی زبان سے نہیں سنیں''۔ اس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ تصوف خالص اسلامی نظام حیات ہے۔ جو شریعت سے متصادم نہیں ہوتا اور جو فکر و عمل اسلام سے ٹکراتا ہے وہ تصوف نہیں ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا الیاسؒ، مولانا منظور نعمانیؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی اسلامی تصوف کو تزکیۂ نفس و تہذیب اخلاق کا وسیع اور مستحکم نظام قرار دیا ہے۔

شریعت اور تصوف کے اس تعلق خاطر کی روشنی میں ضروری تھا کہ تصوف میں شامل ان عوامل، افکار و نظریات احوال اور اشغال کا جائزہ لیں جو شریعت سے ٹکراتے ہیں۔ اس جانب چوتھی صدی ہجری کے مشہور صوفی ابونصر سراجؒ (۹۹۸ء) ابن حزمؒ (۹۹۴ء۔۱۰۶۴ء) ابن جوزیؒ (۱۱۱۴ء ۔ ۱۲۰۱ء) ابن قیم جوزیؒ (۱۲۹۲ء۔ ۱۳۶۰ء) شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ (۱۲۶۳ء ۔ ۱۳۳۸ء) حافظ ابن قیمؒ (۱۲۹۲ء ۔ ۱۳۵۰ء) حضرت مجدد الف ثانیؒ (۱۵۶۴ء ۔ ۱۶۲۴ء) حضرت شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۲ء ۔ ۱۷۶۳ء) اور ان کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ (۱۷۷۹ء ۔ ۱۸۳۰ء) وغیرہم نے تصوف میں شامل اسلامی اور غیر اسلامی افعال و اشغال کی نشاندہی کی ہے۔

جناب قدیر زماں نے بھی ''تصوف بہ یک نظر'' میں چند ایسی حکایات اور واقعات و اقوال درج کیے ہیں، جنہیں شریعت ساقط قرار دیتی ہے۔ ترکِ علائق، توکل، فقر، تجرد اور عبادت کے بارے میں مصنف نے جن اقوال و اعمال کا ذکر کیا ہے اسلامی نقطہ نظر سے ان میں کافی غلو نظر آتا ہے۔ خصوصاً صوفیہ کا یہ قول:

''عمل کیے جاؤ جب تک نہ حال ہو جائے۔ تو تم خالص ہو گئے یعنی عبادت معاف ہوگی۔'' (ص ۳۲)

اسی طرح فتوحات مکیہ کے مصنف ابن عربی کا یہ قول ''نماز کی بنیاد غیر غیریت پر ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں'' (ص ۵۵) حضرت حنیف تلمسانی کی جانب سے اپنے مرید کو یہ ہدایت کی کہ ''قرآن نہ پڑھو فصوص الحکم (ابن عربی کی تصنیف) پڑھا کرو''۔

قدیر زماں نے پہلے باب کے ص ۳۰ پر ''انسان کامل'' سید عبدالکریم بن ابراہیم جیلانی (ترجمہ، فضل میراں کراچی) کے حوالے سے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے منسوب یہ قول نقل کیا ہے:

''اے انبیاء کے گروہ تم نے انبیاء کا لقب پایا۔ ہم نے وہ چیز پائی جو تم کو نہیں ملی'' حضرت عبدالقادر جیلانی جیسے پابند شریعت صوفی سے اس غیر مشروع قول کا انتساب نہ صرف تحقیق طلب بلکہ ناقابل یقین بھی ہے۔ بہتر ہے کہ اس طرح کی کمزور روایتوں سے صرف نظر کریں۔

قدیر زماں نے ایک باب نظریات وحدت الوجود اور وحدت الشہود کیلئے مختص کیا ہے اور نہایت عام فہم انداز میں دونوں نظریات کے فرق کو واضح کیا ہے۔ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے صوفی حضرت شیخ محی الدین ابن عربی (۵۶۰۔۶۳۸ھ) کا بڑا کارنامہ وحدت الوجود کا نظریہ ہے۔ یہ نظریہ ویدانت کے فلسفہ میں بھی ملتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق زماں و مکاں حقیقی نہیں ہیں صرف ہمارے محدود و انفرادی شعور کی دریافت ہیں، ابن عربی کے لحاظ سے کائنات خیالی اور موہوم ہے یعنی جب خدا کی قربت حاصل ہوئی ہے تو دوری ختم ہو جاتی ہے یعنی کثرت وحدت میں ضم ہو جاتی ہے۔

ابن عربی کے کوئی چار سو سال بعد حضرت مجدد الف ثانیؒ نے وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا۔ انہوں نے روحانی سفر کے تین مراحل بیان کیے ہیں۔

۱۔ وحدت الوجود، ۲۔ ظلیت، ۳۔ عبدیت،

وحدت الوجود عبارت ہے جمع الجمع سے جس تک عام صوفیہ کی رسائی ہے۔ یعنی سالک کو کائنات اور خالق ایک ہی نظر آتے ہیں۔ دوسرا مرحلہ ظلیت یعنی فرق بعد جمع کا ہے جس تک اہل طریقت کے بعض صوفی پہنچے

ہیں۔یعنی سالک کو کائنات ظل محسوس ہوتی ہے۔اور آخری مرحلہ عبدیت کا ہے جو فرق مطلق سے عبارت ہے اس تک نسبتاً کم صوفی پہنچتے ہیں۔یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کائنات سے کلیتاً منزہ ومختلف نظر آتی ہے۔توحید شہودی صرف ایک ذات کے مشاہدے کا نام ہے۔اس لحاظ سے کائنات خدا سے الگ ضرور ہے لیکن وہ معدوم ہے اس کے معدوم ہونے کی وجہ خدا کا عکس اس پر پڑتا ہے۔ابن عربی نے کائنات کو خیالی اور موہوم قرار دیا تھا۔

وجودی نظریہ سے انتہا پسندی میں اضافہ ہوا۔وجودی صوفی یہ کہتے رہے توحید خالص کی تشریح وحدت الوجود کا نظریہ کرتا ہے۔موجودات جب وحدت اختیار کر لیتے ہیں تو خالق اور مخلوق میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ابن عربی کے اس نظریہ کی وجہ سے بعض صوفیہ پر الحاد اور زندقہ کا الزام بھی لگایا گیا۔

اس کتاب کا ایک اور اہم باب چند صوفی اصطلاحیں اور عقیدے ہیں۔اس باب سے کتاب کے موضوعات کی تفہیم ہوتی ہے اور تصوف کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اس کتاب کا آخری باب ''تصوف اور ادب'' ہے جو نامکمل اور تشنہ ہے کیونکہ سیر حاصل گفتگو کے لیے یہ موضوع ایک علاحدہ کتاب کا متقاضی ہے۔قدیر زماں نے میرؔ و آتشؔ کے ایک ایک شعر کے علاوہ غالبؔ اور اقبالؔ کے چند اشعار پر قناعت کی ہے اردو شاعری میں جب بھی تصوف کا ذکر آتا ہے تو ہمیں سب سے پہلے خواجہ میر دردؔ کی یاد آتی ہے۔اقبالؔ کے تصوف پر کافی کتابیں بھی مل جاتی ہیں۔کلام اقبال میں اسلامی تصوف کی حمایت اور غیر اسلامی تصوف کی مذمت میں کافی اثاثہ موجود ہے۔جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی کے اشعار میں بھی تصوف مل جاتا ہے مگر مصنف نے اس کتاب کے صفحہ ۴۳ پر کتاب کی تحریر و ترتیب کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ قارئین کو تصوف کے بارے میں چند بنیادی معلومات فراہم کرنا چاہتے تھے۔صوفیوں کی سوانح یا کارنامے پیش کرنا ان کا منشا نہیں تھا اس لحاظ سے وہ اس ''جہاں'' سے سرسری نہیں بلکہ کامیاب گزرے ہیں۔تصوف جیسے طول طویل دریا کو انھوں نے کوزے میں بند کر دیا ہے۔میں انھیں اپنی جانب سے اور شائقین تصوف کی جانب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

●●

(2006ء)

آہنگ : رفیعہ منظورالامین

رفیعہ عبدالحمید 1956ء میں ممتاز ادیب و براڈ کاسٹر منظورالامین سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں تو وہ رفیعہ منظورالامین کہلائیں۔ وہ 25/جولائی 1937ء کو حیدرآباد کے ایک معزز اور روشن خیال خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد محمد عبدالحمید صاحب پولیس ٹریننگ کالج حیدرآباد کے پرنسپل تھے۔ رفیعہ صاحبہ کی ابتدائی تعلیم ''نارمل پراکٹسنگ اسکول چنچل گوڑہ'' (حیدرآباد) میں ہوئی۔ جہاں سے انھوں نے 1952ء میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ رفیعہ صاحبہ اپنے اسکول کی ہیڈ گرل رہی ہیں ان کا یہ اسکول معیار اور ڈسپلن کیلئے ممتاز تھا۔ انھوں نے 1956ء میں کلیہ اناث عثمانیہ یونیورسٹی سے بی ایس سی کی ڈگری لی۔ انھیں ابتداہی سے فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ اس لیے مصوری پینٹنگ اور مجسمہ سازی کا نصاب بھی مکمل کیا۔ ان کے والد فارسی اور اردو میں شاعری کرتے تھے۔ اس طرح انھیں ادبی شغف ورثہ میں ملا۔ 8-9 سال کی عمر میں انھوں نے پہلی کہانی ''سوداگر اور مچھر'' لکھی جو پیام تعلیم میں شائع ہوئی۔ وہ کلیہ اناث عثمانیہ یونیورسٹی کے میگزین Cosmos کی مدیرہ رہ چکی ہیں۔ رفیعہ صاحبہ کے خسر اور خوشدامن بھی تعلیمی اداروں کے پرنسپل تھے۔ سسرالی ماحول اور منظورالامین صاحب کی رفاقت نے ان کے ادبی شوق کو ابھارنے کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ ان کا پہلا افسانہ 1972ء میں شمع میں شائع ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے اپنے مشاہدات و تجربات پر مبنی کئی کہانیاں لکھیں ان کی کہانیوں کی تعداد 200 سے زیادہ ہے۔ ان کی کہانیوں کے دو مجموعے دستک سی در دل پر (1986ء) اور آہنگ (دسمبر 2000ء) اور تین ناول ''سارے جہاں کا درد'' (1984,1974) ''عالم پناہ'' (1983,87,93) ''یہ راستے یہ مرحلے'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ سائنسی کتابوں میں خبر رسانی کے طریقے (اکتوبر 1967ء) اور ''سائنسی زاویے'' (1986,1969) اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے بارہ ٹیلی فلمیں لکھی ہیں جو دوردرشن کے نیشنل چینل کے علاوہ سری نگر، جالندھر، لکھنؤ، دہلی اور حیدرآباد کے کیندر سے پیش کی جا چکی ہیں۔ رفیعہ منظورالامین کے ڈرامے وودھ بھارتی کے علاوہ اے آئی آر کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر ہو چکے ہیں۔ ان کے پہلے ناول ''سارے جہاں کا

درد'' میں کشمیر کی وادی اور اس کے حسن کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے ناول ''عالم پناہ'' میں حیدرآباد کی تہذیب اپنی رنگارنگی و بوقلمونی کے ساتھ موجود ہے اس ناول کی بنیاد پر انھوں نے ٹی وی سیریل ''فرمان'' کے ذریعے حیدرآباد کے ماضی اور روایتوں کو زندگی بخشی۔ رفیعہ اپنی ان مٹ کہانیوں میں سینکڑوں کرداروں کو زندگی دے کر 30/ جون 2008ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ افسانہ نگار رفیعہ منظورالامین کی شخصیت و تخلیقات کے بارے میں یہ ایک مختصر سا تعارف تھا۔ اب رفیعہ منظورالامین کے افسانوں، خصوصیت کے ساتھ آہنگ کے افسانوں کا تجزیہ مقصود ہے۔

آہنگ ان کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ہے جو دسمبر 2000ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کتاب میں جملہ 23 افسانے شامل ہیں۔ قبل اس کے کہ ان کے افسانوں کے بارے میں اظہار خیال کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ کے افسانوی محرکات پر نظر ڈالی جائے۔ کتاب کا پیش لفظ انھوں نے خود لکھا ہے دوسروں سے نہیں لکھوایا۔ یہ روایت شکنی قابل داد ہے یوں بھی رفیعہ منظورالامین جس پایے کی افسانہ نگار ہیں، انھیں اس بیساکھی کی کیا ضرورت ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ ''ان کی کہانیاں ان کے اپنے مشاہدے اور محسوسات پر مبنی ہیں'' انھیں اپنے شوہر منظورالامین ڈائرکٹر دوردرشن کے ساتھ اندرون و بیرون ملک کے شہروں میں جانے اور رہنے کا موقع ملا۔ ویسے بھی سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے قاری کی ملاقات ان کے افسانوں میں جہاں کشمیر کی خوبصورت مرغزاروں اور برفبار ساعتوں سے ہوئی ہے وہیں وہ جبل پور میں نربدا کی سنگلاخ سنگ مرمر کی چٹانوں کا نظارہ کرسکیں گے۔ وہ راجستھان کے تھار صحرائے ناپیدا کنار کی آندھیوں سے متعارف ہوں گے۔ انھیں چھتیس گڑھ کے بستر ضلع کے باسیوں کے رسم و رواج سے بھی روشناسی ہوگی، انھیں جنوبی و شمالی کوریا کی تقسیم کے المیے کا پتہ چلے گا تو میکسیکو کی سرزمین کی تیز مرچیں وطن عزیز کی یاد دلائیں گی۔ مصنفہ نے دیدہ ور قارئین کو غور و فکر کے ذریعہ قطرہ میں دجلہ اور جزو میں کل دیکھنے کی بھی دعوت دی ہے۔

اردو افسانے نے داستان سے چیستاں اور پھر ماجرے تک لوٹنے کے عمل میں کئی منزلیں طے کی ہیں۔ وہ تخیل پرستی اور رومانیت کی منزلیں طے کرتا ہوا حقیقت پسندی تک پہنچا۔ جدیدیت کے دور میں ابہام و تجرید، علامت اور بے ماجری کا غلبہ رہا یہ دور بھی جلد ختم ہوگیا۔ رفیعہ منظورالامین کا دور روایت کی جانب مراجعت کا دور ہے۔ ان کے افسانوں میں پلاٹ پر گرفت مضبوط ہے، کردار سادہ اور پرکار ہیں۔ ان کی

کہانیاں عصری احساس سے پُر آج کے مسائل اور زندگی کا آئینہ ہیں اور وہ زبان کی لطافت وحسن بیان سے متاثر کرتی ہیں۔ منظور الامین نے انھیں بجا طور پر ''لفظوں کا جادوگر'' کہا ہے۔ افسانے کا مقصد کسی مخصوص خیال کو دوسروں تک پہنچانا ہے، چیخوف اور موپاساں اپنے عہد کے بڑے افسانہ نگار گزرے ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ چیخوف نے زندگی کی اس طرح تصویر کھینچی جیسی کہ وہ ہے یعنی ہو بہو اور بعض دفعہ اس نے ایسی بھی تصویریں کھینچیں جیسی کہ ان کو ہونی چاہیے۔ اس کے برعکس موپاساں، زندگی جیسی ہے اسے ویسی ہی پیش کرتا رہا۔ رفیعہ منظور الامین کے افسانوں میں چیخوف کی روش صاف طور پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے نہ صرف زندگی کی ہو بہو تصویریں کھینچی ہیں بلکہ اشارات وکنایات کے ذریعہ رہنمائی کی ہے کہ زندگی کیسی ہونی چاہیے۔ وہ بہ حیثیت افسانہ نگار عصمت چغتائی، جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن اور واجدہ تبسم کی صف میں نظر آتی ہیں مگر انھوں نے کسی کا اثر قبول نہیں کیا وہ اپنی افسانہ نگاری میں منفرد نظر آتی ہیں۔ چھس، بختاور، نیل کنٹھ، سفر، پیاسا کنواں، مرمر کے صنم اور دوسرا مرد ''آہنگ'' میں شامل اہم افسانے ہیں۔ فنکاری، مصوری اور سائنسی رجحان کے باعث رفیعہ کے افسانوں میں گہرائی و گیرائی در آئی ہے۔ انھوں نے سماج کے سلگتے ہوئے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔

''چھس'' ایک اہم افسانہ ہے جس میں مصنفہ نے ایک بچے کی نفسیات کو پیش کیا ہے۔ ''غنی'' اس افسانے کا ایک اہم کردار ہے، اس کی ماں کھانا بناتے ہوئے جل کر مرجاتی ہے۔ غنی کا باپ افضل اپنی بیوی کو بچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن نہیں بچا پاتا۔ آہستہ آہستہ یہ افواہ عام ہو جاتی ہے کہ افضل نے ہی اپنی بیوی کو جلا دیا اور یہ بات غنی کے کچے ذہن میں محفوظ ہو جاتی ہے اور وہ اپنے والد سے اندر ہی اندر نفرت کرنے لگتا ہے۔ کئی سالوں کے بعد بھی غنی کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مدھیہ پردیش کی جس فیکٹری میں افضل کام کرتا ہے وہاں وہ غنی کو بھی اپنے ساتھ لیجاتا ہے۔ یہاں غنی اسٹول پر بیٹھا پلانٹ کا آتشیں تانڈو رقص دیکھا کرتا تھا جہاں پگھلا ہوا سیال لاوا سانچوں میں پہنچ کر ستونوں کی شکل اختیار کرتا، ایک دن اس سے پہلے کہ کٹھالی اپنا پگھلا ہوا آتشی سیال لاوا مقررہ مقام پر انڈیلتی غنی کے بچکانی ہاتھوں نے افضل کو دھکا دیا، نتیجتاً ایک مدھم سی آواز چھس کے ساتھ افضل کا جسد خاکی آتش سیال میں حلول کر گیا اس طرح غنی کی نفرت انجام کو پہنچی۔ اس افسانے میں کم سن بچے کی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے۔ مصنفہ نے ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ

کے حوالے سے لاشعوری طور پر لڑکے کا باپ کے مقابلہ میں ماں کی طرف جھکاؤ کو اوڈی پس کامپلکس (Oedipus Complex) قرار دیا ہے۔ افسانہ نگار کو اپنی طرف سے اس وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ قاری کو سوچنے ورنتائج اخذ کرنے کا موقع دیا جانا چاہیے تھا۔ رفیعہ منظور الامین کا دوسرا اہم افسانہ ''چادر '' ہے۔ جس کا اہم کردار ''بسنتی'' ہے، جو جھجریا گاؤں میں پھلکاری چادر بناتی ہے۔ بسنتی کی دیدی بھی پھلکاری کشیدہ کرتی تھی۔ بسنتی نے تیزی سے چلتی ہوئی انگلیوں سے کتنے ہی میز پوش، تکیوں کے غلاف اور چادریں کاڑھ کر بیچے۔ گاؤں کی دوسری لڑکیاں بھی یہ کام انجام دیتی تھیں، مگر بسنتی اس میں مہارت رکھتی تھی۔ شہر سے بیوپاری آ کر ان چیزوں کو خرید کر لے جاتے۔ ایک دن ایک گاہک نے کلاوتی کے پھلکاری کے کام میں میخ نکالے پھر یہ گاہک اچھے پھلکاری کی تلاش میں بسنتی کے گھر پہنچتا ہے، جہاں اسے بسنتی کی وہ چادر پسند آ جاتی ہے جو اس نے بیچنے کیلئے نہیں بنائی تھی۔ جب گاہک اس چادر کو لے کر اس پر ہاتھ پھیرتا ہے تو بسنتی کو وہ ہاتھ اپنے بدن پر سرسراتے ہوئے محسوس ہوا۔ اس کو ایک اجنبی کا اپنی کوری چادر کو چھونا برا لگا بسنتی نے گاہک کو اپنی چادر دینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ سسرال جاتے وقت دیدی اپنی چادر اپنے ساتھ لے گئی تھی اور بہت سی لڑکیاں بھی اپنی چادر اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ اجنبی نے کہا ایک مہینہ بعد آ ؤں گا چادر کو سنبھالے رکھنا۔ گاہک کا پل بھر کا دیا تیقن بسنتی کی زندگی کا سب سے بڑا آسرا بن گیا۔ اس دوران الیکشن کے ہنگاموں میں بسنتی اپنا سب کچھ لٹا بیٹھتی ہے۔ اس کی قسمت کے ساتھ گاؤں والوں نے بھی اس سے ناتا توڑ لیا تھا۔ گاہک جب وعدہ کے مطابق ایک مہینہ بعد آتا ہے تو بسنتی کہتی ہے کہ ''لے جاؤ اپنی چادر، تم جیسی چھوڑ گئے تھے ویسی ہی ہے۔ میں وہ نہیں رہی، تم نے سب کچھ سن لیا ہوگا۔ اب چلے جاؤ'' مگر وہ نہیں گیا۔ اس نے کہا ''یہ چادر ادھوری ہے، یہ چادر تیرے ساتھ ہی جائے گی''۔ اس نے چادر اوڑھائی اور بسنتی کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ کہانی المیہ پر ختم ہو سکتی تھی جیسا کہ میں نے ابتداء میں کہا ہے کہ مصنفہ زندگی کی تصویر جوں کی توں کھینچنے کے بجائے تبدیلی کی خواہاں ہیں۔ نیز اس افسانے کے ذریعہ انھوں نے بسنتی جیسی مظلوم عورتوں کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے پیام دیا ہے کہ وہ بعض امور میں مغربی عورتوں کا تتبع کریں۔ افسانہ نگار کے یہ الفاظ بڑے فکر انگیز ہیں۔ ''عورت کی عزت، کانچ کا محل ہے، جب تک رہا جگمگاتا رہا، ٹوٹا تو چکنا چور ہو گیا۔ وہ دن کب آئے گا جب عورت کی عزت مرد کے رحم و کرم کے تابع نہیں ہوگی۔ مغرب میں جب عورت کی عصمت لوٹی

جاتی ہے وہ زندہ درگور نہیں ہوتی۔ دھڑلے سے سر اونچا کیے سماج کو تجل کرتی پھرتی ہے تو پھر میری عورت میرے مشرق کی عورت Complex کا شکار کیوں ہے۔ کیوں نہیں وہ پیانے توڑ دیتی جو اسے محض عورت بنائے رکھتے ہیں۔ انسان کا درجہ کبھی نہیں دیتے''۔

''بختاور'' ایک اور کہانی ہے جو نوابوں کی عیش و عشرت کی زندگی کی پردہ دری کرتی ہے۔ یہ خاندان نواب وقار جنگ ان کی خاندانی بیوی پاشا، ان کا ایک لڑکا (جو امریکہ میں زیر تعلیم ہے) اور ایک لڑکی تہذیب پر مشتمل تھا۔ ملازموں میں مغلانی ظہور بی، پاشا کے جہیز میں آئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور ملازمہ بھی تھی۔ بختاور کے ماں باپ کون تھے کچھ پتا نہیں تھا۔ جب وہ چار مہینے کی تھی تو اس کی ماں نے دیوڑھی میں آ کر اسے بیچ دیا تھا۔ تہذیب اور بختاور ایک ساتھ مل کر جوان ہوئے تھے۔ بختاور دیوڑھی میں پاشا کے پاؤں کی مالش کیا کرتی تھی۔ بڑی ہوئی تو نواب صاحب کا حقہ بھرنا، گل دانوں میں پھول سجانا اور تہذیب کے کمرے کی صفائی اور سجاوٹ اس کے ذمہ تھی۔ ظہور بی زمانہ شناس تھی اس نے بختاور کو حقہ بھر کر نواب صاحب کے پاس لے جانے سے منع کیا کیوں کہ یہ کام کریم بخش خدمت گار کا تھا ایک دن بختاور نواب صاحب کو پان دینے گئی تو گھر میں کسی کو نہ پا کر نواب صاحب نے بختاور کو جکڑ لیا۔ مگر اچانک پاشا کے وہاں پہنچنے پر بختاور کو چھٹکارا ملا۔ نواب صاحب غضب میں آگئے مگر بعد میں اقبال جرم کر لیا کہ بختاور کا کوئی قصور نہیں۔ دوسری بار بھی انھوں نے اپنا یہ جرم دہرایا اس وقت بھی پاشا وقت پر پہنچ گئیں اور بختاور کو نجات حاصل ہوئی۔ بختاور کی شادی نواب صاحب کے منیم سیف اللہ کے ساتھ خاموشی سے کر دی گئی۔

آہنگ میں شامل ایک اور اچھی کہانی ''نیل کنٹھ'' ہے۔ 'مایا' چودھری نند پرکاش گھرانے کی ساری ذمہ داریاں سنبھالی ہوئی تھی۔ وہ چودھری کی چھوٹی بہو یعنی اوم کی دلہن تھی۔ اوم دل پھینک اور آوارہ تھا۔ اوم کی نشاندہی پر چودھری نے مایا کا اوم سے رشتہ طے کیا اور شادی کے بعد اوم کی آوارگی کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اوم کے بڑے بھائی کی لڑکی کنچن اور لڑکا تمک تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ تھوڑے دنوں بعد ہی اوم اپنے پرانے راستے پر ہو لیا۔ اب اس کے لیے مایا میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ پٹائی کا سلسلہ شروع ہوا اور گھر کے باہر ہر رات گذارنے لگا۔ دادی اور بڑی بھابی مایا ہی کو الزام دینے لگے یہاں تک کہ اوم مر گیا۔ ''اب مایا گھر کی وہ کھونٹی تھی جس پر گھر کا ہر فرد اپنا بوجھ ٹانگ دیتا تھا۔ اب مایا کو سانس لینے کو بھی فرصت نہیں تھی۔ گھر

میں بڑے بھائی کے لڑکے تلک کے سوا مایا کا کوئی ہمدرد نہیں تھا۔ ایک دن بڑے بھائی کے دور کا رشتہ دار روی کانت جو لکچرر تھا مہمان بن کر آیا، جس کی بیوی نے اسے تیاگ دیا تھا۔ دادی نے اسے دوسری شادی کا مشورہ دیا اور کہا ''لنڈورا مرد اچھا نہیں لگتا'' وہ مایا کو دیکھ کر کہا کرتی ''بڑی غیرت والی ہوتی ہیں وہ عورتیں جو پتی کی موت پر ہنستے ہنستے اس کی چتا پر بیٹھتی ہیں''۔ مایا نے نیل کنٹھ کی طرح زہر پینا سیکھ لیا تھا۔ ایک دن بڑے بھائی کی لڑکی کنچن گہنوں کے ڈبے کے ساتھ اپنے بوائے فرینڈ سریش کے ساتھ فرار ہو رہی تھی کہ مایا نے اس کے ہاتھوں سے زیورات کا ڈبہ چھین لیا۔ کنچن گھر لوٹ گئی مگر سریش نے مایا کو اپنی بانہوں میں لینے کی کوشش کی جس سے ڈبہ نیچے گر گیا۔ سریش دیوار پھاند کر رفو چکر ہو گیا۔ جس کے بعد یہ تاثر دیا گیا کہ مایا گہنے چرا کر سریش کے ساتھ فرار ہو رہی تھی۔ مایا کے پاس خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں تھا مگر تلک اپنے کمرے سے تماشا دیکھ رہا تھا۔ جب مایا پر ظلم بڑھنے لگا تو تلک نے حقیقت بیان کر دی۔ کہیں کنچن کا رشتہ ٹوٹ نہ جائے خاندانی افراد نے مایا کو اس کی ماں کے گھر بھجوانے کا فیصلہ کیا۔ تب تلک نے روی کانت کے کمرے میں پہنچ کر اس معاملہ میں دخل دینے کی خواہش کی وہ جانتا تھا کہ روی کانت مایا کیلئے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ تلک نے کہا کہ چاچی بے قصور ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ ان کا ہاتھ تھام لیں۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو زندگی بھر آپ کا ضمیر کچوکے لگاتا رہے گا۔ تب روی کانت نے دادی سے کہا کہ تم سب چاہتے تھے کہ میں شادی کر لوں تو مایا سے شادی کر رہا ہوں۔ تب بڑے بھیا نے اعتراض کیا کہ ''ہمارے پریوار میں آج تک ودھوا کی شادی نہیں ہوئی'' روی کانت جواب دیئے بغیر مایا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر باہر نکل گئے۔ اس کہانی میں بھی رفیعہ صاحبہ نے زندگی کو بدلنے کی اپنی روش برقرار رکھی ہے۔

کہانی کا عنوان ''نیل کنٹھ'' معنی خیز ہے۔ ہندو دھرم میں بھگوان شیو کو نیل کنٹھ کہا جاتا ہے جنھوں نے سارے جہاں کا زہر خود پی لیا اور نیل کنٹھ ہو گئے۔ مایا کے لیے نیل کنٹھ کا استعارہ لاجواب ہے۔ اس کہانی کے ذریعہ مصنفہ نے ودھوا کی شادی کی بھی وکالت کی ہے۔

رفیعہ منظور الامین نے ہر افسانے میں کسی نہ کسی خاص مسئلہ کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانے ''دوسرا مرد'' کا موضوع مصنوعی طریقہ تولید (Artificial Insemination) ہے۔ اسی طرح افسانہ ''سفر'' کا موضوع حق خودکشی (Aeuthanasia) ہے۔ ان کا ایک اور مشہور افسانہ ''مرمر کے صنم'' ہے،

جس میں ایک ہندوستانی مرد اور انگریز لڑکی کے درمیان ہوئی گفتگو سے دو تہذیبوں کے تصادم کا اندازہ ہوتا ہے۔ بجرے کا ملاح دگیر جب اس سے کہتا ہے کہ "ہم نے تمھیں اپنے ملک سے نکال پھینکا ہے" تو لڑکی کا جواب تھا "پھر بھی تم ہمیں اپنے سسٹم سے نہیں نکال پائے" بجرا جب آگے بڑھا تو دگیر نے چٹان کے چھجے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا وہاں سے "دو محبت کرنے والے کود پڑے پھر کبھی نہیں ابھرے" لڑکی نے فوراً کہا "ہمارے ملک میں محبت کرنے والوں کو جان دینی نہیں پڑتی"۔ اسی طرح ایک اور جگہ جنسی مجسمے اور شیولنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لڑکی نے کہا "تم لوگ مغرب کی جنسی بے راہ روی کو ٹوکتے ہو یہ سب کیا ہے" جب دگیر نے اس کے سامنے شادی کی پیش کش کی تو لڑکی نے کہا "پھر تم مجھ سے گوبر کے اپلے تھپوا نا روز مجھے پیٹا کرنا اور ہر سال بچہ جنوا دینا" اس سے ہندوستانیوں کے بارے میں انگریزوں کی رائے کا پتہ چلتا ہے۔

ان چند افسانوں کے مطالعے اور تجزیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رفیعہ منظور الامین کی کہانیوں میں بڑا تنوع ہے۔ تقریباً ہر کہانی قاری کو متاثر کرتی ہے۔ ان کہانیوں میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو قبول کرتے ہوئے ان سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب دی گئی ہے۔ سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ نفسیاتی حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ انھوں نے زندگی کی محرومیوں اور نا آسودگیوں کی عکاسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بہتر زندگی کی راہیں بھی تلاش کی ہیں۔ اسلوب کی شگفتگی اور فنکارانہ ہنر مندی سے افسانہ نویس کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی رفیعہ منظور الامین انسانی اقدار، شرافت، مشرقیت اور نسائیت کی علمبردار نظر آتی ہیں۔

●●

(اکتوبر 2010ء)

شعروسنگ : رزاق اثر

ڈاکٹر رزاق اثر شاہ آبادی کا دوسرا مجموعہ ''شعروسنگ'' پیش نظر ہے۔ ۱۹۹۰ء میں ان کا پہلا مجموعہ ''نسیم شب'' شائع ہو چکا ہے۔ ان دونوں مجموعوں کے مطالعہ سے ذہن میں یہ مسرت آمیز احساس جاگزیں ہو جاتا ہے کہ رزاق اثر کا فن بتدریج ارتقا کی منزلیں طئے کر رہا ہے اور ''شعروسنگ'' میں شامل کلام کلاسیکیت اور عصری شعور کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔ انھیں پیرایہ اظہار پر عبور حاصل ہے۔ اس حقیقت سے شاعر نا آشنا بھی نہیں۔

عجب سلیقہ اثر کو ہے شعر کہنے کا
ہر ایک حرف معانی جدید دیتا ہے

رزاق اثر نے مشاہدہ، شعور، تجربہ اور قوت متخیلہ کی صلاحیتوں کو حسب استعداد بروئے کار لایا ہے۔ جہاں یہ قوتیں یکجا ہوئی ہیں اعلیٰ درجے کے شعروں کی تخلیق ہوئی ہے اور جہاں انھوں نے ان قوتوں سے کام نہیں لیا۔ شعروں میں کیف آوری اور اثر انگیزی نسبتاً کم ہے۔

غزل جو شعریت، رمزیت اور نشتریت کی پہچان بن گئی ہے۔ رزاق اثر کی پسندیدہ صنف ہے۔ ابتدا سے آج تک غزل محبوب بھی رہی ہے اور معتوب بھی۔ مگر اسے یہ افتخار حاصل ہے کہ کڑی مخالف کے باوصف ہر دور میں اپنی نغمگی، لطافت، سادگی و پرکاری کے باعث نہ صرف زندہ رہی بلکہ اس کے مقبولیت میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا رہا۔ رزاق اثر نہ صرف اچھے غزل گو ہیں بلکہ معیار غزل کی برقراری و بلندی کے متمنی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

کچھ حسن تغزل ہے نہ مضمون ہے نہ بندش
معیار ادب سے بھی ہیں گرتی ہوئی غزلیں

غزل، رزاق اثر کے ہاں صنف سخن بھی ہے اور استعارہ بھی۔ ذیل کے شعر میں ایک خوش رنگ منظر کی عکاسی لطف دیتی ہے:

ساحل پہ سرِ شام ہیں بکھری ہوئی غزلیں
خوش رنگ لباسوں میں ہیں بھیگی ہوئی غزلیں

رزاق اثر کی غزلیں پامال مضامین سے مبرا اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ ادب سے زندگی کا جو رشتہ منقطع ہو گیا تھا، انہیں پھر سے جڑتا نظر آ رہا ہے:

زندگی سے جوڑیے رشتہ ادب کا اب نیا
گفتگو پھر ہو رہی ہے ناقدوں کے درمیان

رزاق اثر ترسیل کے بغیر ادب کی افادیت کے بھی قائل نظر نہیں آتے:

کرے ہے بات مذبذب عجیب لگتا ہے
جدید دور کا جیسے ادیب لگتا ہے

فنکار ذات کی تلاش میں مدت سے سرگرداں تو ہے مگر اس باب میں اسے اپنی کم مائیگی کا بھی احساس ہے:

مدت سے ہے تلاش میں اپنی ذات کی
قطرے کو دیکھیے کہ سمندر کی آس ہے

رزاق اثر کی غزلوں پر فیض، مخدوم اور ساحر کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ انھوں نے ان شعرا سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی راہ الگ بنانے کی سعی کی ہے جس کے باعث ان کی شاعری میں کہیں ندرت کا احساس ہوتا ہے تو کہیں پیش رو شاعر کے خیال کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔

مخدوم کا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے:

پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اترے ہیں پانی میں نہانے

رزاق اثر نے اپنے دو شعروں میں اسی مضمون کو اس طرح باندھا ہے:

طوفان اٹھے گا پھر ہر موج بنے شعلہ
وہ حسن مجسم جب دریا میں اتر جائے

تیر رہے تھے شعلہ بدن کچھ
پانی میں اک آگ لگی تھی

دونوں شعر مخدوم ہی کے شعر سے مستفاد ہیں مگر اول الذکر اسلوب اور لفظ کے مناسب انتخاب کے باعث ممتاز ہے۔

ڈاکٹر رزاق اثر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ کبھی کبھار خاص موقعوں پر نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ زیر نظر مجموعے کی نظموں کے ذریعہ مہاتما گاندھی، بابا صاحب امبیڈکر اور اندرا گاندھی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے جنگ و امن، خاندانی منصوبہ بندی اور قومی یکجہتی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ دیگر نظموں میں ''آدمی''، ''ماں'' اور ''اندیشہ'' متاثر کن ہیں۔ مختصر نظموں میں ''شب خون'' اچھا تاثر چھوڑتی ہے۔

آدمی نظم (خاموش ہوگیا ہے آدمی بولتا ہوا) شاہ آباد کے کہنہ مشق و ممتاز شاعر صابر شاہ آبادی کی نہ صرف یاد دلاتی ہے بلکہ وہ انکی روئیداد حیات بھی ہے:

گزری تمام عمر ہے فکر معاش میں
جیا رہا مگر وہ سحر کی تلاش میں
کانٹوں کی رہ گزر تھی وہ چلتا رہا مگر
قسطوں میں جل کے روز پگھلتا رہا مگر

ڈاکٹر رزاق اثر تیس برسوں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کے طرز نگارش میں تازگی ہے اور لہجے میں بے باکی پائی جاتی ہے۔ ''شعر و سنگ'' میں شامل غزلیں و نظمیں ۱۳۱ صفحات پر محیط ہیں۔ میرا یہ احساس ہے کہ اس مجموعہ کا اور کڑا انتخاب ممکن تھا۔ اس کے باوصف ان کے مجموعہ کلام میں کئی دلآویز شعر ان کے ذہنی سفر کے ارتقا کا پتہ دیتے ہیں:

قدم قدم پر نوازشیں ہیں، تمام تیری عنایتیں ہیں
کرم کا سر پر سحاب رکھنا، روش روش پر گلاب رکھنا

تیری جستجو مری زندگی تری گفتگو مری بندگی
تجھے پالیا تو سنور گیا، تجھے کھودیا تو بکھر گیا

سب کے چہرے ایک جیسے ہیں یہاں
بے ضمیروں کی مجھے پہچان دے

کبھی کبھی تو یہ صدیوں میں طے نہیں ہوتا
وہ فاصلہ کہ جو بے حد قریب لگتا ہے

چھوٹی بحر میں سادگی و پُرکاری کی مثال بھی دیکھئے:

ہے قصیدہ کہ مرثیہ بابا
آدمی بن گیا خدا بابا

تنقید مُردوں پر نہ کر
زندوں کا لکھ اب مرثیہ

نعش ملی گھر کے اندر
قاتل پُر اسرار ہے کیا؟

رزاق اثر کے پہلے شعری مجموعے "نسیم شب" کی طرح دوسرے مجموعے کا نام "شعر و سنگ" بھی چونکا دینے والا ہے۔ جو نہ صرف دعوت فکر دیتا ہے بلکہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ شاعری زندگی سے مربوط ہے۔ زندگی جو کہ لطیف بھی ہے کثیف بھی۔ شعر بھی ہے سنگ بھی۔ پھول بھی ہے تیشہ بھی۔ اسی عرفان کے باعث شاعر نے نغمگی و تغزل کا دامن تھامے زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

●●

(فروری 1997ء)

نوائے باطن : خلش رفاعی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ راقم السطور ایک مختصر عرصے کے لیے (جولائی 57ء تا نومبر 58ء) اردو ادب کے اولین گہوارے، بیجاپور میں تھا۔ ان دنوں نصرتی وشاہی کے اس دیار میں زبان وادب پر طاری جمود کو توڑنے کیلئے مقامی "انجمن ترقی اردو" سرگرم عمل تھی۔ جناب قاضی سراج الدین تالی کوٹ اور جناب معین الدین خطیب علی الترتیب انجمن کے صدر اور معتمد تھے۔ پرنسپل عبدالرحیم خطیب، جناب ایم ایم خان، جناب حبیب الدین بخشی، جناب بالسنگ استاد، جناب محبوب عباس بھنڈاری، جناب صمصام الدین فاروقی، جناب عبدالغنی مجاہد، جناب ابراہیم گوگی، جناب جی ایم انڈیکر، حضرت سید شاہ مصطفیٰ حسینی العلوی ہاشمی اور دیگر اصحاب ذوق اس انجمن کی محفلوں میں شرکت فرما کر نوخیز ادیبوں وشاعروں کی حوصلہ افزائی کرتے۔ جناب خلش رفاعی سے میری پہلی ملاقات بھی انجمن ہی کی ایک ادبی محفل میں ہوئی جس میں وہ اپنے خاص ترنم سے غزل سرا تھے۔ بے ریش وبروت، جواں سال، مرنجان مرنج، ایک دھان پان سی شخصیت کا سامنا ہوا۔ ان کی انکساری اور وضع داری نے متاثر کیا۔ جب بھی ملتے نہایت مروت ومحبت سے پیش آتے۔ ان سے ملاقاتوں کی لذت وحلاوت آج بھی دل میں محسوس کرتا ہوں۔

ابتدائی ضروری تعلیم کے بعد 1942ء میں جب انھوں نے درس وتدریس کو وسیلہ روزگار بنایا تو ملک میں تحریک آزادی عروج پر تھی۔ "انگریز ہندوستان چھوڑ دو" کے فلک شگاف نعروں سے انگریز سامراجیت کے ایوان دہل رہے تھے۔ (یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ ان کے دوسرے شعری مجموعے "نوائے باطن" کی رسم اجراء آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر انجام دی جارہی ہے) درس وتدریس کے پیشہ سے ذاتی دلچسپی وشغف کے باعث انھوں نے تربیت حاصل کرنے کے لیے اردو ٹیچرس ٹریننگ کالج پونا میں داخلہ لیا۔ تربیت کے دوران میں پروفیسر دستگیر شہاب، ڈاکٹر امانت اور عبدالرحمٰن خیال کی صحبتوں سے فیضیاب ہوئے۔ ابتداے ہوشمندی وعنفوان شباب ہی سے مزاج عاشقانہ پایا تھا۔ پونا کا علمی وادبی ماحول بھی انھیں راس آیا۔ یہاں اُن کے پوشیدہ جوہر کھلے اور شعری صلاحیتوں کو فروغ پانے کا موقع ملا۔ اسی زمانے

میں انھوں نے علوم باطنی کی تحصیل میں دلچسپی لی۔ اپنے دوست خیال شہابی کے ساتھ سلسلہ رفاعیہ کے بزرگ حضرت ہدایت علی شاہ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ تربیت کے اختتام پر جب بیجاپور لوٹے تو خلش بیجاپوری سے خلش رفائی اور کچھ عرصے بعد حضرت شیخ عبدالکریم شاہ خلش رفائی ہو گئے۔ 1942ء تا 1946ء تقریباً نصف صدی تک انھوں نے پند و نصائح، ذکر و اذکار کے ساتھ شعر گوئی کو بھی جاری رکھا۔ لیکن اپنے دوسرے شعری مجموعے کی اشاعت میں خاصی تاخیر روا رکھی حالانکہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''گلدستہ خلش'' 58-1957ء ہی میں شائع ہو چکا تھا۔ خلش رفائی کی شاعری کا مرکزی موضوع تصوف ہے۔ جس کے تحت انھوں نے وحدت الوجود، عشق حقیقی اور باطنیت پر زور دیا ہے۔ تصوف کی پہلی کتاب ''کتاب اللمع'' میں کہا گیا ہے کہ ''دنیا میں ہر موجود کا ایک پہلو ظاہر ہے اور دوسرا باطن ہے۔ قرآن و سنت رسول ﷺ کے باطنی پہلو کا نام طریقت ہے، جو شریعت سے الگ کوئی شئے نہیں''۔ خلش رفائی کے ''نوائے باطن'' کا موضوع بھی یہی ہے۔ شاعر نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس مجموعے میں حمد، سلام اور مرثیہ کے علاوہ نعتیں، منقبتیں، آزاد نظمیں، غزلیں اور قطعات شامل ہیں۔ آخر میں سلسلہ قادریہ و رفاعیہ سے وابستہ شاعروں نے مرحوم کی شخصیت و فن کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس خصوص میں کہنہ مشق شاعر شکیل مظہری کا حسن بیان ہماری توجہ چاہتا ہے۔

نعتیں ہیں عقیدت کی کہانی دیکھو
غزلوں میں محبت کی جوانی دیکھو
قطعات میں ہیں رمز و کنایے کیا کیا
نظموں میں ہے کیا جلوہ بیانی دیکھو

نعت، فکر و خیال کے لحاظ سے پاکیزہ صنف ہے۔ اس میں کذب و دروغ اور تخیل و قیاس آرائی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جہاں یہ مقدس ترین صنف سخن ہے وہیں مشکل ترین بھی۔ عرفی نے کہا تھا:

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

نعت گوئی کے لیے حدود شریعت کی پاسداری لازم ہے۔ اس صنف کی نزاکتوں سے عہدہ برا

ہونے کے لیے نہ صرف محتاط فکر و تخیل اور مراتب شناسی کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ شاعر کو اس وادئ پر خار سے دامن بچا کر گزرنا پڑتا ہے۔ خلش رفاعی نے اس اہم صنف کی تمام تر خصوصیات اور آداب کو ملحوظ رکھا ہے۔ چند نعتیہ شعر ملاحظہ ہوں:

اک دست کرم دیر سے مائل بہ عطا ہے
اے دامنِ امید ترا حوصلہ کیا ہے

سوزش عشق مصطفیٰ ؐ سے خلشؔ
کتنی روشن ہے رہ گزر میری

وہی ہیں رحمت عالم ، وہی کرم گستر
عطائے احمد مرسل ہے کل جہاں کے لیے

قرآن ہے تفسیر، محمدؐ کے عمل کی
فرمان نبیؐ اصل میں فرمان خدا ہے

غزل آج بھی اردو کی سب سے زیادہ مقبول اور موثر صنف سخن ہے۔ خلش رفاعی نے بھی غزل میں اپنے دور کی روایت برقرار رکھتے ہوئے طرز ادا میں دلکشی و شگفتگی پیدا کی ہے۔ عشقیہ جذبات کی عکاسی، واردات قلبی کی تصویر کشی، تصوف کی چاشنی، ان کی غزلوں کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ بعض غزلوں میں سرمستی و سرشاری کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ آیئے ذیل میں درج ان اشعار کے کیف و سرور سے حظ اٹھائیں:

مدہوش جس سے سارا زمانہ ہوا خلشؔ
ساقی کہاں وہ ساغر نایاب لے گیا

اشکوں کو روک، خود ہی نہ غرقاب ہو کہیں
مژگاں کو کھول، شہر کو سیلاب لے گیا

اک خلش تھی جو دل سے نکل ہی گئی
ان سے نظریں ملیں، مٹ گئے سب گلے

کیسے پہنچوں میں تجھ تک کہ ہیں درمیاں

فاصلے، فاصلے، فاصلے، فاصلے

خلش نے جوش کے رنگ میں جو غزل کہی ہے، وہ بڑی مرصع ہے اور ہر شعر کیف سے مملو ہے:

حلقہ رند میں آمرو خدا ، جرم نہیں

جرم تو ہجر ہے، پیان وفا جرم نہیں

کوئی قندیل کلیسا ہو کہ ہو شمع حرم

جس سے مل جائے اندھیرے میں ضیا جرم نہیں

ایک اور غزل جس کے قافیے آئینہ، خدا، ابتدا وغیرہ ہیں اور ردیف ''ہوں میں'' ہے۔ بڑی پُر اثر ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں :

اب اپنے آپ کو حیرت سے دیکھتا ہوں میں

وہ میرا عکس ہے یا اس کا آئینہ ہوں میں

یہ کس مقام پہ اپنے آپ کو پارہا ہوں میں

کہیں پکار نہ اٹھوں کہ اب خدا ہوں میں

نہ سنگ میل، نہ منزل نہ کارواں نہ غبار

وفور شوق میں حد سے گزر گیا ہوں میں

دیگر غزلوں کے یہ شعر بھی بڑی جاذبیت رکھتے ہیں:

کوئی آہٹ ہے نہ سرگوشی نہ آواز کوئی

کتنا تنہا ہے یہ صحرائے وفا میرے بعد

کیا خبر تھی کہ میرے عشق کا چرچا ہوگا

اور تیرا نام، میرے نام سے رسوا ہوگا

ہم سے رندان بلا نوش کی خاطر ساقی

میکدے میں تیری آنکھوں کے سوا کیا ہوگا

یاد آگئیں کسی کی وہ کیف بار آنکھیں
ساغر کو دیکھ کر میں بے اختیار رویا

خلش نے اپنی نظموں میں بھی تصوف اور معرفت کے مضامین کو بڑے کیف و سرور کے ساتھ نظم کیا ہے۔ ان کی نظمیں بقول عنوان چشتی ''طالبان عشق کے اشتیاق کو مہمیز کرتی ہیں''۔ خاص طور پر ان کی نظمیں گنج اعظم، پردہ جنوں، لاکی موت، کاف سے نون کا وصل اور منہاج الصفا متاثر کرتی ہیں۔ جہاں تک منقبتوں کا تعلق ہے اس مجموعے میں سلسلہ رفاعیہ کے چار بزرگوں کے علاوہ پیران پیر حضرت غوث الاعظم اور گیارھویں صدی ہجری کے روحانی پیشوا قطب دکن حضرت سید شاہ ہاشم حسینی علوی المعروف بہ ہاشم پیر دستگیر بیجاپوری کی شان میں بھی ایک منقبت شامل ہے۔

خلش رفاعی کا یہ شعری مجموعہ بہ لحاظ کمیت مختصر سہی مگر بہ اعتبار کیفیت وقیع ہے۔ مضامین کی رنگارنگی اور شعری جذبات کا روحانی و جمالیاتی اظہار اسے دوسرے مجموعوں سے ممیز کرتا ہے۔ میں ''نوائے باطن'' کی اشاعت پر خلش رفاعی مرحوم کے خلف اکبر ڈاکٹر جاوید رفاعی کو مبارکباد دیتے ہوئے پرامید ہوں کہ علمی، ادبی اور مذہبی حلقوں میں اس شعری سوغات کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور قارئین اس سے استفادہ کریں گے۔ اس طرح شاعر کی یہ امید بھی برآئے گی۔

اس امید پہ جلتا ہوں سرِ شام خلش
میرے افکار سے ذہنوں میں سویرا ہوگا

خلش رفاعی آج ہم میں نہیں ہیں۔ انھوں نے ''نوائے باطن'' کو خود مرتب کیا تھا جو ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا۔ بعد از مرگ اس مجموعہ کی اشاعت سے ان کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ ہوگئی ہے۔ بقول حسرت موہانی:

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام

●●

(فبروری 1998ء)

ب ۔ زبان تعلیم وتدریس

ہندوی، ہندی، دکنی اور اردو ایک ہی زبان

میرے کرم فرما اور دوست ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے اپنا تحقیقی مقالہ ''حیدرآباد میں اردو کی ترقی، تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے'' اشاعت کے بعد بغرض مطالعہ میرے تفویض کیا تو گمان گزرا کہ یہ مقالہ بھی یونیورسٹی کے شعبہ جات اردو کے بیشتر مقالوں کی طرح ہوگا مگر جب پڑھنا شروع کیا تو حیرت آمیز مسرت سے دوچار ہوا۔ اس مقالے کو عام مقالوں سے بالکل مختلف اور منفرد پایا۔ یہ فاضلانہ مقالہ، معروضی انداز لئے ہوئے تحقیقی کام کرنے والوں کیلئے مشعل راہ ہے۔

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے اپنے دستاویزی مقالے میں جن اہم نکات پر بحث کی ہے ان میں دو نکات نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے کثیر تاریخی شواہد اور منطقی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ انیسویں صدی سے قبل اردو دکن کی کسی ریاست میں سرکاری منصب پر فائز نہیں رہی۔ دوسرا نکتہ یہ کہ فرشتہ کے مطابق ابراہیم عادل شاہ اول نے دفتر فارسی کو برطرف کرکے ہندوی کردیا تھا اور یہ ہندوی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی رائے میں غیر فارسی زبان مراٹھی ہوسکتی ہے۔ اول الذکر نکتہ میرے آج کے عنوان سے مطابقت نہیں رکھتا البتہ دوسرے مفروضے پر بین السطور میں اپنی رائے کا اظہار کررہا ہوں۔

زبانیں اچانک وجود میں نہیں آتیں۔ ان کا ارتقاء ہوتا ہے گویا زبانیں زماں کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہیں، سماجی و عوامی ضرورتوں اور تہذیبی تقاضوں کے زیر اثر وہ بنتی، بگڑتی اور سنورتی ہیں۔ جس زبان کو آج ہم اردو کہتے ہیں اگرچہ کہ وہ 1100ء میں پیدا ہوئی مگر اس کا نام اردو سات سو برسوں بعد ظہور میں آیا۔ ممتاز محقق و ناقد جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے اس ادعا کو قبول کرنے میں ذرا بھر بھی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ ''جس زبان کو آج ہم اردو کہتے ہیں پرانے زمانے میں اسی زبان کو ہندوی، ہندی، دہلوی، گجری، دکنی اور پھر ریختہ کہا گیا ہے''۔ اردو کو اپنی غیر ترقی یافتہ شکل میں ملک کے مختلف حصوں میں مختلف نام دیے گئے۔ جب ابتدائی اردو، گنگا کے میدان (Ganges Plains) سے مختلف سمتوں میں پھیلنا شروع ہوئی تو اس کے مختلف نام بھی ہوئے۔ اس کا کوئی مخصوص علاقہ نہ رہا نہ ہی کوئی مخصوص طبقہ بولتا رہا اس لیے الگ الگ علاقوں

میں مختلف نام ہوے۔ کہیں وہ ہندوی اور ہندی کے نام سے موسوم ہوئی تو کہیں اسے سلیمانی اور مورس بھی کہا گیا۔ تلگو بولنے والوں نے اسے ترک ماتا کہا تو کرناٹکا میں اسے ترک بھاشا کہتے ہیں۔ دہلی چونکہ اردو کا پہلا مرکز تھا اس لیے وہاں اسے زبان دہلوی کہا گیا۔ یو پی اور راجستھان پہنچی اور لوگوں نے اسے اپنایا تو وہ گجری یا گورجری Gorjari کے نام سے موسوم ہوئی۔ جب اس نے نربدا پار کیا اور جنوب میں عام طور پر بولی جانے لگی تو خاص طور پر موجودہ مہاراشٹرا، آندھرا پردیش، کرناٹکا اور تامل ناڈو میں اس کا نام دکنی ہوگیا۔ ممتاز ماہر آثار قدیمہ و محقق جناب سید مجیب الرحمٰن نے اپنے ایک مضمون میں دکنی کے آغاز کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔ ''مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد مشرقی پنجاب، دلی اور میرٹھ اور اسی طرح دیوگری، گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر وغیرہ میں بولی جانے والی مقامی اپ بھرنش بھاشاؤں میں فارسی، عربی اور ترکی زبان کے الفاظ کی آمیزش ہونے لگی تو ہندوستانی لسانیاتی افق میں بڑی وسعت پیدا ہوئی اور ایک ایسی زبان وجود میں آئی جس کی کھڑکیاں اور دروازے باہر سے آنے والوں کی زبانوں کے الفاظ کے داخلے کے لیے کھل گئے اور یہی زبان دکنی تھی''۔

دکن میں داخلے کے بعد یہ آریائی زبان مرہٹی اور دراوڑی زبانوں تلگو اور کنڑا بولنے والوں میں مقبول ہوگئی بالآخر مقامی زبانوں پر اس کو ترجیح دی گئی۔ اس کی اخذ و جذب کی خاصیت نے آریائی دراوڑی، ٹیوٹنک (Tutanic) اور ہند المانی (Indo German) الفاظ کو جذب کرلیا۔ دکنی کی اس خصوصیت نے اسے احمد نگر، بیجاپور، برار، خاندیش، بیدر، گلبرگہ، گوگی، کڑپہ، کرنول، گولکنڈہ، ویلور، مدراس، بودھن، چن پٹن اور میسور میں مقبول بنادیا۔ ان علاقوں میں یہ زبان آج بھی بولی جاتی ہے۔ دکن نے اس زبان کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو کا پہلا دیوان یہاں مرتب ہوا۔ اردو نثر کی پہلی کتاب یہاں لکھی گئی۔ یہ زبان عادل شاہی و قطب شاہی دور میں دفتری زبان رہی ہو کہ نہیں، درباروں میں مستعمل ہوئی اور اثر و رسوخ حاصل کیا۔ بازاروں میں چلن عام تھا۔ عوام کی پسندیدہ بولی تھی، بیشتر ادبا و شعرا نے اسے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ صوفیوں اور سنتوں نے اپنے ارادت مندوں کی تعلیم و تبلیغ کے لیے اس کا سہارا لیا۔

''اردوے قدیم'' کی اصطلاح آج اپنی معنویت کھوچکی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ ہم اسے ''ابتدائی اردو'' کہیں جس کا جنم امیر خسرو یا ان سے قبل مسعود سعد سلمان لاہوری کے دور میں ہوا۔ امیر خسرو

(1253-1325) نے اپنی پہیلیوں کے علاوہ شعر گوئی کے لیے بھی ابتدائی اردو کا استعمال کیا جو ہندوی کہلائی۔ شمال میں ہندوی کا استعمال 18 ویں صدی عیسوی کے آخر تک بھی رہا۔ مصحفی کے دیوان اول 1785ء میں یہ شعر درج ہے:

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ
اب ہے اشعار ہندوی کا رواج

مسعود سعد سلمان لاہور (1046-1120ء) کا دیوان بھی ہندوی تھا۔ مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو کے درمیان جو زمانی فصل ہے وہ دو سو سال پر محیط ہے۔ ممتاز محقق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے امیر خسرو کی غیر فارسی زبان کو دہلوی ہندوی کہا ہے۔ جب ہم دہلی سے پھر دو سو سال کی زمانی مسافت طے کرتے ہوئے بیجاپور پہنچتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ اول نے دفتر فارسی کو برطرف کر کے جو ہندوی کر دیا تھا، وہ غیر فارسی زبان مرہٹی کیسے ہوسکتی ہے؟ عادل شاہی حکومت میں مرہٹی کے علاوہ کنڑا اور تلگو والے علاقے بھی تو شامل تھے۔ ہندوی ان علاقائی زبانوں سے بھی متاثر ہوئی۔ دراصل یہی زبان جو مختلف ادوار میں ہندوی، ہندی، دکنی اور ہندوستانی کہلائی اردو کی ابتدائی شکل ہے۔ ممتاز ماہر لسانیات پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کے ان الفاظ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

''دکن کے مسلم سلاطین مقامی مرہٹوں یا پھر کنڑا اور تلگو بولنے والوں کا اثر قبول کرتے ہوئے اپنی انفرادیت باقی رکھنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے شمالی ہند سے ساتھ لائی ہوئی ہندوستانی کو اپنایا جسے مقامی زبانوں نے قابل لحاظ حد تک متاثر کیا تھا''۔

ہمارے بہت سارے محققین کی بھی یہی رائے ہے کہ ہندوی، اردو ہی کی ایک صورت (From) ہے جس کا رسم الخط فارسی تھا۔ اس لیے یہ ادعا کہ ''ہندوی سے مراد غیر فارسی ازبان مرہٹی ہوسکتی ہے''۔ تحقیق مزید کے ذریعہ رد و قبول کا متقاضی ہے۔

جہاں تک دکنی کا تعلق ہے اس کا یہ نام بھی بہت زیادہ قدیم نہیں، نظامی، اشرف اور فیروز کی تصانیف میں لفظ دکنی کا استعمال نہیں ہوا۔ قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے قیام کے بعد ہی اس کا نام دکنی مروج ہوا۔ وجہی، ابن نشاطی، میراں ہاشمی اور رستمی وغیرہ نے اسے دکنی ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔ وجہی

نے سب سے پہلے قطب مشتری (1018ھ) میں اپنی زبان کو دکنی سے موسوم کیا۔ خاور نامہ کا مصنف رستمی کہتا ہے:

کیا ترجمہ دکھنی ہوا دل پذیر
بولیا معجزہ یوکمال خاں دبیر

ابن نشاطی کہتا ہے:

ایسے ہر کس کنیں سمجھا کو تو یوں بول
دکنی کے باتاں ساریاں کو کھول

مثنوی یوسف زلیخا کے شاعر ہاشمی کو بھی اصرار ہے:

تجھے چاکری کیا تو اپنچ بول
ترا شعر دکنی ہے دھنچ بول

اس طرح سترھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے تقریباً وسط تک دکن میں جو زبان بولی جاتی تھی اسے دکنی ہی کہتے تھے جب کہ شمال میں بولی جانے والی زبان کے لیے ایک عرصہ تک ریختہ اور ہندی دونوں ہی نام مستعمل ہوئے۔ انیسویں صدی کے وسط سے ہندی کو ریختہ پر ترجیح دی جانے لگی۔ اٹھارویں صدی میں بول چال کی زبان ریختہ تھی تو انیسویں صدی میں بول چال کی زبان کو ہندی کہا جاتا تھا۔ میر کا یہ شعر دیوان اول (1752) میں شامل ہے:

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

انیسویں صدی کے آخر تک ہندوی اور اردو دونوں ہی نام مروج رہے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک بھی لفظ ہندی کو اردو کے معنی میں استعمال کیا گیا۔ اسرار خودی میں علامہ اقبال کا یہ شعر توجہ چاہتا ہے:

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرز گفتار دری شیریں تر است

یہاں تک کے غالب اور سرسید کے دور میں بھی بعض وقت اسے ہندی کہا گیا۔ غالب نے ہندی

کے علاوہ اس زبان کے لیے ریختہ، اردو اور اردوے معلی کے نام بھی استعمال کیے۔

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

جہاں تک رسم الخط کا معاملہ ہے قدیم شمالی ہند میں ناگری رسم الخط صرف برہمن استعمال کرتے تھے۔ پندرھویں صدی سے جب کائستھ، برہمنوں سے علاحدہ ہوگئے تو انھوں نے اپنے لیے کیتھی رسم الخط ایجاد کیا جو ناگری پر مبنی تھا جو شمالی ہند میں 19 ویں صدی تک رائج رہا۔ ہندی ر ہندوی ر دہلوی کی خوش قسمتی تھی کہ اسے روز اول ہی سے فارسی رسم الخط بہم تھا۔ کیوں کہ سب سے پہلے اس زبان کا ادبی استعمال ان مسلمانوں نے کیا تھا جو صوفی تھے۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں انگریزوں نے مروجہ ہندی ر ہندوی ر ریختہ کو ہندوستانی کا نام دیا اور اسے مسلمانوں سے مختص کر دیا اور ہندی کے نام ہی سے ایک الگ طرح کی زبان کو ہندوؤں سے منسوب کر دیا اس طرح گلکرائسٹ اور فورٹ ولیم کالج نے 1800ء میں ہندی اور اردو کو دو علاحدہ زبانوں میں بدل دیا۔ ہندی اور ناگری رسم الخط کو فروغ دینے کے لیے ''ناگری پرچارنی سبھا'' کی بنیاد ڈالی اس طرح انگریز اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔

تاراچند نے اپنی مختصر کتاب The Problems of Hindustani میں فورٹ ولیم کالج کی سرگرمیوں کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

''ایک نئی طرح کی زبان وجود میں آئی جس میں فارسی کی جگہ سنسکرت الفاظ رکھ دیے گئے تھے۔ بادی النظر میں ایسا اس لیے کیا گیا کہ ہندوؤں کو اُن کی اپنی ایک زبان مہیا کی جائے لیکن اس اقدام کے نتائج بہت دور تک گئے اور ہندوستان آج بھی زبانوں کی اس مصنوعی تقسیم کے باعث دکھ اٹھا رہا ہے''۔ تاراچند کے بعد ایک اور ذی ہوش اور غیر متعصب ماہر لسانیات سنیتی کمار چٹرجی نے اپنے ایک رسالے میں ہندی کے بعض مبلغوں کے نعروں کی مذمت کرتے ہوئے انھیں ظلمت پسندانہ قرار دیا۔ نعرہ یہ تھا ''ہند، ہندو اور ہندی یہ تینوں ہمارے لیے ایک ہیں''۔

یہ سچ ہے کہ ہمارے ملک کی عام زبان نہ ہندی ہے نہ اردو بلکہ ہندوستانی ہے، مہاتما گاندھی نے خواب دیکھا تھا کہ یہی زبان ہندوستانی ملک کی زبان بن جائے مگر ایسا نہیں ہوسکا۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو کیا یہ

ممکن نہیں کہ دستور کی مسلمہ یہ دونوں زبانیں اپنے طور سے آزادانہ طور پر فروغ پا سکیں۔ تعجب تو اس امر پر ہے کہ زبان کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ حال میں 1948ء میں پریم چند کے صاحبزادے امرت رائے نے اپنی کتاب "A house Divided: The Origin and Development of Hindi / Hindavi" میں کہا ہے کہ اٹھارھویں صدی میں پرانے زمانے کی اصلی ہندی یا ہندوی اس وقت اردو بن گئی جب کہ مسلمان حکمرانوں نے اپنے زمانے کی راج ہندی کی راہ سے ہٹ کر فارسی زدہ زبان اختیار کی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے امرت رائے کے اس نظریے کو تضادات سے پر قرار دیتے ہوئے بجا کہا ہے کہ اس کی بنیاد متعصبانہ ظن و تخمین پر ہے نہ کہ ٹھوس حقائق پر۔

بہر حال میرا یہ معروضہ ہے کہ اردو اور ہندی زبان کے ادب کو اگر ایک نہ بھی کر دیا جائے تو انھیں ایک دوسرے سے قریب تر لایا جائے فصل پر وصل پر کیوں ترجیح نہ دیں۔ زبانیں باہمی معرکہ آرائی کے لیے نہیں بلکہ اشتراک کے لیے وجود میں آتی ہیں۔

●●

(نومبر 2001ء)

کرناٹک میں اردو زبان کا ارتقا

کرناٹک جنوبی ہند کی ایک ریاست ہے۔ اس کا علاقہ شمال میں دریائے تنگ بھدرا سے لیکر جنوب میں دریائے کاویری تک پھیلا ہوا ہے۔ اس ریاست کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ اس سرزمین پر مسلمانوں کی آمد سے پہلے کئی ہندو خاندانوں کے راجاؤں نے حکومت کی ہے۔ جن کے عروج و زوال کے نقوش تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

۱۳۲۵ء میں علاء الدین خلجی کی فتوحات دکن سے مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ ۱۷۹۹ء میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی سلطنت خداداد کے خاتمہ تک یہ سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس دوران یہاں کی زبانوں، ان کے ادب اور تہذیب کو ترقی کرنے کے مواقع ملے۔ یہاں کی علاقائی زبان کنڑا ہے۔ اس کے علاوہ اردو، تامل، تلگو، ملیالم اور مرہٹی زبانیں بھی یہاں بولی جاتی ہیں۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست کرناٹک کی آبادی ۳ کروڑ ۷۱ لاکھ ۳۵ ہزار سات سو چودہ (3,71,35,714) اور اردو بولنے والوں کی تعداد 41,63,691 بتائی گئی تھی۔ ۱۹۹۱ء کے مردم شماری کے لحاظ سے کرناٹک کی آبادی ۵ کروڑ ۲۷ لاکھ تو اردو بولنے والوں کی تعداد 44,70,645 ظاہر کی گئی ہے۔ ہنوز 2011ء کی مردم شماری جاری ہے اب یہ تعداد 50 سے 55 لاکھ تک بڑھ جائے گی۔ ہماری ریاست دیگر اور ریاستوں کی طرح یک لسانی Mono Lingual نہیں ہے۔ ایک سے زیادہ زبانیں بولنے کی وجہ سے عملی طور پر اردو رابطے کی زبان کا کام انجام دیتی رہی ہے۔ اوردے گی خاص طور پر حیدرآباد کرناٹک کا علاقہ اردو کا علاقہ سمجھا جاتا ہے جہاں انضمام سے قبل اردو سرکاری زبان رہی ہے۔ ممبئی کرناٹک کے علاقے اور قدیم میسور کے علاقے میں بھی اردو بولنے والے قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد سارے کرناٹک کو ایک لسانی تنظیم کے تحت متحد کرنے کی تحریک چلی جو ۱۹۵۶ء کی لسانی تقسیم کے بعد میسور کے آٹھ اضلاع کے بجائے ۱۹ر اضلاع ہو گئے اور ۲۹ر ہزار مربع میل رقبہ کے بجائے ۷۳ر ہزار میل مربع کا وسیع رقبہ ہو گیا۔ آبادی کے اضافہ کے باعث اس وقت کرناٹک ۲۸ر اضلاع پر مشتمل ہے۔ یہ خطہ زمانہ دراز سے تہذیب و تمدن کا

گہوارہ رہا ہے یہاں سے علم وعمل کے سرچشمے پھوٹے۔ ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں جن پر ناز کیا جاسکتا ہے۔ عہد وسطی میں بھکتی نام کی تحریک اس خطہ سے انسانیت کا پیغام ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچایا۔ کتور کی رانی چنما۔ حیدرعلی خان اور ٹیپو سلطان شہید نے ملک کو اغیار کے پنجوں سے بچانے کی جو سعی کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔

کرناٹک میں اردو:

کرناٹک میں اردو کا ظہور کب ہوا؟ اردو زبان کی تشکیل، تعمیر ترقی وترویج کس طرح عمل میں آئی؟ ایک اہم سوال ہے۔ جس پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ جس زبان کو ہم اردو کہتے ہیں وہ جدید ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر چہ وہ ۱۱۰۰ء میں پیدا ہوئی مگر اس کا نام اردو ۷۰۰ برسوں بعد ظہور میں آیا۔ ابتداء میں اسے ہندوی اور ہندی ہی کہا گیا اس کا نام زبان دہلی یا دہلوی بھی رہا۔ لاہور میں لاہوری تو یوپی اور راجستھان میں گجری یا گورجری کے نام سے موسوم ہوئی جب اس نے نربدا پار کیا تو جنوب میں عام طور سے بولی جانے لگی۔ خاص طور پر موجودہ مہاراشٹر، آندھرا پردیش، کرناٹک اور تامل ناڈو میں اس کا نام ہندوی، ہندی، گجری یا دکنی رہا۔ ولی کے دور میں وہ ریختہ بھی کہلائی مگر آج وہ صرف اردو ہی ہے۔ محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ اور ملتان فتح کیا۔ مفتوحہ علاقے میں جو زبان بولی جاتی تھی وہ شورسینی اپ بھرنش اثرات رکھتی تھی۔ سندھ کو فتح کرنے والے لشکر میں فارسی وعربی بولنے والے لوگ شامل تھے تقریباً ۳۰۰ سال تک فاتحین کی زبانیں، تہذیب ومعاشرت یہاں کی تہذیب وزبان کو متاثر کرتی اور خود بھی متاثر ہوتی رہیں۔ گیارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں پہلے سبکتگین نے اور پھر محمود غزنوی نے شمال مغرب سے ہندوستان پر حملے کیے اور سندھ ملتان اور پنجاب سے لیکر میرٹھ اور نواح دہلی تک کے علاقوں کو اپنے قلمرو میں شامل کیا اور تقریباً پونے دوسو سال تک آل محمود یہاں حکومت کرتے رہے جب غوریوں نے غزنی پر قبضہ کر کے محمود کے جانشینوں کو نکال باہر کیا تو آل محمود نے پنجاب کو اپنا مستقر اور لاہور کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ علاءالدین خلجی نے ۱۳۱۵ء میں گجرات فتح کیا جو سو سال تک سلطنت دہلی میں شامل رہا۔ فتح گجرات کے بعد علاءالدین خلجی نے اپنے لشکر جرار کو دکن کی مہم پر روانہ کیا۔ جس نے سارے دکن و مالوہ کو فتح کر کے سلطنت دہلی میں شامل کیا۔ اس نے سارے علاقے کو سو سو مواضعات میں تقسیم کر کے انتظامی حلقے بنا دیے اور ہر حلقے پر ایک ترک افسر کو مقرر کیا۔ یہ ترک افسر امیر صدہ کہلاتے تھے۔ اس انتظامی ضرورت کے تحت بے شمار ترک خاندان اپنے

متوسلین کے ساتھ دکن میں آباد ہو گئے اور انھوں نے اظہار خیال کے لیے ایک مشترک زبان کو پروان چڑھایا۔

خلجیوں کے زوال کے بعد تغلقوں کی سلطنت قائم ہوئی اور محمد تغلق کا دور حکومت (۱۳۲۵۔ ۱۳۵۱ء) آیا اس بادشاہ نے ۱۳۲۷ء میں دولت آباد (دیوگری) کو پائے تخت بنایا۔ عام شہریوں اور فوجیوں کے ساتھ اولیائے کرام اور صوفیہ بھی دولت آباد چلے آئے۔ ان زاہدوں میں حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے والد حضرت سید یوسف حسینی راجو قتالؒ، حضرت امیر حسین سنجریؒ، شیخ زین العابدینؒ اور دیگر کئی بزرگان شامل تھے۔ ان بزرگوں نے عوام میں اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے مقامی زبان کا استعمال کیا۔ محمد تغلق نے بھی امیرانِ صدہ کے نظام کو باقی رکھا۔ کچھ عرصہ بعد امیرانِ صدہ نے محمد تغلق کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے سارے دکن پر قبضہ کرلیا۔ امیرانِ صدہ شمالی ترک ہونے کے باوجود خود کو دکنی کہنے پر فخر کرتے تھے۔ اور وہ جو زبان شمالی ہند سے ساتھ لائے تھے سرزمین دکن کے لسانی وتہذیبی اثرات قبول کرتی ہوئی آزادانہ طور پر نشو نما پاتی رہی یہی وہ زبان ہے جسے ہم دکنی اردو کہتے ہیں۔ بالآخر امیرانِ صدہ نے اپنے ایک امیر علاء الدین حسن کو ۱۳۴۷ء میں اپنا بادشاہ منتخب کیا جس نے سکندر ثانی علاء الدین حسن گنگو کا لقب اختیار کر کے گلبرگہ میں بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

بہمنی سلطنت میں اردو:

سلاطین بہمنیہ نے گلبرگہ میں ۱۳۴۷ء تا ۱۴۲۹ء اور بیدر میں ۱۴۲۴ء تا ۱۵۲۵ء حکومت کی۔

ان سلاطین کی سرپرستی سے دکنی زبان، بحر عرب سے خلیج بنگال تک پھیل گئی۔ گلبرگہ، بیدر، گوگی، گولکنڈہ، احمد نگر، قندھار، بیجاپور، بودھن، چن پٹن، میسور، کڑپہ، کرنول، ویلور، مدراس، اورنگ آباد اور برہان پور دکنی زبان اور ادب کے اہم مرکز بن گئے۔ چودھویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی عیسوی تک ۳۵۰ برس میں اس زبان کا دکن میں نشو نما ہوا۔ اب یہ بات پائے ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ گلبرگہ اور بیدر کا علاقہ ہی اردو ادب کا مولد ہے۔ جہاں اردو نثر و نظم کے اولین نمونے تحریر کیے گئے۔

سلاطین بہمنیہ میں بہ لحاظ علم ودانش فیروز شاہ کا پایہ نہایت بلند تھا وہ کئی زبانیں جانتا تھا فارسی کے

علاوہ دکنی میں شعر کہتا تھا۔ عروجی اور فیروزی تخلص کرتا تھا۔ دکنی کی یہ رباعی اس سے منسوب ہے۔

تجھ مکھ چندا جوت دے سارا جیوں تجھ کان پہ موتی جھمکے تارا جیوں
فیروزی عاشق کوں تک یک چاکن دے تج شوق ادھر لب اچھے شکر پارا جیوں

فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ ۱۴۰۰ء میں گلبرگہ تشریف لائے حضرت کا شمار دکنی کے اولین شاعروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے رباعیوں، راگ راگنیوں، لوریوں، گیتوں اور چکی ناموں کی صورت میں تصوف کے مسائل پیش کیے۔ حضرت نے اپنی ایک رباعی میں خدا سے قربت اور ہم آہنگی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

پانی میں نمک ڈال بساں دیکھنا اسے جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے
یوں گھولی خودی اپنی خدا ساتھ مصطفیٰ جب گھل گئی خودی تو خدا بولنا کسے

ابتدائی محققین نے بعض نثری رسائل حضرت سے منسوب کیے تھے مگر بعد کے محققین نے اس ادعا کو مشکوک قرار دے کر مسترد کر دیا ہے۔ جب پائے تخت گلبرگہ سے بیدر منتقل ہوا تو زبان و ادب کے شیدائی بیدر میں اکٹھا ہوئے۔ ایرانی شاعر شیخ آذری نے سلطان احمد شاہ بہمنی کے دور میں بہمنی خاندان کی منظوم تاریخ بہمن نامہ دکنی میں قلم بند کی تھی۔ فخر دین نظامی بھی سلطان احمد شاہ بہمنی کا درباری شاعر تھا۔ اس نے پندرھویں صدی کے آخر میں رومانی موضوع پر ایک مثنوی کدم راؤ پدم راؤ لکھی۔ اس مثنوی کو جمیل جالبی نے مرتب کر کے انجمن ترقی اردو پاکستان سے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا ہے۔ اس میں جملہ ۱۰۳۲ اشعار ہیں۔ یہ مثنوی ہندوستان کی اس تہذیب کی ترجمانی کرتی ہے جس کا خمیر دو قوموں کی روایات کے امتزاج سے اٹھا ہے۔ اس عہد کے دیگر شعراء میں ملا داودی، مشتاق، لطفی، محمود، فیروز اور اشرف اہمیت رکھتے ہیں۔ مشتاق محمد شاہ بہمنی متوفی ۱۴۸۲ء کے عہد کا شاعر ہے۔ اس نے دکنی میں قصائد اور غزلیں لکھیں۔ مشتاق کے ہمعصر لطفی نے بھی قصائد اور غزلیں لکھیں۔ ان دونوں کا ہم عصر فیروز تھا۔ ابراہیم قطب شاہ کی دعوت پر فیروز گولکنڈہ منتقل ہوا۔ گولکنڈہ کے ممتاز دکنی شعراء وجہی اور ابن نشاطی نے فیروز کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔ ابن نشاطی اس طرح خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

نیں وہ کیا کروں فیروز استاد
جو دیتے شاعری کا کچھ میرے داد

تازہ تحقیق ''انکشافات'' (محمد علی اثر) کے مطابق دکنی کے ممتاز مثنوی نگار غواصی کا وطن بھی بیدر ہی تھا۔ جسے دو مثنویوں ''سیف الملک وبدیع الجمال'' ''اور طوطی نامہ'' کی وجہ سے شہرت حاصل ہے۔

برید شاہی دور میں اردو:

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ آزاد سلطنتیں قائم ہوئیں جن میں دو برید شاہی اور عادل شاہی کا تعلق کرناٹک سے ہے۔ اکثر مورخین کی نظر میں برید شاہی سلطنت کی ابتدا ۱۴۹۲ء سے شمار کی جاتی ہے کیوں کہ بہمنیوں کے آخری بادشاہ محمود شاہ بہمنی ثانی اور کلیم شاہ بہمنی نہایت کمزور بادشاہ تھے۔ محمود شاہ بہمنی کے دور میں قاسم برید نے خودمختاری کا اعلان کیا مگر مصلحتاً محمود شاہ بہمنی کو برائے نام بادشاہ رکھا۔ ۱۵۰۴ء میں قاسم برید کی وفات ہوئی۔ اس کا جانشین امیر برید بھی کلیم اللہ شاہ بہمنی (جس نے ۱۵۲۵ء تک حکومت کی) کے عہد میں اپنے باپ ہی کی طرح اقتدار پر اثر انداز ہوا۔ آخری بادشاہ کلیم اللہ شاہ بہمنی کی وفات کے بعد برید شاہی حکمرانوں نے بے خوف وخطر بادشاہت کی۔ امیر برید نے ۱۵۴۲ء تک حکومت کی۔ اس کے بعد علی برید نے بیدر پر ۳۸ سال حکومت کی۔ اس خاندان کے بادشاہوں نے ۱۶۱۶ء تک حکومت کی۔ آخری بادشاہ مرزا علی تھا جس کی سلطنت محمد عادل شاہ کی فوج کشی کی وجہ سے باقی نہیں رہی۔ اس دور کے شعراء میں اشرفؔ، اور قریشیؔ بیدری کو امتیاز حاصل ہے۔ اشرفؔ نے ۱۵۰۳ء میں کربلا کے موضوع پر ایک مثنوی نوسرہار لکھی۔ اشرف کی یہ مثنوی دکنی زبان میں ہے۔ مگر اس نے اس زبان کو ہندوی کہا ہے۔ قریشیؔ بیدری کا نام محمد بن عیسیٰ خان تھا۔ نصیر الدین ہاشمی نے قریشیؔ کو امیر برید کے زمانے کا شاعر قرار دیا ہے۔ قریشی بیدری نے فارسی سے ترجمہ کر کے ایک مثنوی لکھی جو جنسیات پر پہلی مثنوی ہے۔

عادل شاہی دور میں اردو:

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد بیجاپور دکنی کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ سلسلہ بندہ نواز کے صوفی حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق نے بیجاپور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ دکنی نثر و نظم میں کئی رسائل ان کی یادگار ہیں۔ حضرت نے بھی اپنی زبان کو ہندوی کہا ہے۔ حضرت کے صاحبزادے برہان الدین جانم کا دکنی

رسالہ کلمۃ الحقائق ہی وہ مستند رسالہ ہے جسے اردو نثر کا اولین نمونہ سمجھا جاتا رہا لیکن تازہ ترین تحقیق کے مطابق اردو کی پہلی مستند نثری کتاب خیر البیان مصنفہ پیر روشان بایزید انصاری ۸۰ ۷ ھ ہے (تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک جلد دوم، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر سیدہ جعفر، ص ۳۲۵) حضرت برہان الدین کے فرزند حضرت امین الدین اعلیٰ نے بھی دکنی میں منظوم نثری رسائل مرتب کیے۔ عادل شاہی دور کے اہم شعراء میں ابرہیم عادل شاہ ثانی، عبدل (ابراھیم نامہ) مقیمی (چندر بدن ومہیار) صنعتی، حسن شوقی، ملک خوشنود (جنت سنگار) علی نامہ (تاریخ سکندری) ہاشمی (یوسف زلیخا) رستمی، نصرتی (گلشن عشق) مومن وغیرہ نے اپنی شعری تخلیقات سے اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا۔ اب دکنی شاعری مثنویوں تک محدود نہیں تھی وہ دیگر اصناف سخن مثلاً غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی میں طبع آزمائی کی جانے لگی تھی۔ سیوا گلبرگہ کا باشندہ تھا۔ وہ علی عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور منتقل ہوا۔ اس نے فارسی مثنوی روضۃ الشہدا کا اردو نظم میں ترجمہ کیا۔ حضرت محمود بحری، سترھویں صدی کے ممتاز صوفی شاعر تھے وہ گوگی تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ کے متوطن تھے۔ دکنی شاعری میں مثنوی من لگن مثنوی بنگاب نامہ اور غزلیات کا ایک دیوان ان کی یادگار ہیں۔ زوال سلطنت بیجاپور کے موقع پر رائچور میں صوفی بزرگ سید محمود نور دریاؒ نے دکنی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ گلبرگہ، بیدر اور رائچور ۱۶۸۶ء تک مملکت بیجاپور میں شامل رہے۔ عادل شاہی دور کو اس لیے بھی امتیاز حاصل ہے۔ کہ شاہی دفتروں کی زبان فارسی کے علاوہ ہندوی یعنی دکنی بھی تھی جس کی تصدیق تاریخ فرشتہ اور خافی خاں سے بھی ہوتی ہے۔

سلطنت خداداد میں اردو:

ایک اور سلطنت خداداد میں بھی دکنی اردو کو فروغ حاصل ہوا۔ یہ سلطنت ۱۷۶۱ء سے ۱۷۹۹ء تک قائم رہی۔ حیدر علی خاں بہادر کے ہاتھوں ۱۷۶۱ء میں سلطنت خداداد کی تاسیس ہوئی۔ حیدر علی اور ان کے فرزند ٹیپو کے عہد میں اس سلطنت کے حدود اربعہ موجودہ کرناٹک تک پھیل گئے تھے۔ اس سلطنت میں دکنی اردو کو ادبی زبان کی حیثیت سے عروج حاصل ہوا۔ سقوط عادل شاہی سلطنت کے بعد بیجاپور سے علماء اور صوفیہ کرام سلطنت خداداد کے پائے تخت سرنگا پٹم میں سکونت پذیر ہوئے اور اردو زبان کی ترقی میں حصہ لیا۔ حیدر علی کے عہد میں شاہ محمد صدر الدین کا نام پیش پیش ہے۔ من لگن، مراۃ الاذکار اور مصباح النور نامی

تین رسالے ان کی یادگار ہیں۔ محمد سعید مہکری جن کا تخلص عاصی تھا اس دور کے اہم شاعر تھے جن کا ۱۷۶۷ء میں انتقال ہوا۔ دیگر شعراء میں خیر اللہ قادری خادم، فضل اللہ فقیر، سید حسین علی شہباز، میر حسین علی، محمود خان شیرانی، محمد مخدوم شاکر اور شاہ کمال الدین کمال اہمیت کے حامل ہیں۔ ۱۷۸۲ء میں حیدر علی کی وفات کے بعد ٹیپو سلطان نے زمام حکومت سنبھالی تو دکنی اردو کی ترقی کے لیے زیادہ مواقع حاصل ہوئے۔ اس دور میں زین العابدین (فتح المجاہدین) حسن علی عزت (مفرح القلوب) طرب (فتح نامہ) محمد اسحاق (ریاض العارفین) زٹل (ہجو گو) اور نشانِ حیدری کے مصنف سید حسین کرمانی کو خصوصیت حاصل ہے۔

اس عہد میں میسور کی شاعری پر شمالی ہند کا رنگ غالب آ رہا تھا اور اردو عام طور پر مروج تھی۔ ٹیپو سلطان نے فوج کیلئے جو قواعد وضوابط بنائے اس میں اردو نغمے شامل تھے۔ اسی طرح شادی بیاہ کے لیے قانونچہ مرتب کیا اس میں بھی اردو گیت شامل تھے۔

ابتدائی اردو زبان کے بڑھنے، پھیلنے، پروان چڑھنے اور رابطے کی زبان اختیار کرنے میں کرناٹک کا بھی ایک اہم رول ہے۔ جہاں ۱۳۵۰ء تا ۱۷۹۹ء سلطنت بہمنیہ، عادل شاہیہ، برید شاہیہ اور سلطنت خداداد کے قیام استحکام اور اختتام تک یہ مشن جاری رہا۔ یقیناً اس دور کو ہم دکنی اردو کے فروغ کا سنہری دور کہہ سکتے ہیں۔ دکنی کے ممتاز شاعر صنعتی نے ۱۶۴۵ء میں مثنوی ''قصہ بے نظیر'' لکھی جس کے دو شعر ہیں۔ جن سے سترھویں صدی عیسوی کی فکر و اسلوب کا پتا چلتا ہے۔ یہ اشعار سخن کی تعریف میں ہیں۔

سخن کا عجب کچھ قوی باز ہے ازل تا ابد جس کوں پرواز ہے
عجب ہے سخن کا شجر سر بلند عجب ہے سخن کا سمندار جمند
سخن کا سدا سبز گلزار ہے سخن کا سدا گرم بازار ہے

آیئے ہم سب بھی کچھ کریں تا کہ سخن کا بازار گرم رہے۔ ●●

۱: احمد شاہ اوّل بہمنی کے دور میں دار السلطنت گلبرگہ سے بیدر کی منتقلی کی تاریخ کے بارے میں مورخین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ہارون خاں شیروانی، غلام یزدانی اور کے اے نیل کنٹھ شاستری علی الترتیب ۱۴۲۴ء، ۱۴۲۵ء اور ۱۴۲۹ء کے حق میں ہیں۔ مگر ۱۴۲۴ء پر بیشتر مورخین کا اتفاق ہے۔ (و۔ع)

(مارچ 2011ء)

میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع کے دور میں اُردو زبان و ادب کی ترقی

یوں تو ۱۷۲۴ء میں میر قمر الدین خان آصف جاہ اوّل نے اورنگ آباد میں آصفی حکومت قائم کی مگر ۱۷۷۰ء میں میر نظام علی خان کے دور میں حیدرآباد دارالحکومت قرار پایا۔ ۱۷۲۴ء تا ۱۹۴۸ء تقریباً سوا دوسو سال آصفی خاندان نے حکومت کی۔ آزادی سے پہلے ہمارے ملک میں تقریباً ۶۰۰ چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں ان میں کچھ خود مختار تھیں اور کچھ نیم خود مختار اور بہت سی ریاستوں کی حیثیت جاگیرداروں سے بڑھ کر نہیں تھی۔ ہندوستان کے ان خود مختار ریاستوں میں آبادی اور وسائل کے اعتبار سے ریاست حیدرآباد سب سے بڑی تھی۔ اس سلطنت کا رقبہ ایک لاکھ بیاسی ہزار چار سو (۱۸۲۴۰۰) مربع میل تھا۔ "۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق اُس کی آبادی 14036148 نفوس پر مشتمل تھی۔"[1]

نواب میر عثمان علی خان اپنے والد میر محبوب علی خان آصف ششم کے انتقال پر ۱۹ ستمبر ۱۹۱۱ء کو تخت نشین ہوئے انھوں نے ۳۷ برس حکومت کی اُن کے عہد حکومت میں ریاست حیدرآباد نے زبردست ترقی کی تلنگانہ کے علاوہ کرناٹک کے موجودہ اضلاع گلبرگہ، یادگیر، بیدر، رائچور، کپل اور مرٹھواڑہ کے اضلاع اورنگ آباد و عثمان آباد ریاست حیدرآباد میں شامل تھے۔ تعلیمی ترقی اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے سلسلے میں میر عثمان علی خان کے دور کو سنہری دور کہا جاتا ہے۔ میر عثمان علی خان غیر متعصب اور روادار حاکم تھے ہر مذہب کی خبر گیری اور دست گیری اُن کا شعار تھا وہ کہا کرتے تھے کہ "ہندو مسلم میری دو آنکھیں ہیں۔" آصف ہفتم کے دور میں مہاراجہ کشن پرشاد وزیر اعظم اور وینکٹ راما ریڈی کوتوال بلدہ کے عہدہ پر فائز تھے، جو مذہبی رواداری کی روشن مثال ہے۔ حکومت کی جانب سے مالی امداد علی گڈھ یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ بنارس یونیورسٹی کو بھی دی جاتی تھی۔ مسجدوں کے ساتھ ساتھ مندروں اور گردواروں کا بھی لحاظ رکھا جاتا رہا۔

ممتاز مورخ و سابق گورنر اُڑیسہ بشمبر ناتھ پانڈے نے HEH نواب میر عثمان علی خان پہلا یادگار لکچر دیتے ہوئے میر عثمان علی خان اور ان کے خاندان کی رواداری کو اس طرح سراہا تھا۔

There is reference to the many endowments made by the Nizams to hindu temples and sikh Gurudwaras notably Guru Gubind Singh's Temple. Hazoor Sahib at Nanded 2

ہندوستان کے نامور صحافی خوشونت سنگھ نے بھی ۲۱ رجولائی ۱۹۸۱ء کو حیدرآباد میں HEH نواب میر عثمان علی خان تیسرا یادگار لکچر دیتے ہوئے کہا تھا۔

Hyderabad in 7th Nizam's preiod was among the best, administrated states in the country. It was totally free of communal tension where Hindus & Muslims not only lived in peace and harmony but in closed friendship with each other, Much of this was due to the enlightened policies of Nizam and his ancestors. 3

ڈاکٹر میر داؤد اشرف بہ حیثیت مورخ و ادیب نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے نظام ہفتم کی فیاضی ،فراخ دلی اور رواداری سے متعلق ۲۰۰۹ء میں ایک کتاب حیدرآباد کی علمی فیض رسانی شائع کی ہے، جس کے مطابق آخری فرماں روا میر عثمان علی خاں کی جانب سے بلا تخصیص مذہب وملت ۱۲۵ اداروں کو مالی امداد منظور کی گئی تھی ان میں انڈین انسٹیوٹ آف سائنس بنگلور، اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن یونیورسٹی، بھنڈارکر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پونے، سری وی رامن کی قائم کردہ سائنس اکادمی، بنارس ہندو یونیورسٹی، شیواجی ہائی اسکول امراوتی، شیواجی ملٹری ہائی اسکول پونے اور حیدرآباد تلنگوا کیڈمی قابل ذکر ہیں۔

یہاں یہ ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے ہندوستان میں اردو کو دفتری زبان بنانے کا سہرا حیدرآباد کے سر نہیں ہے بلکہ یہ اعزاز شمال کی ایک چھوٹی سی ریاست جے پور کشن گڈھ کو حاصل تھا جہاں کے حکمران مہاراجہ رام سنگھ نے ۱۸۳۳ء میں اردو کو اپنی ریاست میں دفتری زبان قرار دیا تھا جبکہ ملک کی دیگر ریاستوں میں فارسی سرکاری زبان تھی۔ جے پور کشن گڈھ کے اس تجربے کے ۲۵ رسال تک بھی کسی مسلم حکمران نے مہاراجہ رام سنگھ کی پیروی نہیں کی۔ ریاست رام پور نے ۱۸۵۹ء میں اور ریاست ٹونک نے ۱۸۶۵ء میں فارسی کی جگہ اردو کو رائج کیا۔ جہاں تک ریاست حیدرآباد کا تعلق ہے، میر محبوب علی خان نظام ششم کے دور میں ۱۸۸۴ء میں اردو کو ریاست میں سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ میر عثمان علی خان نے تخت نشینی کے بعد ریاست کو سماجی اور معاشی طور پر مستحکم کرنے کی کوشش کی مگر انھیں جلد ہی احساس ہوا کہ قوم اور

ملک کی ترقی اور خوشحالی کا دارومدار تعلیمی اساس پر ہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے مدارس کی تعداد میں اضافہ فرمایا۔ اُس وقت مدرسہ دارالعلوم میں اردو اور نظام کالج میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ دارالعلوم کے طلبہ انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) اور بعض ذی اثر اصحاب، ریاست میں قیام یونیورسٹی کے لیے کوشاں تھے۔ دارالعلوم کے قدیم طلبہ نے اپنی ایک انجمن ۱۹۱۳ء میں قائم کی تھی۔ اس انجمن کے تحت اورنگ آباد حیدرآباد میں ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعے اردو ذریعہ تعلیم کی یونیورسٹی کے قیام پر زور دیا گیا۔ جامعہ کے قیام کے تعلق سے جب گرو دیوارابندر ناتھ ٹیگور کی رائے معلوم کی گئی تو انھوں نے اس خصوص میں اپنی رائے کا اس طرح اظہار کیا۔ "میں ایک زمانے سے اس روز کا انتظار کر رہا تھا جب ہماری تعلیم غیر زبان کی قید سے آزاد ہو کر فطری طور پر عوام الناس تک پہنچ جائے گی۔ مجھے اس امر کے معلوم ہونے سے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کی ریاست ایک ایسی یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے جس میں ذریعہ تعلیم اردو ہو۔" ۴

آندھراپردیش کے مجاہد آزادی، قلمکار، مورخ وسابق گورنر مدھیہ پردیش شری پٹابھائی ستیہ رامیا نے بھی خبردار کیا تھا۔ "اگر یہ تجربہ ناکام ہو جائے تو ہندوستانی زبانوں میں زبانوں کی تعلیم کی امیدیں ختم ہو جائیں گی۔ ۵

مجدد و مفکر شیخ جمال الدین افغانی، برطانوی رکن پارلیمنٹ ویلفرڈ اسکاون بلنٹ، مولوی عبدالحق، سر محمد اکبر حیدری اور سر راس مسعود وغیرہم چاہتے تھے کہ ایک ایسی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آئے جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہو۔ اس خصوص میں ۲۲ر اپریل ۱۹۱۷ء کو سر محمد اکبر حیدری نے ایک مدلل عرضداشت حضور نظام کی خدمت میں پیش کی جس کے نتیجے میں ۲۶ر اپریل ۱۹۱۷ء کو نظام حیدرآباد نے اپنی ۳۱ ویں سالگرہ کے موقع پر جامعہ کے قیام کی تجویز منظور فرمائی اور فرمان جاری کرتے ہوئے فرمایا۔ "اس یونیورسٹی کا اصل اُصول یہ ہونا چاہیے کہ اعلی تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو کو قرار دیا جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم بہ حیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔" فرمان کی اجرائی کے ساتھ ساتھ محکمہ تعلیم نے یونیورسٹی کے قیام کے لیے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ سب سے پہلے حسب ذیل گیارہ افراد پر مشتمل ایک نصابی کمیٹی تشکیل دی گئی۔

سر اکبر حیدری، سر راس مسعود، مسٹر ونکر، مولوی حمید الدین، مسٹر شوکر، فضل محمد خان، عبدالرحمن خان، قادر حسین، بابائے اردو مولوی عبدالحق، عبدالعزیز، سید محی الدین۔ اسی طرح ۲۲ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کو

قانون بنانے کے لیے چھ افراد پر مشتمل ایک اور کمیٹی قائم کی گئی جس نے یونیورسٹی کی ہیئت ترکیبی کا جائزہ لیتے ہوئے ضروری قوانین مرتب کیے۔ ۱۶؍جون ۱۹۱۹ء کو پروفیسر، ریڈرس اور لکچررس کے تقررات عمل میں آئے۔ بالآخر ۲۸؍اگست ۱۹۱۹ء کو سرکاری سطح پر بمقام آغاز منزل محلّہ توپ کا سانچہ جہاں (اسٹیٹ بینک قائم ہے) صبح دس بجے عثمانیہ یونیورسٹی کا افتتاح عمل میں آیا۔ معین امیر جامعہ (وائس چانسلر) نواب حیدر یار جنگ (محمد حبیب الرحمٰن شیروانی) نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔

۲۹؍اگست ۱۹۱۹ء سے کنگ کوٹھی کے قریب کرایہ کی عمارت میں باقاعدہ پڑھائی شروع کی ۱۹۱۸ء میں میٹرک کا پہلا امتحان ہوا اور ۱۹۲۳ء میں طلبہ نے بی اے کا پہلا امتحان دیا اسی سال اورنگ آباد، گلبرگہ اور ورنگل میں انٹرمیڈیٹ کالج قائم ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں انجینئرنگ کالج، میڈیکل کالج اور ٹریننگ کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ۴؍ڈسمبر ۱۹۳۹ء کو یونیورسٹی کیامپس میں آرٹس کالج کی ذاتی عمارت کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس موقع پر اعلیٰ حضرت نے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ فرمایا۔ ''اس جامعہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تعلیم اردو زبان کے ذریعے دی جاتی ہے جو ہندو اور مسلم اقوام کے میل جول اور آپس کے دوستانہ تعلقات سے پیدا ہوئی اور جو مساوی طور پر دونوں قوموں کی مشترکہ میراث ہے۔ اس عمارت کی طرزِ تعمیر میں اردو زبان کی طرح ہندو اور مسلمان قوموں کی کاریگری اور اُن کے تمدن اور تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے۔'' ۶

جامعہ عثمانیہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی کے تسلط کو روک کر ہندوستانی تہذیب وثقافت کو اُبھارا جائے۔ تاکہ جامعہ کے ذریعے ایک خاص ملی جلی تہذیب وثقافت کو فروغ دے سکیں۔ نصاب میں انگریزی کی لازمی شمولیت، جامعہ عثمانیہ کی ترقی اور اردو ذریعہ تعلیم کی کامیابی کی ضمانت ثابت ہوئی۔ یہاں کے فارغ التحصیل افراد کو ملک وبیرون ملک کارہائے نمایاں انجام دینے کا موقع ملا۔ بلاشبہ جامعہ کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام میر عثمان علی خان کا ایک عہد آفرین کارنامہ ہے۔ علی گڈھ کے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے سچ ہی تو کہا ہے۔ ''جو علی گڈھ نہ کرسکا وہ جامعہ عثمانیہ نے کیا۔''

پروفیسر یوسف سرمست اس باب میں یوں رقمطراز ہیں۔ ''ایک مقامی اور ملکی زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنا کر اعلیٰ حضرت نے وہ کام انجام دیا جس کا جواب ملنا مشکل ہے۔ وہ اس وجہ سے بھی سلطان العلوم کہلاتے ہیں کہ انھوں نے تعلیم اور ذریعہ معاش کو اس قدر ہم آہنگ کردیا تھا کہ اس دور کا نوجوان بے روزگاری

کی تنگی سے قطعی نا آشنا تھا۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی اُس وقت کی قائم کی جبکہ سارے ہندوستان میں یونیورسٹی کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔'' ے

۱۹۳۰ء میں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ قانون میں، ''قانون اور پیشہ قانون'' کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے یسرتیج بہادر سپرو نے فرمایا۔ ''میں پورے اذعان کے ساتھ کہتا ہوں کہ سارے ہند میں درست طور پر جامعاتی تعلیم کہیں دی جارہی ہے تو وہ صرف جامعہ عثمانیہ میں دی جارہی ہے۔ حیدرآباد میں جو یہ انقلاب کن تجربہ کیا جارہا ہے اس سے میں بہت خوش ہوں، مجھے کامل یقین ہے کہ یہ تجربہ آخر کامیاب ثابت ہوگا۔ ۸ ملک و بیرون ملک کے مدبرین اور ماہرین تعلیم نے جامعہ عثمانیہ کے تجربہ کو کامیاب قرار دیا ہے۔ یہ تجربہ یقیناً ناکام ہوتا اگر سلطان العلوم نظام ہفتم دارالترجمہ قائم نہ کرتے۔

دار الترجمہ کا قیام : چونکہ عثمانیہ یونیورسٹی میں نہ صرف فنون (آرٹس) بلکہ سائنس، کامرس، انجینئرنگ، میڈیسن، طب اور قانون کی تعلیم بھی اردو کے ذریعے دینے کا منصوبہ تھا۔ اس لیے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ علوم وفنون کی مختلف کتابیں اردو میں تیار کی جائیں اور دیگر زبانوں کی کتابوں کے تراجم بھی طلبہ کو پڑھائے جائیں۔ لہٰذا سر رشتہ تالیف و ترجمہ یعنی دارالترجمہ (Translation Bureau) وجود میں آیا۔ یونیورسٹی میں جماعتوں کے آغاز سے دو سال قبل ہی نظام حیدرآباد نے ۱۴ر اگست ۱۹۱۷ء کو ایک فرمان کے ذریعے دارالترجمہ قائم کرنے کی منظوری دی۔ ۷ار اگست ۱۹۱۷ء کو مولوی عبدالحق کی نگرانی میں نامپلی ریلوے اسٹیشن کے سامنے کی عمارت میں عارضی طور پر دارالترجمہ قائم کیا گیا۔ دارالترجمہ کے لیے اُن افراد کا انتخاب کیا گیا جو اپنے فن میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ تاریخ میں ہارون خان شیروانی، ہاشمی فرید آبادی، ابوالخیر مودودی، ریاضی میں قاضی محمد حسین، ڈاکٹر رضی الدین، سائنس میں چودھری برکت علی، پروفیسر عبدالرحمٰن خان، پروفیسر سعید الدین، فلسفہ میں عبدالماجد دریابادی، خلیفہ عبدالحکیم، عبدالباری ندوی، ولی الرحمٰن، میرولی الدین، سیاسیات میں قاضی تلمذ حسین، معاشیات میں محمد الیاس برنی، تاریخ اسلام میں عبدالحلیم شرر، عربی کے لیے عبداللہ عمادی کی خدمات حاصل کی گئیں۔

قانون کے مترجمین میں سید علی رضا، ڈاکٹر حمید اللہ مسعود علی اور میر محبوب علی شامل تھے۔ شعبۂ تعلیم میں سجاد مرزا، ملک سردار علی اور احمد علی خان نے بی ایڈ کے درجوں کی کتابیں اردو میں ترجمہ کیں۔

مولوی عبدالحق شعبہ اُردو کی صدارت پر فائز ہوئے تو محی الدین دارالترجمہ کے ناظم بنائے گئے۔ اُن کے بعد حمید انصاری پھر ایک کے بعد ایک دیگرے مولوی محمد عنایت اللہ، محمد الیاس برنی، ڈاکٹر نظام الدین اور آخر میں ایشورناتھ ٹوپانے دارالترجمہ کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

مجلس وضع اصطلاحات : اصطلاحات (Terminology) وضع کرنے کے لیے مجلس وضع اصطلاحات قائم کی گئی۔ سائنس اور ریاضی کے لیے ایک مجلس قائم ہوئی اور فنون (Arts) کے لیے دوسری، طب اور انجینئرنگ کے لیے علاحدہ علاحدہ مجلسیں قائم ہوئیں۔ ہر مجلس میں زبان وادب کے ماہرین شامل تھے۔ زبان کے نمائندوں میں مولوی وحید الدین سلیم، نواب حیدر یار جنگ (علی حیدر نظم طباطبائی) اور مرزا ہادی رسوا شریک تھے۔ مولوی عبداللہ عمادی (جو سولہ سال تک دارالترجمہ کے ناظم رہے) ناظم امور مذہبی کے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود کبھی کبھار ان مجلسوں میں شریک ہوئے۔ مجلس وضع اصطلاحات کے مزید دو عہدے مخصوص تھے، ایک ناظر مذہبی دوسرا ناظر ادبی، ان ناظرین کا یہ کام تھا کہ ترجمہ شدہ کتابوں کی مذہبی وادبی نقطہ نظر سے جانچ پڑتال کریں تا کہ ترجمہ اور اصطلاحات میں کوئی سقم نہ رہے۔ ابتداء میں حاجی صفی الدین صاحب ناظر مذہبی رہے، بعد ازاں مولوی عبداللہ عمادی نے اُن کی جگہ لی۔ نواب حیدر یار جنگ نظم طباطبائی پہلے ناظر ادبی رہے بعد میں شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ کتب کی ضرورت اور نوعیت کے اعتبار سے مترجمین کا تقرر ہوتا رہا اور اختتام تک مترجمین کی تعداد ۱۲۹ تک پہنچ گئی۔ دارالترجمہ سے شائع شدہ کتابوں کی تعداد ۵۰۰ سے زیادہ ہے۔ جہاں تک اصطلاحات کا تعلق ہے مجموعی طور پر آرٹس، سائنس، کامرس، قانون، انجینئرنگ اور میڈیسن کے لیے وضع کردہ اصطلاحات کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے۔ یہ تعداد مجلس وضع اصطلاحات کی تیس (۳۰) سالہ محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ دارالترجمہ کی اسی اہمیت کے پیش نظر ممتاز قانون داں، سیاسی مدبر و سابق گورنر مدراس، سرسی پی راما سوامی ائیر نے ۱۹۴۲ء میں جامعہ عثمانیہ کے کانوکیشن (جلسہ تقسیم اسناد) سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"دارالترجمہ، جامعہ عثمانیہ کی بنیاد ہے جس پر بالائی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔" 9

بلاشبہ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ نے ۱۹۱۷ء تا 1951ء نہایت عرق ریزی و جگر سوزی سے علم وادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اس دارالترجمہ کا وجود عملاً ۱۹۵۰ء میں ختم ہو چکا تھا لیکن باضابطہ طور پر

اس کا اختتام اُس وقت عمل میں آیا جس دن روزنامہ "رہنمائے دکن" (حیدرآباد) ۱۹ راگست ۱۹۵۵ء میں یہ خبر شائع ہوئی۔

"کل رات زبان اردو کی نایاب کتابوں کا ذخیرہ جل کر خاکستر ہو گیا، جبکہ دارالترجمہ کی عمارت کو آگ لگ گئی۔" ۱۹

اس ناخوش گوار حادثے کے باوصف ملک و بیرون ملک کے کتب خانوں میں دارالترجمہ کی نادر کتابیں موجود ہیں ان سے اہل علم استفادہ کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ان کتابوں کے فیض یافتہ اور جنھوں نے جامعہ عثمانیہ سے ڈگریاں حاصل کیں، بین قومی شہرت کے حامل ہیں۔ ان میں چند نام یہ ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ضیا الدین انصاری، ڈاکٹر میر ولی الدین، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، اختر حسن، پروفیسر سید محمد، خواجہ حمید الدین شاہد، ڈاکٹر حفیظ قتیل، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر جہاں بانو، سید عبدالقادر سروری، زینت ساجدہ، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، عبدالقیوم خان باقی، رائے جانکی پرشاد، عبدالقیوم خاں باقی، پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ، مخدوم محی الدین، سید اشفاق حسین، عاقل علی خان، شیخ جاوید، میر حسن، غلام دستگیر رشید، مرزا ظفر الحسن، عزیز احمد، سکندر علی وجد، یوسف ناظم، محمود علی خان میکش، ابراہیم جلیس، عابد علی خان، اکبر وفا قانی، حبیب اللہ رشدی، خورشید احمد جامی، محبوب حسین جگر، کنول پرشاد کنول، حبیب اللہ اوج، جلال الدین اشک، ڈاکٹر محشر عابدی، بدر شکیب، معین الدین قریشی، نظر حیدرآبادی وغیرہم۔

سائنس، انجینئرنگ، طب اور قانون کی تعلیم بھی اردو کے ذریعہ دی گئی۔ اردو کے ذریعہ جن طلبہ نے میڈیسن میں کامیابی حاصل کی اُن میں ڈاکٹر سید عبدالمنان، ڈاکٹر ابوالحسن، ڈاکٹر سید قاری عبدالباری، ڈاکٹر حیدر خاں، ڈاکٹر سکینہ الہام اور ڈاکٹر بہادر خان نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔

اس ۳۰ رسالہ دور کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے دکن کے اس علمی دور کا دنیا کے دیگر علمی ادوار سے اس طرح موازنہ کیا ہے۔

"احیائے علوم کے لیے جو کام آگسٹس نے روما میں، خلافت عباسیہ میں ہارون رشید و مامون الرشید نے اسپین (ہسپانیہ) میں عبدالرحمٰن ثالث نے، بکرماجیت اور اکبر نے ہندوستان میں الفریڈ نے انگلستان میں، پیٹرا

پیٹر اعظم اور کھترائن نے روس میں اور مت شی ہونے جاپان میں کیا وہی نظام آصفیہ نے اس ملک کے لیے کیا۔
نظام ہفتم کا یہ کارنامہ تاریخ میں ہمیشہ فخر و مباہات کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔" !!

عہد عثمانی کے کرناٹکی ادبا و شعرا :

جامعہ عثمانیہ کے فیض یافتہ اور حیدرآباد میں عارضی یا مستقل طور پر مقیم علم وادب کے متوالوں نے ادب کی مختلف اصناف میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اُن سب کا احاطہ تفصیل چاہتا ہے۔ یہاں صرف عہد عثمانی کے اُن ادبا و شعرا کا ذکر کیا جارہا ہے جو سابق ریاست حیدرآباد کے کرناٹکی اضلاع گلبرگہ، یادگیر، بیدر، رائچور اور کپل کے متوطن تھے یا پھر اپنی ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد کرناٹک کے اس علاقے میں زیادہ عرصے تک رہائش پذیر تھے۔

گلبرگہ میں عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج ۱۹۲۳ء میں قائم ہوا۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد طلبہ گریجویشن کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی کا رخ کرتے تھے۔ ۱۹۵۶ء کی لسانی تقسیم تک یہی صورتِ حال برقرار رہی۔ کرناٹکی عثمانین بھی حیدرآباد کی خوش گوار ادبی فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے بھی ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ پہلے اُن ادبا و شعرا کا ذکر کیا جارہا ہے جنھوں نے اپنی ملازمت کے دوران اس علاقے میں اپنی ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

ابتدا مرزا فرحت اللہ بیگ (۱۹۴۷ء ۔ ۱۸۸۳ء) سے کی جاتی ہے جو دہلی کے رہنے والے تھے۔ مگر سلطنتِ آصفیہ میں برسرکار تھے۔ موصوف ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۷ء، ۴ سال گلبرگہ میں سشن جج رہے۔ اردو کے ممتاز مزاح نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے سات (۷) مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اپنے اُستاد ڈپٹی نذیر احمد کا ایک طویل خاکہ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری زبانی کچھ ان کی زبانی بھی قلمبند فرمایا۔ ان کی خودنوشت، "میری داستان" ان کے انتقال کے بعد اُن کے صاحبزادے مرزا شرافت اللہ بیگ نے ۱۹۷۷ء میں شائع کی ہے، جس کے آخری باب میں گلبرگہ کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں محبوب گلشن میں مردانہ وزنانہ کلب انھوں نے ہی شروع کیے تھے۔ آج زنانہ کلب باقی نہیں رہا۔

محقق ونقاد تمکین کاظمی ۱۹۰۲ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ گلبرگہ کے محکمہ اول تعلق داری میں کچھ دن ملازمت کی انھیں تحقیق وتنقید کے علاوہ مزاح سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کی درجن بھر کتابیں شائع ہو چکی

ہیں۔جن میں قابل ذکر غنچہ تبسم، تذکرہ ریختی، مقدمہ فریاد داغ اور مومن قابل ذکر ہیں۔

ایک اور محقق و مترجم مبارز الدین رفعت ہیں جو ملک کی لسانی تقسیم کے بعد گورنمنٹ کالج گلبرگہ میں اردو اور فارسی کے استاد تھے۔انھوں نے ۱۹۴۳ء میں جامعہ عثمانیہ سے پوسٹ گریجویشن کیا تھا۔۱۹۷۲ء میں صدر شعبۂ اردو مہارانی کالج میسور سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے ان کی ۳۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔مختصر تاریخ تمدن، عرب اور اسلام، تاریخ ادبیات ایران، غالب، سالار جنگ میوزیم وغیرہ کافی مشہور ہوئے۔۱۸ رجون ۱۹۷۶ء کو میسور میں انتقال فرمایا۔ان ہی کے ہم عصر گلبرگہ کالج میں پروفیسر عاقل علی خان بھی تھے جو پرنسپل کے عہدہ پر فائز رہے اچھے مقرر اور ڈرامہ نگار تھے۔اُن کے مزاحیہ مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں اسی کالج سے متعلق فلسفہ کے لکچرر عبدالکریم کاظمی نے عثمانیہ سے ۱۹۴۸ء میں پوسٹ گریجویشن کیا، اُس کے فوری بعد گلبرگہ کالج ہی سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔کافی عرصہ تک کالج کے پرنسپل رہے اور ۱۹۸۲ء میں وظیفہ پر علاحدگی کے بعد ۲۰۰۷ء تک خواجہ ایجوکیشن سوسائٹی کے معتمد اعزازی رہے فلسفہ، نفسیات اور ادب پر ان کے مضامین ملک اور بیرون ملک کے معیاری رسائل میں جگہ پا چکے ہیں۔جناب حسن محی الدین غیرت بھی گلبرگہ کالج کے شعبہ اردو سے وابستہ رہے ان کا شمار کہنہ مشق شاعروں میں ہوتا ہے۔ممتاز طنز و مزاح نگار عاتق شاہ کی ملازمت کا کچھ عرصہ گلبرگہ اور بنگلور میں گزرا ہے۔عاتق شاہ نے ترقی پسند نقطہ نظر سے زندگی اور ادب کو پرکھا۔اُن کی تصانیف میں فٹ پاتھ کی شہزادی، ایک وقت کا کھانا، اندھیری اور مائی ڈیئر شکنتلا کے علاوہ ایک رپورتاژ، "عابد شاپ سے کمرشیل اسٹریٹ تک" زیادہ مشہور ہوا۔

آزادی سے قبل کے عثمانین میں محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس کو خصوصیت حاصل ہے۔ گلبرگہ میں ان دونوں بھائیوں کا دولت کدہ "اقبال منزل" محلہ جگت میں واقع تھا۔گلبرگہ کالج سے انٹرمیڈیٹ کے بعد محبوب حسین جگر نے عثمانیہ سے گریجویشن کیا۔وہ ایک بالغ نظر صحافی تھے۔۱۹۴۸ء سے اپنے انتقال ۱۹۹۷ء تک روزنامہ سیاست حیدرآباد کے شریک مدیر رہے۔اُن کے افسانے اور مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں۔اُن کے چھوٹے بھائی ابراہیم جلیس گلبرگہ کالج سے انٹرمیڈیٹ کے بعد ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ سے گریجویشن کیا بعد میں عثمانیہ یونیورسٹی سے یل یل بی کی ڈگری لی۔انھوں نے بہ حیثیت انشائیہ نگار و طنز نگار عالمی شہرت حاصل کی۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "زرد چہرے" ہے۔حیدرآباد میں قیام کے دوران ان

کے مضامین کے دیگر مجموعے "سکونادیس" چالیس کروڑ بھکاری، بھوکا ہے بنگال اور چور بازار (ناول) شائع ہوئے۔ ترک وطن کے بعد بہت ساری کتابیں منظرِ عام پر آئیں جن میں دو ملک ایک کہانی، جیل کے دن جیل کی راتیں، کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں، اور پرشیروانی اندر پریشانی قابل ذکر ہیں۔ گلبرگہ کے عثمانین قلمکار جنھوں نے ترکِ وطن کیا اُن میں یحییٰ صدیقی، رضی اختر شوق اور رشید شکیب قابل ذکر ہیں۔ یحییٰ صدیقی کا مخدوم، میر حسن اور ظفر الحسن کے ساتھیوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے دو سماجی ناول شائع ہو چکے ہیں۔" ۱۲

رضی اختر شوق نے اپنی غزلوں اور نظموں سے متاثر کیا۔ جامعہ عثمانیہ پر کہی گئی اُن کی نظم "ماں" بہت مشہور ہوئی۔ "ماں" کا ایک شعر پیش ہے:

عنا تیں ہیں تری ماں، کہ اُجالا ہوا
کہ تجھ سے لفظ چنے، میں بھی لکھنے والا ہوا

رشید شکیب ۱۹۵۴ء میں گلبرگہ کو خیر باد کہا انھوں نے اردو یونیورسٹی کراچی سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کیا وہ عہد عثمانی کے فیوض و برکات کے والا و شیدا تھے۔ رشید شکیب کراچی سے شائع ہونے والے مجلّہ عثمانیہ کے مدیر رہے اُن کی سرکردگی میں مجلّہ عثمانیہ ۱۹۹۴ء سے اُن کے انتقال (۲۰۰۳ء) تک بڑی آب و تاب سے نکلتا رہا۔ جشن الماس ۱۹۹۴ء - ۱۹۱۹ء کے موقع پر شائع شدہ شمارہ ضخیم معلوماتی اور دیدہ زیب ہے۔ رشید شکیب کی تصانیف میں سوغات دکن، حیدرآباد کی انمٹ کہانی اور دکنی ادب کے چار مینار کو خصوصیت حاصل ہے۔

دکن کے مورخین میں مانک راؤ وٹھل راؤ اہم مقام پر فائز ہیں۔ وہ مانک نگر تعلقہ ہمنا آباد ضلع بیدر میں یکم اگست ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ موصوف نواب خورشید جاہ کی پائیگاہ میں اوّل تعلق دار تھے۔ تاریخ کے موضوع پر ان کی تصانیف دبستانِ آصفیہ، مرہٹوں کا تمدن، خیابانِ آصفی، اشوک کا جیون چرتر اہمیت کے حامل ہیں۔ ۱۳

رائچور سے تعلق رکھنے والے راگھو یندر راؤ جذب عالپوری کو اردو، سنسکرت، کنڑی، تلگو، فارسی اور عربی پر عبور حاصل تھا۔ بہ حیثیت رباعی گو ان کی خاص پہچان تھی، انھیں امجد ثانی بھی کہا جاتا ہے اردو کی نامور پروفیسر اور ممتاز خاتون افسانہ نگار زینت ساجدہ ۱۹۲۴ء میں رائچور میں پیدا ہوئیں۔ تعلقہ شاہ پور کا قصبہ سگر شریف اُن کا وطن ہے عثمانیہ ویمنس کالج اور آرٹس کالج میں صدر شعبۂ اردو رہیں اچھی مقرر اور محقق رہیں۔

افسانے اور مضامین بھی لکھے۔ ''جل ترنگ'' ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ''محب وطن خواتین ''اور ''بہادر عورتیں'' بچوں کے لیے شائع کیں۔ ہمارے علاقے کے سترھویں صدی کے مشہور صوفی شاعر محمود بحری کے کلیات کو مرتب کیا، ہندی نورتن کے ذریعہ ہندی شاعروں کے فن کا جائزہ لیا۔ زینت ساجدہ کے شوہر نامدار حسینی شاہد نے عثمانیہ سے ۱۹۴۲ء میں گریجویشن اور ۱۹۴۸ء میں ایم اے کیا مختلف اخباروں، پیام محب وطن، تاج اور قوم سے وابستہ رہے ادبی رسالے رُباب کے مدیر بھی تھے۔ کچھ عرصے تک شنکر کالج یادگیر میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ ان کی تصانیف دکنی غزل کا ارتقاء شاہ امین الدین اعلیٰ اور شاہ معظم دکنیات میں اہمیت کے حامل ہیں۔

شاعر حیات رشید احمد بیدری، ممتاز عثمانین مخدوم، وجد اور میکش کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ہندو پاک کے ممتاز رسائل میں کلام شائع ہوتا رہا۔ ان کے شاعری کے مجموعے کلام خم ابرو (۱۹۶۸ء) الہام و یقین (۱۹۸۸ء) شائع ہو چکے ہیں۔ ان ہی کے ایک عثمانین شاگرد غلام محی الدین کیف بیدر کا شعری مجموعہ کیف وسرور منظر عام پر آچکا ہے۔

گلبرگہ سے متعلق جامعہ عثمانیہ کے آخری دور سے تعلق رکھنے والے قلمکاروں میں عبدالرحیم آرزو اور پروفیسر محمد ہاشم علی شامل ہیں۔ آرزو صاحب کی شاعری کا مجموعہ ''اظہار آرزو'' شائع ہو چکا ہے۔ پروفیسر محمد ہاشم علی دکنیات کے محقق کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے شاہ صدرالدین پر مقالہ لکھ کر Ph.D کی ڈگری حاصل کی۔ دکنیات میں ان کی کتابیں، میراں جی شمس العشاق اور رسالہ چہار شہادت و مغز مرغوب شائع ہو چکے ہیں۔

حواشی:

۱ : مجتبیٰ حسین اور گلبرگہ، احسان اللہ احمد، ص ۱۹

۲: HEH Mir Osman Ali Khan, First Memorial Lecture by Shri Bishamber Nath Pande a historian former governer of Odesa, organised by Madina Group of Institutions, Hyderabad. Page: 2

۳ :Third Memoral lecture by Shri Kushwant Sing, a journalist of Internationa repute, organised by Madina Group of Institutions, Hyderabad. Page:2

۴ : مضمون ''جامعہ عثمانیہ تاریخ کے آئینے میں'' اقبال حسین، مطبوعہ مجلہ جامعہ عثمانیہ کراچی، جلد۱، شمارہ۲، ۱ اکتوبر تا ڈسمبر ۱۹۹۰ء، مدیر رشید شکیب، ص ۱۱۴

۵ : مضمون۔ عثمانیہ یونیورسٹی، ہارون خان شیروانی، مطبوعہ مرقع جامعہ عثمانیہ ۱۹۹۴ء، بہ موقع جشن الماس، انجمن طلبہ قدیم جامعہ عثمانیہ، کراچی، ص ۵۷

۶ : مضمون۔ جامعہ عثمانیہ کے سرپرست اعلیٰ، بدر شکیب، مطبوعہ مرقع جامعہ عثمانیہ ۱۹۹۴ء، بہ موقع جشن الماس، انجمن طلباے قدیم جامعہ عثمانیہ کراچی، ص ۴۲

۷ : مضمون۔ سلطان العلوم، ایک تاثر، مجلہ عثمانیہ کراچی، ڈاکٹر یوسف سرمست، جلد ۱، شمارہ ۲، ۱۹۹۵ء

۸ : مطبوعہ مرقع جامعہ عثمانیہ، بہ موقع جشن الماس ۱۹۹۴ ص ۵۸

۹ : سرسی پی راماسوامی ائیر، کانوکیشن، ایڈریس جامعہ عثمانیہ ۱۹۴۲ء

۱۰ : دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی وادبی خدمات، ڈاکٹر مجیب الاسلام، ۲۴۶

۱۱ : روزنامہ رہنمائے دکن، حیدرآباد، مورخہ ۱۹ راگست ۱۹۵۵ء

۱۲ : مضمون جامعہ عثمانیہ کے سرپرست اعلیٰ، بدر شکیب، مطبوعہ مرقع جامعہ عثمانیہ، کراچی، بہ موقع جشن الماس ۱۹۹۴ء، ص ۴۲

۱۳ : عہد آصفجاہ میں اردو نثر کا ارتقاء، ڈاکٹر طیب انصاری، ۱۹۹۹ء، ص ۲۵، ۲۲۴

۱۴ : عہد آصفجاہ میں اردو نثر کا ارتقاء، ڈاکٹر طیب انصاری، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵۵

کتابیات: ۱۔ دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی وادبی خدمات، ڈاکٹر محب السلام، دہلی ۱۹۸۷ء

۲۔ حیدرآباد کی علمی فیض رسانی، ڈاکٹر سید داؤد اشرف حیدرآباد، ۲۰۰۸ء

۳۔ عہد آصفیہ میں اردو نثر کا ارتقاء، ڈاکٹر طیب انصاری، ۱۹۹۹ء

۴۔ حیدرآباد کے ادیب، مرتبہ ڈاکٹر زینت ساجدہ۔ ۱۹۵۸ء

۵۔ دارالترجمہ، جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات، پروفیسر مجید بیدار

۶۔ حیدرآباد میں اردو کی ترقی وتعلیم اور سرکاری زبان کی حیثیت سے، ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، ۱۹۹۰ء

۷۔ دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی، طبع ثانی، ۱۳۳۳ھ

۸۔ ذکر یار چلے، مطبوعہ پاکستان، مرزا ظفر الحسن

(اکتوبر 2012ء)

تعلیمِ نسواں : تاریخ وتحریک

آ گہی، شعور کی بیداری، ذہنی تربیت، صلاحیتوں کی نشوونما، نصب العین کے حصول اور ملک کے باوقار شہری کا درجہ حاصل کرنے کے لیے تعلیم سے متمتع ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں ہر ملک وقوم نے تعلیم کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ جن قوموں اور ممالک نے اس سے غفلت برتی وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور آج بھی اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ مذہبِ اسلام نے تو مردوں اور عورتوں کے لیے حصول تعلیم کو فرض قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو حضور اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی۔

"طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم و مسلمة"

ایک عرصے تک یہ احساس عام تھا کہ صرف مردوں کو تعلیم حاصل کرنا چاہیے اور خواتین صرف امورِ خانہ داری میں الجھی رہیں۔ مگر اسلام نے امورِ خانہ داری کے ساتھ ساتھ خواتین کے لیے تعلیم کو ضروری بلکہ لازمی قرار دیا۔ اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ صحابہؓ کے دوش بدوش صحابیاتؓ نے بھی اپنے علم وفضل سے ایک عہد کو متاثر کیا، گھریلو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئیں اور غزوات وسَرایا میں بھی حصہ لیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی حدیثوں کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ دیگر صحابہؓ کی روایت کردہ حدیثوں کی۔ حضرت عائشہؓ نے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور میں فتوے بھی دیے۔ اس طرح یہ ثابت کیا کہ علم وفضل صرف مرد کی میراث نہیں۔ جہاں تک ذہنی استعداد کا تعلق ہے مردوں اور عورتوں میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ نسبتاً لڑکیاں ہی محنت و دلچسپی سے پڑھتی ہیں۔ ان دنوں اعلیٰ تعلیم کے نتائج نے ثابت کردیا ہے کہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں نہ صرف زیادہ تعداد میں کامیاب ہوتی ہیں بلکہ امتیازی کامیابی حاصل کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ گولڈ مڈل حاصل کرنے والوں میں بھی ان ہی کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی لیت ولعل کے بغیر خواتین کو تعلیم حاصل کرنے کا مواقع فراہم کیے جائیں۔ یوں بھی یہ مسلمہ ہے کہ ایک لڑکے کی تعلیم ایک فرد کی تعلیم ہے جب کہ ایک لڑکی کی تعلیم سے سارا خاندان فیضیاب ہوتا ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے۔ 19 ویں صدی کی ابتدا میں بہ مشکل 2% (فیصد) خواتین

تعلیم یافتہ تھیں۔ 1857ء کے بعد انگریزوں نے عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ رفتہ رفتہ عورتوں کی تعلیم کے لیے ابتدائی مدارس، ثانوی مدارس اور کالج قائم ہوے۔ لیکن 1902ء تک آبادی کے تناسب سے عورتوں کی تعلیم 3% سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس معاملے میں مسلمان لڑکیاں اور پیچھے تھیں۔ 18ویں صدی سے 20ویں صدی کے ابتدائی برسوں تک مسلمان گھرانوں میں لڑکیوں کی تعلیم نہ صرف غیر ضروری بلکہ ناپسندیدہ سمجھی جاتی تھی۔ 1886ء میں جب سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی تو اُن کا مقصد مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو عام کرنا اور اُسے اعلیٰ درجے تک پہنچانا تھا۔ تعلیم نسواں کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر اوروں سے مختلف تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ عورتوں کی تعلیم سے قبل مردوں کی تعلیم پر زور دیا جائے۔ سرسید کے مطابق خواتین کی تعلیم کا مقصد نیک اخلاق، امور خانہ داری کا اہتمام، بزرگوں کا احترام، شوہر کی خدمت بچوں کی پرورش اور مذہبی عقائد سے واقفیت تک محدود تھا۔ سرسید کے رفقا میں مولوی نذیر احمد اور الطاف حسین حالیؔ کو تعلیم نسواں سے دلچسپی تھی۔ حالیؔ کی نظم ''چپ کی داد'' تعلیم نسواں کی اہمیت کو اُجاگر کرتی ہے۔ مولوی نذیر احمد نے اپنے لڑکے کے لیے ''چند پند'' اور لڑکی کے لیے ''مراۃ العروس'' دو علاحدہ کتابیں لکھیں۔ مندرجہ ذیل مراۃ العروس کی عبارت سے اس دور کی تعلیمی صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''اس ملک میں مستورات کو پڑھانے لکھانے کا رواج نہیں۔ پھر بھی بڑے شہروں میں بعض شریف خاندانوں کی اکثر عورتیں قرآن مجید کا ترجمہ، مذہبی مسائل اور نصائح کے اُردو رسالے پڑھ پڑھ لیا کرتی تھیں۔''

یہ صورت حال زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہی۔ سرسید کی تعلیمی تحریک شروع ہونے کے بیس پچیس سال کے اندر اندر ہی تعلیم نسواں کی حمایت شروع ہوتی گئی۔ سرسید کی قائم کردہ ایجوکیشنل کانفرنس 1891ء میں تعلیم نسواں سے متعلق ایک قرارداد منظور کرتے ہوے مسلمانوں سے اپیل کی کہ ''وہ مردوں کی تعلیم کے ساتھ عورتوں کی تعلیم کے لیے بھی لازمی کوشش کریں۔'' بالآخر 1898ء میں ایجوکیشنل کانفرنس میں باقاعدہ شعبۂ نسواں قائم ہوگیا اور یہ احساس جاگ اُٹھا کہ خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے بغیر معاشرتی و قومی زندگی مہمل رہے گی۔ اور ترقی کا کوئی تصور تعلیم نسواں کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ اسی کا اثر تھا کہ ملک کے کئی شہروں بمبئی، لاہور، علی گڑھ، لکھنو اور حیدرآباد میں لڑکیوں کے تعلیمی مراکز قائم ہوے۔ سرسید کے ہم عصروں میں ممتاز علی، سجاد حیدر یلدرم اور اُن کی بیگم نذر سجاد حیدر تعلیم نسواں کے زبردست موئید تھے۔ تعلیم نسواں کے ایک

اور حامی سرسید تحریک کے ممتاز مبلغ مولانا اسماعیل میرٹھی تھے۔ جنھوں نے لڑکیوں کا ہائی اسکول قائم کیا جو، اب اسمٰعیل نیشنل گرلس ڈگری کالج ہے۔ شیخ محمد عبداللہ (پاپامیاں) جو اپنی تعلیم کے لیے علی گڑھ پہنچے تھے۔ یہیں کے ہو رہے۔ اور بعد ازاں ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری منتخب ہوے۔ انھوں نے تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے 60 سال تک جدوجہد کی۔ اُن کی اس مہم میں ان کی رفیقہ حیات بیگم عبداللہ اور صاحبزادی ممتاز جہاں حیدر نے بھی ساتھ دیا۔ اس عہد کی دیگر خواتین جنھوں نے تعلیم نسواں میں دلچسپی لی، بیگم صاحب بھوپال، بیگم شریف حامد علی اور مسز صوفی طیب جی تھیں۔ ان کی کوششوں کے نتائج بھی زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھے۔ 1921ء کی مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہزار تعلیم یافتہ مسلمانوں میں صرف 15 تعلیم یافتہ عورتیں تھیں گویا تعلیم یافتہ مسلم خواتین کا فی صد بیسویں صدی کے دوسرے دہے کے بعد بھی 1.5 تھا۔ آج سے سو، سوا سو سال پہلے تعلیم نسواں کی راہ میں بڑی دشواریاں تھیں۔ صدیوں کی معاشرتی روایات کو توڑنا یا بدلنا آسان نہیں تھا۔ تعلیم نسواں کی سست رفتاری کے دو اہم سبب تھے۔ ایک تو یہ کہ شرفا ایسی بچیوں کو گھر سے باہر قدم رکھنے کو معیوب سمجھتے تھے۔ دوسرا یہ کہ مغربی تعلیم کو عیسائیت کی تبلیغ کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ والدین کو یہ خدشہ تھا کہ جو طلبہ مغربی تعلیم حاصل کریں گے وہ عیسائیت قبول کریں گے۔

آج حالات یکسر بدل گئے ہیں۔ عوام ہوں کہ خواص، انھیں تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہے۔ وہ حالات باقی نہیں رہے جو سو، سوا سو سال پہلے تھے۔ مگر آج بھی عورتوں کی تعلیم کا تناسب آبادی کے لحاظ سے نہایت کم ہے۔ ملک کی تقریباً 85 کروڑ آبادی میں 40 کروڑ لوگ اب بھی ناخواندہ ہیں۔ 1991ء کی مردم شماری کے مطابق ملک میں خواندگی کا فی صد 52.11 اور خواتین کی خواندگی کا فی صد 39.12 ہے۔ جنوبی ہند میں بھی کیرالا اور تامل ناڈو کے سوا دیگر ریاستوں کی شرح خواندگی اطمنان بخش نہیں ہے۔ ذیل کے جدول سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

ریاست	تعلیم کا فی صد	مرد	عورت
۱۔ کیرالا	90.59	94.45	86.90
۲۔ پانڈیچری	74.91	83.91	65.72
۳۔ کرناٹک	55.98	67.25	44.34
۴۔ آندھراپردیش	45.11	56.24	33.71

مندرجہ بالا جدول سے ظاہر ہے کہ جنوبی ہند میں کرناٹک اور آندھرا پردیش میں عورتوں کی تعلیم کا تناسب نسبتاً کم ہے۔ ملک میں آبادی نسواں کا تناسب، جملہ آبادی کا نصف ہونے کے باوجود آج بھی عورتوں کی ایک بڑی تعداد تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ شخصیت کی تعمیر، سماج وملک کی ترقی اور تہذیبی ارتقا کا واحد ذریعہ تو صرف تعلیم ہے۔ اگر ملک کی نصف آبادی اس سے محروم ہو تو ملک کی ترقی کا تصور بے معنی ہے۔ حالانکہ ملک کے آئین نے تعلیم کو شہریوں کا بنیادی حق قرار دیا ہے اور اس کی دفعہ 45 کے لحاظ سے تعلیم کا اہتمام حکومت کی ذمہ داری ہے۔ حکومت کی تمام تر کوششوں کے باوجود خواتین کی تعلیمی پستی تشویش ناک ہے۔ آج جبکہ خواتین کی جانب سے ملک کی پارلیمان اور ریاستی قانون ساز اداروں میں ان کے لیے 1/3 نشستوں کے تحفظات کی فراہمی کا مطالبہ کیا جارہا ہے، تعلیم نسواں کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے، کیوں کہ تعلیم یافتہ خواتین ہی ملک وقوم کی بہبودی کے لیے پارلیمان میں موثر رول ادا کرسکتی ہیں۔

مرکزی حکومت کے ایک کمیشن کی رپورٹ کے مطابق مسلمانوں اور نئے سرے سے بدھ مت اختیار کرنے والوں کا تعلیمی فی صد ملک میں سب سے کم ہے۔ حالانکہ دستور ہند کی دفعہ (1)30 کے ذریعے یہ تیقن دیا گیا ہے۔ ''تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہبی ہوں یا لسانی حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے تعلیمی ادارے قائم کریں اور ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں''۔ آزادی کے بعد اقلیتوں نے دستوری تیقنات سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھایا۔ جامعہ ملیہ، جامعہ علی گڑھ اور جامعہ عثمانیہ کے تحت کئی تعلیمی ادارے تو پہلے ہی سے قائم تھے۔ البتہ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی دہلی نے جامعہ ہمدرد کے قیام کے ذریعے اعلیٰ و پیشہ ورانہ تعلیم کی جانب کامیاب پیش رفت کی ہے۔ جنوبی ہند کے مسلمانوں نے کئی تعلیمی سوسائٹیاں قائم کی ہیں۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے تحت کیرالا اور ٹامل ناڈو میں لڑکیوں اور لڑکوں کے کئی کالج قائم ہوئے۔ الامین ایجوکیشن سوسائٹی (بنگلور) اور دارالسلام ایجوکیشنل ٹرسٹ (حیدرآباد)، انوارالعلوم ایجوکیشن سوسائٹی، مدینہ ایجوکیشن سوسائٹی (حیدرآباد)، جامع مسجد ٹرسٹ (بنگلور)، خواجہ ایجوکیشن سوسائٹی (گلبرگہ)، بسم اللہ ایجوکیشن ٹرسٹ بنگلور اور اس طرح کے کئی اور تعلیمی اداروں کے تحت تعلیم نسواں اور اعلیٰ تعلیم کے مراکز کام کررہے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی 12 تا 15 کروڑ بتائی جاتی ہے۔ اُن کی تقریباً نصف آبادی یعنی 49% عورتوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ان میں پڑھی لکھی عورتوں کا فی صد نہایت کم ہے۔ مردم شماری کے

تازہ ترین اعداد وشمار کے لحاظ سے تعلیم یافتہ مسلمان مرد 10% اور خواتین 5% ہیں۔ ان کا مجموعی فی صد 7.5 سے زیادہ نہیں۔ 1886ء میں جو تعلیمی تحریک علی گڑھ سے شروع ہوئی تھی۔ اسکی ایک صدی مکمل ہو چکی ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہے۔ ہماری عام تعلیمی شرح بڑھتی ہوئی آبادی کے لحاظ سے کم ہے۔ تعلیم نسواں کی شرح تو اور بھی کم ہے۔ آج سو سال قبل کے وہ اسباب وعوامل باقی نہیں رہے جن کی بنیاد پر لوگ لڑکیوں کو تعلیم کی خاطر بھی گھر سے باہر بھیجنے میں پس وپیش کرتے تھے۔ مگر ان کی بجائے آج چند اور وجوہ تعلیم نسواں کے فروغ میں حائل ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں والدین کی بے حسی اور بے توجہی کو دخل ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ لڑکیوں پر جو کچھ بھی خرچ ہوتا ہے، وہ سب پرایا ہے۔ گھروں میں چھوٹے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال اور رسوئی گھر میں والدہ کی مدد کے لیے اکثر لڑکیاں تعلیم ترک کر دیتی ہیں۔ ان کے علاوہ جہالت، روایت پسندی، غربت، معاشی کشمکش، کم عمری میں محنت ومزدوری اور کم سنی کی شادیوں کے باعث بھی عورتوں کی تعلیمی سطح ہنوز پست ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عوامی بیداری کے ذریعہ راہ کے ان روڑوں پر قابو پایا جائے۔

آج کا دور سائنسی اور تکنیکی ترقی کا دور ہے۔ ہر شعبہ حیات پر سائنس کی حکمرانی ہے۔ زراعت، تجارت، صنعت وحرفت، گھریلو اور دفتری کاروبار آج مشینوں کے ذریعے انجام پا رہے ہیں۔ زندگی میں مسابقت کی دوڑ تیز ہو چکی ہے۔ وہی قوم آج کامیاب وسرخرو ہو سکتی ہے جو تعلیم کے شعبے میں سبقت لے جائے اور سائنسی علوم پر حاوی ہو۔ اس تناظر میں خواتین کے لیے اعلیٰ وعصری تعلیم بھی ضرورت ہی نہیں بلکہ احتیاج وتقاضائے وقت ہے۔ لڑکیوں کی معیاری تعلیم کے لیے ماڈل اسکولس، اقامتی مدارس اور اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں۔ پیشہ ورانہ تعلیم بھی ان کے لیے ضروری قرار دی جائے۔ بہر کیف ہمارا یہ قومی فریضہ ہے کہ خاندان وسماج اور ملک وقوم کی بہتری وتیز رفتار ترقی کے لیے لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کریں۔

●●

(1994ء)

آزادی کے بعد ہمارا نظام تعلیم

تعلیم، سماجی زندگی کا ایک موثر ذریعہ اور نسل انسانی کی طبعی، ذہنی اور روحانی صفات کو فروغ دینے کا آلہ ہے۔ اس لیے اس سے روگردانی نہیں کی جاسکتی۔ تعلیم کا حصول ایک بہتر معاشرے اور روز رخشاں مستقبل کی تشکیل و تعمیر کے لیے بھی ضروری ہے۔ اس تناظر میں ہندوستانی تعلیمی نظام کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام کی ابتدا و ارتقاء نو آبادی نظام کی دین ہے جس کی بنیاد 1854ء میں رکھی گئی تھی اور جس کا مقصد نو آبادی طرز حکومت میں نوکر شاہی کو مضبوط اور مستحکم کرنا تھا۔ جب ملک آزاد ہوا تو صورتحال میں تبدیلی ہوئی۔ ہندوستان کا اپنا دستور مدون ہوا اور تعلیم سے متعلق رہنمایانہ اصول متعین ہوئے۔

نئے دستور کا آغاز آزاد ہندوستان میں تعلیم کا نقطہ آغاز ہے۔ دستور میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ تعلیم ریاستی موضوع ہے جس کی وضاحت شڈول I کے اندراجات 63,64,65,66 اور شڈول 3 کے 25 ویں اندراج سے ہوتی ہے۔ دستور کی دفعہ 45 کے مطابق 10 سال تک مفت اور لازمی تعلیم کا اہتمام ریاستی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ دفعہ 15 (3) کے لحاظ سے بھی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچوں اور عورتوں کی تعلیم کے لیے خصوصی اسکیم مرتب کرے۔ دفعہ 329 کی رو سے مرکزی علاقوں میں تعلیم کی ذمہ داری مرکزی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ دستور کی Concurrent (متوازی) فہرست میں پیشہ ورانہ تعلیم و تکنیک، تربیت، سائنسی تحقیق، ہندی کی ترقی و اشاعت، سنسکرت ادب کا تحفظ، جسمانی معذوروں کی تعلیم، اقلیتوں کے ثقافتی مفادات کا تحفظ، شڈول کاسٹ طبقہ کی تعلیم اور تمام شہریوں کیلئے 14 سال کی عمر تک مفت اور لازمی تعلیم شامل ہیں۔

آزادی کے بعد ملک کی تعلیمی ترقی کے باب میں ہمارے رہنماؤں کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوا۔ نئے دستور کے نفاذ کے بعد ہمارے ملک میں جو صدر اور نائب صدر منتخب ہوئے وہ بڑے علم و ادب کے مربی تھے۔ خاص طور پر ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے تعلیم کے نظریہ و عمل کے سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ راشٹر پتا مہاتما گاندھی کو تعلیم سے خصوصی دلچسپی تھی۔ ہمارے پہلے صدر ڈاکٹر

راجندر پرشاد بھی کلکتہ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ اور کچھ عرصے تک تدریسی فرائض بھی انجام دیے تھے۔ ہمارے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد تعلیم سے خاص انس رکھتے تھے۔ آزادی کے ایک سال بعد ہی 1948ء میں حکومت نے رادھا کرشنن کی صدارت میں ایک تعلیمی کمیشن قائم کیا۔ یہ کمیشن جامعاتی تعلیم سے متعلق تھا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے طلبہ کی دلچسپیوں وصلاحیتوں کے مطابق نصاب میں تبدیلی، اساتذہ کی تعلیم وتربیت، تحقیقی کام، اخلاقی تعلیم، سہ لسانی فارمولہ اور امتحانی طریقہ کار میں اصلاحات سے متعلق تجاویز پیش کیں۔ جب پنچ سالہ منصوبوں کا آغاز ہوا تو تعلیم ہی کو افراد کی تربیت، خوشحالی اور آسودگی کا ذریعہ سمجھا گیا۔ پہلا پنچ سالہ منصوبہ 1951ء میں شروع کیا گیا تو اس کے تحت تعلیم کیلئے مختص رقم 169 کروڑ تھی۔ یہ رقم ماقبل ابتدائی تعلیم کے اداروں کے قیام، انھیں پڑھانے والے اساتذہ کی تربیت، مدارس کے لیے عمارتوں اور طلبہ کے لیے اقامت خانوں کی تعمیر، ثانوی تعلیم کے لئے کمیشن کا قیام، درسی کتابوں کی تیاری، تعلیمی رہبری کے اداروں اور سماجی تعلیم کے تحت جنتا کالجس کا قیام اور سوشل ایجوکیٹرس اور کارکنوں کی تربیت پر صرف کی گئی۔ ثانوی تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کیلئے 1952ء میں مدلیار کمیشن کا قیام عمل میں آیا، جس نے ثانوی سطح ہی سے تعلیم کو روزگار سے جوڑنے کی کوششوں کا آغاز کیا۔ کمیشن نے کثیر المقاصد و ہمہ مقصدی مدارس کے قیام کی سفارش کی۔ ثانوی تعلیم کی تنظیم جدید کے نتیجے میں اعلیٰ ثانوی تعلیم کی میعاد 11 سال کردی گئی اور ڈگری کورس کیلئے 3 سال مختص کیے گئے۔ امتحانی طریق کار میں معروضی سوالات وجانچ کو اہمیت دی گئی۔ نیز اساتذہ کیلئے فلاحی اسکیموں کا آغاز ہوا۔

1956ء میں دوسرے پنچ سالہ منصوبے کا آغاز ہوا۔ اس منصوبے کے تحت تعلیم کے شعبہ پر 307 کروڑ روپے صرف کیے گئے۔ اس عرصے میں مہاتما گاندھی جی کی شروع کردہ بنیادی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ اساتذہ کے تربیتی ادارے قائم ہوئے ان اداروں کی تعداد 370 سے 1307 ہوگئی۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے بھی جامعاتی تعلیم کے سلسلے میں اہم اقدامات کیے تیسرا پنچ سالہ منصوبہ 1961ء میں شروع ہوا۔ تعلیم کے لیے مختص موازنہ 418 کروڑ روپے تھا۔ اس منصوبے کے دوران 60 ہزار ابتدائی مدارس کو بنیادی مدارس میں تبدیل کیا گیا۔ کئی ثانوی مدارس کو ہائر ثانوی مدارس کا درجہ دیا گیا۔ اس عرصے میں 12 یونیورسٹیز اور 400 کالجس قائم کیے گئے۔ خواتین کی تعلیم پر 175 کروڑ روپے صرف کیے گئے۔

ٹکنیکل تعلیم پر بھی زور دیا گیا۔1964ء میں ممتاز عالم وسائنسداں ڈی ایس کوٹھاری کی سرکردگی میں ایک اور تعلیمی کمیشن قائم کیا گیا۔ کوٹھاری نے ہندوستانی تعلیم کو ایک نئی جہت عطا کی۔ ان کا یہ مشہور مقولہ۔ Indias destination is being Shaped in its Class Rooms ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ طریقہ تعلیم، معیار تدریس، تربیت اساتذہ، حصول تعلیم و داخلے جات میں مساوی مواقع، جامعات کا اقتدار اعلیٰ، زرعی وسائنسی تعلیم و تحقیق، پیشہ ورانہ ٹکنیکی وانجینئرنگ تعلیم اور تعلیم بالغان جیسے امور کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ کے اہم نکات تھے۔ اس کمیشن نے ہی تعلیمی پیٹرن کے طور پر3+2+10 کی تجویز پیش کی تھی۔ سابق وزیر تعلیم ہند محمد کریم چھاگلا نے اس رپورٹ کو میا گنا کارٹا قرار دیا۔

چوتھے پنچ سالہ منصوبے کا آغاز1969ء میں ہوا۔ اس منصوبے کے تحت شعبہ تعلیم کے لیے1210 کروڑ روپے مختص کیے گئے تھے۔ اس منصوبے کے تحت ابتدائی وثانوی تعلیم کے علاوہ ٹکنیکل، پیشہ ورانہ تعلیم، تعلیم نسواں، اساتذہ کی تربیت، جامعاتی تعلیم کی اصلاح اور مراسلاتی نصاب پر زور دیا گیا۔

پانچویں پنچ سالہ منصوبہ کی شروعات1974ء میں ہوئی۔ اس منصوبے میں ہندوستانی سماج کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ابتدائی سطح سے یونیورسٹیز تک تعلیم کا جائزہ لیا گیا۔ ہر سطح پر نصاب میں تبدیلی لائی گئی۔ ثانوی سطح پر کرافٹ کی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔10 فیصد مدارس کو ماڈل اسکولس میں بدل دیا گیا۔15 یونیورسٹیز اور50 یونیورسٹی سنٹر قائم کیے گئے۔ اس منصوبے کے تحت تعلیم پر3200 کروڑ روپے صرف کیے گئے۔ نتیجتاً مدارس اور کالجوں کی تعداد 2.31 لاکھ سے5.72 لاکھ ہوگئی اور طلبہ کی تعداد273 لاکھ سے873 لاکھ ہوگئی تھی۔1977ء میں آزادی کے بعد پہلی بار مرکز اور بعض ریاستوں میں حزب اختلاف کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ اس لیے چھٹے پنچ سالہ منصوبے میں جو1978ء میں شروع ہوا، سابقہ حکومت کے کئی پروگرام اس میں تبدیلی لائی گئی۔ ناخواندگی کا خاتمہ، ابتدائی تعلیم کی اشاعت، تعلیم بالغان اور خود روزگار تعلیم اس منصوبے کے اہم نکات تھے۔ لازمی تعلیم کے ذریعے صدفی صد خواندگی کی حد1960ء مقرر تھی۔ مگر اس میں1981ء تک توسیع کی گئی۔ چھٹے منصوبے میں ابتدائی تعلیم پر900 کروڑ روپے ثانوی تعلیم پر300 کروڑ اور اعلیٰ تعلیم پر265 کروڑ روپے صرف کیے گئے۔1985ء میں ساتویں پنچ سالہ منصوبے کا آغاز ہوا تو تعلیم کا تصور ہی بدل گیا۔ اب افراد کو ملک کی ترقی کیلئے وسائل تسلیم کیا گیا۔ اس لیے

سر رشتہ تعلیم کو Human Resource Development کہا جا رہا ہے۔ اس منصوبے کے تحت تعلیم کے لیے 6382 کروڑ روپے مختص کیے گئے تھے۔ اس منصوبے کے دوران، جہت نمائی کے ذریعے طریقہ تعلیم میں تبدیلی لائی گئی۔ 15 سے 25 سال کی عمر کے افراد میں ناخواندگی کے خاتمہ کی سعی کی گئی۔ ووکیشنل تعلیم پر بھی زور دیا گیا۔ معیار تعلیم میں بہتری کی سعی کی گئی۔ ساتویں منصوبے کے دوران ہی 1986ء میں قومی تعلیمی پالیسی کی انقلابی دستاویز Challenge of Educaion جاری کی گئی۔ نئی تعلیمی پالیسی میں جن پہلوؤں پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ہر بچہ کو داخلہ ملے اور وہ 14 سال کی عمر تک زیر تعلیم رہے۔

۲۔ تعلیم کی نوعیت میں خاطر خواہ بہتری ہو۔ ۳۔ تعلیم برائے مساوات پر عمل پیرائی۔

۴۔ پیشہ ورانہ تعلیم کا فروغ ۵۔ غیر رسمی تعلیم کی حوصلہ افزائی۔

۶۔ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں اوپن یونیورسٹیز کا قیام۔

۷۔ طلبہ میں باہمی میل جول، بھائی چارگی، وطن پرستی نیز معاشی و معاشرتی حیثیت کی بنیاد پر عدم امتیاز کے جذبات کا فروغ۔

نئی تعلیمی پالیسی کا اہم مقصد تعلیمی نظام کی افادیت، اطلاق ونفوذ میں جو فرق ہے اسے دور کرنا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل پانچ برسوں میں ممکن نہیں ہے۔ اس لیے تعلیم کو حال و مستقبل کے لیے سرمایہ کاری قرار دیا گیا ہے۔ اب ہم آٹھواں پنچ سالہ منصوبے سے گزر کر نویں پنچ سالہ منصوبے میں قدم رکھ رہے ہیں نویں منصوبے میں بھی تعلیم اور خواندگی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ یقین ہے کہ نئی قومی تعلیمی پالیسی کے خدوخال اکیسویں صدی میں بھی ہماری رہنمائی کرتے رہیں گے۔

آزادی کے بعد ملک نے اپنے وسائل کا بہت بڑا حصہ تعلیم کی ترقی و اصلاح کیلئے وقف کر دیا ہے اور اس کے بہتر نتائج سامنے ہیں۔ ملک آزاد ہوا تو صرف 16 فیصد عوام تعلیم یافتہ تھے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ہماری تعلیمی شرح میں متواتر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ 1991ء کے اعداد وشمار کے مطابق ہماری تعلیمی شرح 52 فیصد ہوگئی ہے۔ 1951ء میں ملک میں صرف 28 یونیورسٹیاں تھیں اور آج 229 جامعات اعلیٰ تعلیم کا مرکز ہیں۔ 1951ء میں کالجوں کی تعداد ایک ہزار سے کم تھی اب یہ تعداد دس ہزار سے تجاوز کر چکی

ہے۔ ان دنوں صرف 4 لاکھ طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے اب یہ تعداد 61 لاکھ ہوگئی ہے۔ 1951ء میں مسلمہ تعلیمی ادارے 2 لاکھ 31 ہزار تھے اب ان کی تعداد 10 لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ریسرچ اور تحقیقی اداروں کے ذریعے سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبہ میں ملک نے جو ترقی کی ہے اس کی تازہ ترین مثال 11 اور 13 رمئی 1998ء کو پوکھران میں کیے گئے نیوکلیائی کامیاب تجربات ہیں۔

تعلیمی شرح میں نسبتاً بہتری، مدارس، کالجوں، جامعات اور پیشہ ورانہ نصاب کی فارغ التحصیل کی تعداد میں معتد بہ اضافے کے باوجود ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے تناسب سے ترقی کی یہ رفتار حوصلہ افزا نہیں ہے۔ تعلیمی معیار کے سلسلے میں بھی قومی آرزوؤں اور امنگوں کی تکمیل ہنوز تشنہ طلب ہے۔ نیز تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے روزگاری انھیں دہشت گردی اور قانون شکنی کی طرف مائل کر رہی ہے۔ 14 سال کی عمر تک مفت تعلیم فراہم کرنے اور ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کی واضح یقین دہانیوں کے باوجود ہم مقررہ نشانہ حاصل نہیں کر سکے۔ آج بھی ملک میں 48 فیصد عوام ناخواندہ ہیں۔ 12 سال کے تعلیمی سفر میں 75 فیصد طلبہ قبل از وقت اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح تعلیمی جمود و تضیع کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس ضمن میں عالمی بینک کا یہ اعلامیہ کہ ''21 ویں صدی کی ابتداء تک دنیا کی ناخواندہ آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہندوستان میں ہوگا۔'' ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ ہماری آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر عالمی بینک کا یہ انکشاف ایک بڑا چیلنج ہے۔ اس لیے طلبہ ہوں کہ اساتذہ، والدین ہوں کہ ارباب نظم و نسق، سب کا فرض ہے کہ ایک دوسرے سے اشتراک کرتے ہوئے انقلابی اقدامات کے ذریعہ معیار تعلیم کی بہتری اور صدفی صد خواندگی کے خواب کو شرمندہ تعبیر کریں۔ اگر ہم اس خصوص میں تدبر و فراست اور محنت و لگن کے ساتھ قدم بڑھائیں تو یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔ بقول اقبال:

رنگ ہو یا خشت، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود

●●

(نومبر 1998ء)

اردو کی ابتدائی تعلیم : مسائل اور حل

کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ کے شعبے اردو و فارسی کے زیر اہتمام پہلی اردو کانفرنس کا اہتمام فال نیک ہے۔ قبل ازیں ۲۴ر اور ۲۵ر دسمبر ۱۹۶۰ء کو دھارواڑ کے قرب و جوار میں واقع جمکھنڈی ہی کو ریاست میسور کی اولین دو روزہ اردو کانفرنس کی میزبانی کا شرف حاصل رہا۔ مذکورہ ریاستی کانفرنس کا افتتاح ریاستی وزیر اعلیٰ شری بی۔ ڈی جتی نے فرمایا تھا۔ اس طرح کی کانفرنسوں سے محبان اردو کی جدوجہد اور اردو کے تئیں ان کے دلی جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ شعبہ اردو جامعہ کرناٹک کے ارباب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اردو کے مسائل کی نشاندہی اور ان کی یکسوئی کے لیے پیش رفت فرمائی۔ دھارواڑ جو عادل شاہی دور میں نصیر آباد کے نام سے موسوم تھا، تاریخی و ادبی اہمیت رکھتا ہے۔ اس ضلع میں چند مقامات بلگور، شاہ پور اور بنکاپور ادبی و تاریخی حیثیت سے اہمیت کے حامل ہیں۔ بلگور کے مشہور بزرگ حضرت شاہ قادری نے اپنا رسالہ ''درالاسرار'' اور دھارواڑ کے حضرت شاہ ولی اللہ نے کلمہ کی کل ''جواہر العرفان'' اور ''راہ سلوک'' جیسے رسائل اسی شہر میں مرتب کیے جن کا دکنی ادب کے اولین رسائل میں شمار ہوتا ہے۔ اس سرزمین سے وقتاً فوقتاً ادبی رسائل و اخبارات کا اجرا بھی عمل میں آتا رہا ہے اور بعض جدید فنکاروں نے شعر و ادب اور افسانہ نگاری میں ملک گیر شہرت حاصل کی ہے۔

اردو کی ابتدائی تعلیم۔ مسائل اور حل ایک وسیع عنوان ہے جو تفصیل کا متقاضی ہے۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی ریاست پر توجہ مرکوز کی جائے، کسی بھی زبان کی تعلیم و اشاعت کا انحصار حکومتی رویے اور اس کے وضع کردہ قوانین پر ہوتا ہے۔ آزادی کے فوری بعد اردو مسائل کا شکار ہوئی مگر ان سخت جاں زبان نے رفتہ رفتہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اردو آج ملک میں فلم اور ٹی وی کی مقبول عام زبان ہے مگر نظم و نسق اور تعلیم کے شعبوں میں ہنوز وہ مسائل سے دوچار ہے۔ چند ریاستوں کے ماسوا ملک میں اردو کی صورت حال تشفی بخش نہیں ہے۔ ویسے وہ جموں و کشمیر کی سرکاری زبان ہے۔ بہار مغربی بنگال اور آندھرا پردیش کے چند اضلاع کے علاوہ دہلی میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ دیا گیا ہے مگر

اتر پردیش، جواردو بولنے والوں کی سب سے بڑی ریاست ہے وہاں اردو سرکاری تعلیمی اداروں سے غائب ہو کر صرف مکتبوں کا طواف کر رہی ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ وہاں مُردوں کے کتبے بھی دوسری زبان میں لکھائے جا رہے ہیں اور میاں بیوی دیوناگری رسم الخط میں خط و کتابت پر مجبور ہیں۔ اس کے برعکس جنوبی ریاستوں خصوصاً مہاراشٹرا، آندھرا پردیش اور کرناٹک میں اردو کی تعلیم و ترویج کلی طور پر اطمینان بخش نہ سہی حوصلہ افزا ضرور ہے۔

کرناٹک بہ لحاظ آبادی ملک کی آٹھویں بڑی ریاست ہے جہاں ۲را:۴ کروڑ نفوس سکونت پذیر ہیں۔ ان میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۵۰ لاکھ سے متجاوز ہے۔ میسور، بنگلور، سری رنگاپٹم، بیجاپور، دھارواڑ، گلبرگہ اور بیدر جیسے اردو کے اہم مراکز اس ریاست میں شامل ہیں۔ ۱۹۵۶ء تا ۱۹۸۰ء کرناٹک میں جو حکومتیں کارگزار ہیں، ان کا رویہ اردو سے ہمدردانہ رہا۔ ریاست کے گوشے گوشے میں اردو مدارس قائم ہیں جن کی تعداد تقریباً ۳ تا ۴ ہزار ہے۔ ان مدارس میں لاکھوں طلبہ اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس طرح اردو ذریعہ تعلیم کے تقریباً ۲۰۰ سے زائد ثانوی مدارس قائم ہیں جہاں ہزاروں طلبہ اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ زیادہ تر اردو ثانوی مدارس، حیدرآباد کرناٹک اور ممبئی کرناٹک میں پائے جاتے ہیں قدیم ریاست میسور کے علاقے میں صرف ہفتم تک اردو ذریعہ تعلیم کا انتظام ہے۔ جماعت ہفتم کے بعد طلبہ انگریزی ذریعہ تعلیم کے مدارس کا رخ کرتے ہیں اب اس علاقے میں بھی کہیں کہیں اردو ذریعہ تعلیم کے ثانوی مدارس قائم ہو گئے ہیں جن کی تعداد حوصلہ افزا نہیں۔ حکومت کرناٹک اپنی روادارانہ لسانی پالیسی سے پہلی بار ۱۹۸۲ء میں منحرف ہوئی جبکہ اس نے ۸۳-۱۹۸۲ء کے تعلیمی سال سے گوکاک کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں ایک حکمنامے کے ذریعہ جماعت اول کے اقلیتی طلبہ کے لیے کنڑا کو زبان اول قرار دیا۔ جناب محمد علی صاحب سابق وزیر وصدر انجمن ترقی اردو کرناٹک نے مذکورہ ریاستی حکمنامے کو عدالت عالیہ میں چیلنج کیا۔ سات سال بعد عدالت عالیہ نے ۱۹۸۹ء میں مذکورہ حکمنامے کو دستور ہند کی دفعہ ۲۹(۱) اور دفعہ ۳۰(۱) کے مغائر قرار دیا اسی کا نتیجہ تھا کہ ریاستی حکومت نے جون ۱۹۸۱ء کو جس عبوری لسانی پالیسی کا اعلان کیا، اس کے مطابق، کنڑا اقلیتی طلبہ کے لیے زبان اول نہیں رہی، صرف مادری زبان ہی کو زبان اول تسلیم کیا گیا۔ تب سے کنڑا، زبان دوم اور انگریزی زبان سوم قرار دی گئی ہے۔ انگریزی، جماعت پنجم سے پڑھائی جا رہی ہے

جبکہ کنڑا کو تیسری جماعت سے اختیاری مضمون قرار دیا گیا ہے۔ تیسری اور چوتھی جماعت کے تعلیمی سال کے ختم پر کنڑا کا امتحان لازمی نہیں ہے۔ پانچویں جماعت سے کنڑا کو لازمی امتحانی مضمون قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح اقلیتی طلبہ جماعت چہارم تک عملاً کنڑا نہیں پڑھیں گے نتیجتاً مسابقتی دوڑ میں وہ علاقائی زبان کے طلبہ سے پیچھے رہ جائیں گے۔ ضروری ہے کہ اقلیتی طلبہ کو کنڑا تیسری جماعت ہی میں لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے اور اسے امتحانی مضمون قرار دیا جائے۔ حکومت اور کنڑا ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے اعلانات و تیقنات کے باوجود ہنوز کئی اردو مدارس میں کنڑا کے اساتذہ تقرر طلب ہیں۔ اس جانب بھی توجہ کی ضرورت ہے، علاوہ ازیں اقلیتی طلبہ کے لیے سہ لسانی فارمولے کا اطلاق کافی نہیں ہے۔ مادری زبان، علاقائی زبان اور انگریزی کے علاوہ قومی زبان ہندی بھی سیکھنی چاہیے جس کی گنجائش موجودہ نصاب میں نہیں ہے۔ اردو طلبہ کے لیے ہندی سیکھنا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ دونوں زبانوں میں اس قدر قربت و مماثلت ہے کہ اگر ہندی سے ادق سنسکرت شبد اور اردو سے ثقیل عربی، فارسی الفاظ خارج کر دیے جائیں تو دونوں میں صرف رسم الخط کا فرق رہ جائے گا اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ آٹھویں جماعت سے اردو اور ہندی کا مخلوط نصاب ہو جس کے تحت زبان اول کے ۱۲۵ ر نشانات میں سے اردو کے لیے ۱۰۰ ر اور ہندی کے لیے ۲۵ ر نشانات مختص کیے جائیں۔

تمام ماہرین تعلیم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بچے کی تعلیم مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مادری زبان کو بچے کے جسم و جان کا حصہ قرار دیتے ہیں جو بچوں کے ساتھ اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مسلمہ حقیقت کے باوجود اردو بولنے والے والدین کا ایک قابل لحاظ طبقہ اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس کی موجودگی میں انگریزی ذریعہ تعلیم کے مدارس کو کیوں ترجیح دے رہا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی صرف علمی زبان ہی نہیں بلکہ جامعات کا ذریعہ تعلیم بھی ہے۔ اس وقت اعلیٰ، فنی، صنعتی، تکنیکی اور پیشہ وارانہ تعلیم انگریزی کے ذریعے ہی دی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ ریاضی، طبعیات، کیمیا، حیاتیات، طب، ماحولیات، کامرس، کمپیوٹر، الکٹرانکس اور انفارمیشن ٹکنالوجی سے متعلق مقامی و علاقائی زبانوں میں کسی معیاری کتب کا ملنا مشکل ہے جبکہ انگریزی میں ہزاروں کتابیں مل جائیں گی غالباً اسی وجہ سے کوٹھاری کمیشن نے انگریزی کو Library Language کہا ہے۔ یہاں مادری زبان کے بجائے

انگریزی زبان کی وکالت مقصود نہیں ہے بلکہ اپنی زبان کو نظر انداز کرتے ہوئے غیر زبان کو اپنانے کے وجوہ تلاشنے ہیں۔ اکثر والدین کی مادری زبان کے مدارس سے چشم پوشی کا ایک اور سبب یہ ہے کہ ہمارے ان مدارس کا معیار کانونٹ اسکول، سنٹرل اسکول یا نودیاودیالیے سے کم تر ہے۔ ضروری ہے کہ ان مدارس کا معروضی محاسبہ وتجزیہ کیا جائے تاکہ موثر اصلاح کی جانب قدم اٹھائے جائیں۔ مہاراشٹرا کی مثال ہمارے سامنے ہے مہاراشٹرا کے اردو ویس لیس یل سی امتحان میں تنویر غیار، اقبال مستری اور زرین انصاری کی نمایاں کامیابی اور علاقائی زبان کے طلبہ پر ان کی سبقت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس میں بھی مطلوبہ سہولتوں کی فراہمی کے ساتھ صحیح خطوط پر تعلیم دی جائے تو معرکے سر کیے جاسکتے ہیں۔ لہٰذا اردو مادری زبان کے عام مدارس کے معیار کو بلند کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کے نئے ماڈل، معیاری، سوپر اور اقامتی مدارس بھی قائم کیے جائیں جہاں مادری زبان کے مدارس نہیں ہیں وہاں طلبہ کو ناخواندہ رہنے کے بجائے انگریزی یا علاقائی زبان کے مدارس میں داخلہ لے کر زبان دوم یا سوم کی حیثیت سے اردو زبان کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے اردو زبان دوم وسوم کی علاحدہ طور پر درسی کتب مرتب کی جائیں کیونکہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ نصاب اور درسی کتب کی عدم موجودگی کے باعث انگریزی وعلاقائی زبان کے طلبہ اردو کا زبان دوم یا زبان سوم کی حیثیت سے انتخاب نہیں کر سکے۔ ان طلبہ کے لیے گرمائی اسکول کا قیام بھی مفید ہوسکتا ہے۔

ہندوستان جیسے کثیر آبادی کے ملک میں یہ سوال اہمیت رکھتا ہے کہ آیا ہم پہلے تعلیم کو عام کریں یا معیار تعلیم پر توجہ کریں کیونکہ حصول آزادی کے تقریباً ۵۴ سال بعد بھی ملک کے 45% عوام ہنوز ناخواندہ ہیں اور 12 سال کے تعلیمی سفر میں 75% طلبہ قبل از وقت اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ معیار کی بلندی عام تعلیم کے بجائے انفرادی تعلیم کی متقاضی ہے۔ جو تعلیمی ادارے انفرادی تعلیم پر توجہ کر رہے ہیں، وہاں جماعتوں میں نہ صرف طلبہ کی تعداد کم ہوتی ہے بلکہ داخلہ بھی ذہین طلبہ کو دیا جاتا ہے۔ اس طرح کے سوپر اسکولس میں عام طلبہ داخلہ پانے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ عام مدارس کا حال تو ناگفتہ بہ ہے۔ ان دنوں، اصول تعلیم اور محکمہ جاتی قوانین کو نظر انداز کرتے ہوئے بے تحاشا تعلیمی ادارے کھولے جا رہے ہیں۔ جن کی حیثیت ایسے دکانوں کی ہوگئی ہے جو تعلیم کے نام پر تجارت کو فروغ دے رہے ہیں۔ ان اداروں میں نہ صرف طلبہ کی بھیڑ ہوتی ہے بلکہ انتظامیہ اور ارباب مدرسہ کو معیار کی فکر کم ہی ہوتی ہے۔ اکثر مدارس تو عمارت، موزوں اساتذہ،

کتب خانے، لیبارٹری اور ضروری انفراسٹرکچر سے بھی محروم ہیں اس طرح کے مدارس میں بلند معیار کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ یقین ہے کہ آج کی اس کانفرنس میں مسئلہ مذکورہ پر غور وخوض ہوگا، جس کے نتائج تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے رہنمائی کا باعث ہوں گے۔

معیار کی بہتری کے ضمن میں انتظامیہ کے علاوہ والدین اور اساتذہ کا بھی اہم رول ہوتا ہے۔ جب تک ان تینوں میں مکمل ہم آہنگی اور باہمی ارتباط نہ ہو بہتر معیار تعلیم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصیت کے ساتھ نظام تعلیم میں اساتذہ کا کردار مرکزی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ فی زمانہ مختلف علوم میں تیز رفتار ترقی کا سلسلہ جاری ہے۔ ٹی وی، کمپیوٹر، ای میل اور انٹرنیٹ کی وجہ سے بچوں کی معلومات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جارہا ہے۔ اگر معلم تازہ معلومات سے بہرہ ور نہ ہو تو طلبہ کو مطمئن نہیں کر سکے گا۔ معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود مطالعہ کرے اور طلبہ میں درسی کتب کے علاوہ رسائل، معلومات عامہ اور کہانیوں کی کتب لائبریری سے حاصل کرنے یا انھیں بازار سے خریدنے کی ترغیب دے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تربیت بھی معلم کی اہم ذمہ داری ہے بلکہ بچوں کی اخلاقی تربیت اور کردار سازی اس کا ترجیحی فریضہ ہے۔ آج طلبہ میں تعلیم سے عدم دلچسپی کے علاوہ والدین و اساتذہ کی نافرمانی کا جذبہ کارفرما ہے تو اساتذہ میں اخلاص، لگن، ذوق مطالعہ اور بچوں کی خبر گیری کا جذبہ مفقود نظر آتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ پس ماندگی، معاشی، خستہ حالی اور اقدار باختگی ہوسکتی ہے۔ معاشرہ میں بدمعاملگی، بددیانتی، خیانت، جھوٹ، تساہل، دکھاوا اور دیگر مسرفانہ رسوم اس طرح رچ بس گئی ہیں کہ خیر وشر کی تمیز مٹتی جارہی ہے۔ جس کے اثرات سے تعلیمی ادارے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ والدین مدرسہ کے اوقات سے قبل اور بعد اوقات مدرسہ اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزاریں اور ان کی تعلیمی سرگرمیوں پر نہ صرف نظر رکھیں بلکہ ان کی رہنمائی کریں، ابتدا میں طلبہ گھریلو ماحول کے اثرات زیادہ قبول کرتے ہیں مگر جب وہ مدرسے میں داخل ہوتے ہیں تو اساتذہ کا بھی فرض ہے کہ اپنی کارکردگی اور ذمہ داریوں سے عہدہ برائی کا محاکمہ کرتے ہوئے بچوں کی شخصیت کی تعمیر میں حصہ لیں۔ گویا گھر میں ماں اور مدرسے میں استاد بچہ کی تعلیم و تربیت پر زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کس قدر صحیح تجزیہ کیا ہے۔

”جب سب لوگ کسی بچہ کی تعلیم و تربیت سے مایوس ہو جاتے ہیں تو پھر دنیا میں دو

آدمی ایسے ہیں جو اس بچہ سے مایوس نہیں ہوتے ایک اس کی ماں اور دوسرا شفیق استاذ“

اردو میں نصاب سازی کا کام بھی تشفی بخش نہیں ہے۔ روا روی میں مرتبہ ہمارا نصاب نہ صرف ناقص اور از کار رفتہ ہے بلکہ طلبہ کی امنگوں و ضرورتوں کی تکمیل سے قاصر ہے۔ اچھے اساتذہ صرف نصاب اور درسی کتاب پر اعتماد نہیں کرتے۔ ان کا واسطہ تو تعلیمی عمل میں ایک زندہ و متحرک شئے یعنی طالب علم سے ہوتا ہے۔ اس لیے نصاب اور کتاب معلم کے لیے منزل نہیں بلکہ منزل کی نشاندہی کے لیے معاون ہو سکتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نصاب کے مرتبین میں جامعات کے لکچررس، پروفیسرس، ادبا و شعرا شامل کیے جاتے ہیں۔ نصاب اور درسی کتابوں کی ترتیب کے موقع پر ابتدائی مدارس کے اساتذہ کو بھی شریک کیا جانا چاہیے۔

آخر میں ایک معروضہ یہ ہے کہ اردو کی ابتدائی تعلیم کے مسائل کی یکسوئی اور حل کیلئے گلہ شکوہ کرنے کے بجائے ہمیں چوکنا رہنے اور اپنے حقوق کیلئے جدوجہد جاری رکھنی چاہیے کیونکہ اردو بولنے والی اقلیتیں حکومتی اعداد و شمار کے مطابق آدی باسیوں اور نو بدھوؤں کے ساتھ تعلیمی اعتبار سے ہندوستان کی پسماندہ ترین اقلیت ہیں ظاہر ہے کہ اپنی اس تعلیمی و معاشی بدحالی کو دور کرنے کے لیے اقلیتوں کو نہ صرف جہد مسلسل کرنی ہے بلکہ مسابقت کی صلاحیت بھی پیدا کرنی ہوگی۔ زندہ رہنے کے لیے مقابلہ و مزاحمت ضروری ہیں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

اِنَّ اللّٰہ لَایُغَیِّر مَا بِقَومٍ حَتیّٰ یغیروٗ امابانفسھم ط (۱۳،۱۲،۱۱)

واقعی اللہ تعالیٰ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جسے اپنی حالت خود بدلنے کی فکر نہ ہو۔ جہاں تک دستوری تیقنات کا تعلق ہے ہماری جمہوری حکومت کا فرض ہے کہ وہ ملک کی اہم زبان اردو کے ساتھ انصاف کرے۔ جو تیقنات دیے گئے ہیں ان پر عمل آوری بھی تو ضروری ہے۔ بصورت دیگر لسانی اقلیتیں مایوسی کا شکار ہوں گی ایک بڑی اقلیت کی دل برداشتگی خود حکومت کے لیے کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ مشترکہ تہذیب کی اس یادگار زبان سے ناانصافی کا احساس مولانا ابوالکلام آزاد جیسے قدآور قوم پرست رہنما کو بھی تھا۔ چنانچہ انتقال سے چند دن قبل انھوں نے پریڈ گراونڈ کے میدان میں جو آخری تقریر کی تھی وہ اردو ہی کے بارے میں تھی۔

فرمایا تھا" ہندوستان میں اردو کا جو حق تھا وہ اسے ابھی نہیں ملا" کسی زبان کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اسے عوام بھی تسلیم کریں اور حکومت بھی"۔ حکومت سے نمائندگی تو ہمارا آئینی حق ہے وہ تو ہم کرتے رہیں گے۔ مناسب یہ ہے کہ ہم خود اپنی زبان کی بقاو ترویج کیلئے سرگرم عمل ہو جائیں۔ ہمیں اپنی زبان کا خود محافظ بننے کی ضرورت آج جتنی ہے اتنی پہلے کبھی نہیں تھی۔ وہی قوم مصاف زندگی میں سرخرو ہوگی جو جہد مسلسل سے دست کش نہ ہو۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے کس قدر صحیح ترجمانی کی ہے:

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

●●

(مارچ2001ء)

تعلیمی اداروں میں ضبط کا مسئلہ!

ضبط : اگر کسی ملک یا ریاست میں عوام کسی قاعدے یا قانون کے پابند نہ ہوں اوران کی بے جا خواہش اور نفسانی جذبوں کے روکنے کا کوئی ساماں موجود نہ ہوتو وہاں امن اور خوشحالی کے بجائے ہر طرح کی خرابیاں نمودار ہوں گی اس صورتِ حال کو بے ضبطی یا بے ضابطگی کہا جائے گا اسی طرح کسی مدرسے کے طلبہ شترِ بے مہار ہوں، جو جی میں آئے کریں، نہ وقت کے پابند ہوں، نہ سبق کے طلبگار، جماعتوں کی نشست و برخواست میں بے ترتیبی، بے پروائی نمودار ہو، نہ اُستاد کو رُعب سے اور نہ شاگردوں کو اشتیاق سے سروکار ہو تو مدرسے میں بے انتظامی کا دوردورہ ہوگا۔ وہاں تعلیم بے اثر اور ناپائیدار ہوگی۔ طلبہ فارغ التحصیل ہوکر ملک کے لیے مفید ہونے کی بجائے دکھ اور مصیبت کا موجب بنیں گے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ مدرسہ کے ہر کام کے لیے قاعدہ مقرر ہو۔ اور بچے صدق دل سے اس قاعدہ کے پابند ہوں۔ اسی باقاعدگی کا نام......ضبط ہے۔

قدیم تصور: قدیم زمانہ میں ضبط کا تصور نہایت محدود تھا۔ اقتدار کی اطاعت، دوسروں کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل پیرائی اور طلبہ کو بالجبر کنٹرول میں رکھنے کا نام ضبط تھا۔ یہ ضبط جسمانی سزا کے ذریعہ قائم کیا جاتا تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ فرد کو اپنے کردار کی جانچ وتبدیلی سے دلچسپی نہیں اور وہ ایک ایسا جانور ہے جسے ہمیشہ اپنی خوشیوں اور ضروریات کا خیال ہوتا ہے۔ یہ محسوس کیا گیا کہ فرد کے مفادات سماج کے مفادات سے ٹکرائیں گے۔ گویا ضبط سماج کو نقصان پہنچانے سے بچانے کا ذریعہ قرار دیا گیا اور بچوں کے لیے (Spare the Rod & spoil the child) کا اُصول مسلمہ ہوگیا۔ مدارس میں طلبہ کے لیے تخلیقی تقاضوں کے اظہار کے کم مواقع تھے۔ بچوں کی شخصیتوں کو جسمانی سزاؤں کے ذریعہ دبایا جاتا تھا۔ طاقت وقوت ہی ایک ذریعہ تھا جس کے سہارے ضبط قائم کیا جاتا تھا۔

ضبط کا نیا تصور: دورِ جدید میں ضبط کا تصور بالکل مختلف ہے۔ آج ضبط ذہنی برتاؤ طور طریقوں کی تربیت، جبلتوں کا نکھار، صحیح عادتوں کی تشکیل اور اعلیٰ کردار کی نشوونما کا نام ہے جس سے ہم آہنگی، خوشی،

کامیابی اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے ضبط طلبہ کو سزا دینے کا ذریعہ نہیں بلکہ وہ آزادی، خود رہنمائی، اصلیت یا فطرت کو ظاہر کرتا ہے۔ جسمانی سزائیں حقیقی ضبط کا منفی پہلو ہیں۔ مدرسہ میں ٹیچر کا رول فوجی آفیسر یا پولیس مین کا نہیں بلکہ دوست اور رہنما کا ہوتا ہے۔ ممتاز ماہر تعلیم رائبرن کا خیال ہے کہ "طلبہ میں ضبط نفس اور امداد باہمی کی صفات پیدا کی جائیں صحیح ضبط اس وقت قائم ہو سکتا ہے جب کہ طالب علم بھی اپنی مرضی سے اس کے قیام میں دلچسپی لے اور اس کو اس ضرورت کا احساس ہو"۔ حد سے زیادہ پابندیاں طلبہ کو تباہ کر سکتی ہیں اور خوف کے ماحول میں اُن کی تخلیقی صلاحیتیں خشک ہو جاتی ہیں اس لیے بیرونی ضبط سے اجتناب ضروری ہے۔ ماہرین نفسیات جیسے روسو، فروبل، اور مانٹیسوری آزاد نظم و ضبط کے نظریہ پر یقین رکھتے ہیں، ماہرین تعلیم جان ڈیوی اور نن نے بھی وضاحت کی کہ صحیح ضبط دلوں میں تبدیلی کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ضبط شکنی کے اسباب: ان دنوں تعلیمی اداروں میں ضبط شکنی عام ہے۔ اساتذہ سے بدسلوکی مدارس سے فرار، ہڑتال اور گھیراؤ طلبہ کی فطرت ثانیہ بن چکے ہیں۔ حصول آزادی کے ۲۵ سال بعد بھی ہمارے تعلیمی ادارے اس مسئلہ سے نمٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ اگر ہمارے ارباب اختیار اس وقت کوئی موثر قدم نہ اُٹھائیں تو یہ مسئلہ اس قدر سنگین ہو جائے گا کہ جن سے قومی زندگی کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر ہمایوں کبیر نے طلبہ کی ضبط شکنی کے حسب ذیل اسباب بیان کیے ہیں۔

۱۔ **اساتذہ رہنمائی کی خصوصیات سے محروم:** آج کے اساتذہ قدیم زمانہ کے گروجی اور مولوی صاحب نہیں رہے۔ ان کی وقعت میں کمی واقع ہوگئی ہے۔ طلبہ کی نگاہوں میں ان کی حیثیت مزدوروں سے زیادہ نہیں ہے۔ اساتذہ کی شکست خوردگی اور ناکافی تنخواہیں بھی ضبط شکنی کے اہم اسباب ہیں بہت سارے اساتذہ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مجبوراً تدریس کا پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ تجارتی سطح پر اساتذہ کے ٹیوشن اور اساتذہ و ارباب اختیار کے مابین ناخوشگوار تعلقات کے باعث بھی ضبط شکنی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

۲۔ **معاشی مشکلات کی نشونما:** ہندوستان میں تعلیم غیر منفعت بخش ہے۔ جن مسائل کا ملک کو سامنا ہے ان میں بیروزگاری کو خصوصیت حاصل ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام ہماری بہتر معاشی حالت کی ضمانت نہیں دیتا موجودہ تعلیم کے ذریعہ ملک کے نوجوان اپنی روزی پیدا کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ ایمپلائمنٹ

اکسچینج کے اعداد و شمار دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ملک میں تعلیم یافتہ طبقہ فاقہ کر رہا ہے۔ طلبہ کو یہ احساس ہو گیا ہے تعلیم سے فراغت کے بعد بھی انھیں ملازمت نہیں ملے گی۔ اس لیے ان کا ذہن ہمیشہ متفکر و منتشر رہتا ہے۔ ان میں عدم صیانت کا احساس جاگزیں ہو گیا ہے، جس سے ضبط شکنی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

۳۔ **موجودہ تعلیمی نظام میں نقائص:** ہمارا تعلیمی نظام ملک کے تمام حلقوں کی تنقید وں کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ طلبہ کے کردار کی نشو نما میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ موجودہ تعلیمی نظام علم حاصل کرنے کی لگن زیادہ کام کرنے کے لیے جوش اور عقلی طور پر بلند ہونے کا نصب العین پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ ہمارا امتحانی طریقہ بھی ناقص ہے۔ سال کے ختم پر جو امتحان لیا جاتا ہے صرف اسی کے نتیجہ پر طلبہ کی ترقی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ سال بھر طلبہ کی توانائیوں سے خاطر خواہ کام نہ لینے سے وہ غیر سماجی اور غیر منضبط سرگرمیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ طلبہ کی توانائیوں سے استفادہ کے لیے ہمارے مدارس میں ہم نصابی سرگرمیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں کیونکہ آج بھی انہیں تضیع اوقات سمجھا جاتا ہے۔

۴۔ **اخلاقی قدروں سے محرومی:** ہر شعبہ زندگی میں روز بروز اخلاق کا معیار گر رہا ہے۔ تصوریت، اخلاق، نیکی، سچائی، اور حسن صرف کتابوں میں محفوظ ہیں حقیقی و عملی زندگی میں ان کا کوئی تعلق نہیں۔ معاشی دشواریوں، ناقص تعلیمی نظام، تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری، گھر کے خراب ماحول، غلط سماجی اثرات اور اہلِ سیاست کی دخل اندازی کے باعث طلبہ میں اخلاقی گراوٹ پیدا ہو گئی ہے۔

۵۔ **سیاست:** سرگرم سیاست بھی ضبط شکنی کا اہم سبب ہے۔ مہاتما گاندھی جی کا خیال تھا کہ سیاست اور مذہب ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں اور دونوں سچائی کے علمبردار ہیں لیکن آج کل کی سیاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ آج سیاست گھناؤنی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ہمارے طلبہ و اساتذہ اس گندی سیاست کا شکار ہو گئے ہیں۔ نتیجتاً زندگی کے ہر شعبہ میں ضبط شکنی کے جراثیم سرایت کر گئے ہیں۔ ہر سیاسی پارٹی اپنے مقصد و نظریہ کو مسلط کرنے کے لیے طلبہ کو آلۂ کار بناتی ہے حال میں الہٰ آباد ہائی کورٹ کے سابق جج مسٹر ہریش چندر کی صدارت میں ایک کمیشن طلبہ میں ضبط شکنی کے اسباب کی چھان بین کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ کمیشن نے متنبہ کیا ہے کہ سیاسی پارٹیاں تعلیمی اداروں کو اپنی سیاست و رقابت کی آماجگاہ نہ بنائیں۔

۶۔ **اصلاح:** ضبط کے قیام میں منفی طریقے جیسے جسمانی سزا، جرمانے، تنہائی، معافی، معطلی اور اخراج

سے کام نہ لیا جائے۔ اس سے طلبہ میں مایوسی اور احساس کمتری کے جذبات پیدا ہوں گے۔ اس کے برعکس مثبت طریقوں کی حوصلہ افزائی کی جائے حکومت خود اختیاری کے ذریعہ طلبہ کو خود ضبطی سکھائی جائے۔ اساتذہ کی سماجی حیثیت بلند کرنے کے لیے خصوصی اقدامات کیے جائیں۔ معاشی طور پر مطمئن اساتذہ ہی اپنے فرض منصبی کو بہتر طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔ والدین اور اساتذہ کے مابین قریبی ربط قائم ہو تو اچھے نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ نظام تعلیم میں تبدیلیوں کے ذریعہ ہم طلبہ کے جذبات و احساسات کو صحیح سمت میں موڑ سکتے ہیں۔ اساتذہ و طلبہ کے مابین قریبی تعلق، صحت مند ہم نصابی سرگرمیوں، مدرسہ کے پاکیزہ ماحول اور بہتر انتظامات کے ذریعہ ہم ضبط کے قیام میں اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔

ہندوستان کے موجودہ مدارس ضبط کے مسائل سے دوچار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صورت حال طلبہ کو حد سے زیادہ آزادی دینے کا نتیجہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل دو انتہا یعنی یکسر پابندی اور مکمل آزادی کے بیچ میں ہے۔ چھڑی موجود رہے مگر اس کا استعمال نہ ہو۔ خوف ضروری ہے۔ مگر اس کی انتہا نہ ہو طلبہ کو دی جانے والی حد سے زیادہ آزادی خود ان کے حق میں مضر ثابت ہوسکتی ہے۔ ممتاز ماہر تعلیم بیاگلے (Bagley) کہتا ہے کہ "بچہ نابالغ اور بے بس ہوتا ہے اس کے ہاتھ میں اتنی لانبی رسی بھی نہ دی جائے کہ وہ اس کے لیے پھانسی کا پھندا بن جائے۔ ●●

(اپریل 1973ء)

اُردو زبان کی تدریس کے اہم عوامل و مقاصد

زبان، عضو تکلم، آلۂ نطق، وسیلۂ اظہار اور ذریعہ ابلاغ کے ساتھ ساتھ شائستگی کی علامت اور تہذیب کا سرچشمہ بھی ہے۔ اس طرح زبان اور سماج ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ تفکر، تعقل اور وجدان کی قوتوں کا ارتقاء زبان ہی پر منحصر ہے۔ سماجی سائنس دانوں اور دانشوروں نے تعلیم کو سماجی تبدیلی کا ایک موثر آلہ اور شخصیت سازی کا اہم ذریعہ تسلیم کیا ہے۔ صحیح معنوں میں تعلیم کے امکانات اس وقت روشن ہوں گے جب مادری زبان کو ذریعہ بنایا جائے گا۔ کیونکہ ماں کی مادری زبان ہی طالب علم کی زبان اول ہوگی۔

زبان کو ایک عرصے تک جامد مضمون سمجھا جاتا تھا یعنی اس میں تغیر و تبدیلی ممکن نہیں۔ لیکن آج زبان کو ایک زندہ اور متحرک شئے تصور کیا جاتا ہے۔ جو مختلف تہذیبی ماحول میں اپنے مفاہیم بدلتی رہتی ہے۔ اسی طرح الفاظ بھی مختلف سیاق و سباق میں اپنا مفہوم بدل دیتے ہیں۔

زبان کی نشو ونما پر اثرانداز ہونے والے عوامل:

زبان کی نشو ونما بچوں میں یکساں طور پر نہیں ہوتی۔ بعض بچے کم وقت میں بہتر طور پر زبان کی مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور بعض میں لسانی نشو ونما کا عمل سست اور پست رہ جاتا ہے۔

۱۔ زبان کی نشو ونما کے سلسلے میں انفرادی فرق کی اہمیت مسلّم ہے۔ کیونکہ جبلی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ جو بچے چست و چالاک ہوتے ہیں عموماً زیادہ بولتے ہیں۔ اور جو بچے سست اور ناشاد رہتے ہیں عموماً کم بولتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ سے جن بچوں میں زیادہ صلاحیت ہوتی ہے وہ کسی چیز پر دیر تک توجہ مرکوز کر سکتے ہیں۔ اور کسی چیز کے بارے میں بہتر طور پر خیال آرائی کر سکتے ہیں۔

۲۔ ایک صحت مند بچہ بیمار بچہ کے مقابلے میں جلد لسانی مہارت حاصل کرتا ہے۔

۳۔ ماہرین نفسیات کے مطابق حرکی نشو ونما اور لسانی اظہار میں گہرا تعلق ہے۔ اگر بچوں میں حرکی نشو ونما کے مواقع فراہم کیے جائیں تو لسانی نشو ونما کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے۔ اس لیے مدارس میں ایسے مشاغل کا اہتمام ضروری ہے جن سے حرکی نشو ونما ہو سکے۔

۴۔ لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ لڑکیاں لڑکوں سے پہلے بولنا شروع کر دیتی ہیں اور لڑکوں کے مقابلے میں تیزی سے زبان سیکھتی ہیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی جلد زبان کی پختگی حاصل کر لیتی ہیں۔ لڑکوں میں تقریری نقائص خاص طور پر ہکلانے کا نقص زیادہ پایا جاتا ہے۔

۵۔ بچوں کی لسانی نشو ونما میں تہذیب اور ماحول کا بھی بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ بچے عام طور پر زبان، نقالی کے ذریعے سیکھتے ہیں۔ جس گھر کے مکین جس طرح کی زبان بولتے ہیں اسی طرح بچہ بھی بولنا شروع کرتا ہے۔ اور وہی لب ولہجہ اختیار کرتا ہے۔ ایسے گھرانوں میں جہاں صحیح زبان نہیں بولی جاتی بچے بھی غلط زبان بولنے لگتے ہیں۔ اساتذہ کو ان بچوں پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

مقاصد: تدریس اُردو زبان کے مقاصد دو طرح کے ہیں۔ ۱۔ عام مقاصد ، ۲۔ خاص مقاصد

۱۔ **عام مقاصد:** عام مقاصد سے مراد وہ مقاصد ہیں جنکو مجموعی اور عمومی حیثیت سے ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اور ان کے حصول کے لیے کوئی مدت متعین نہیں ہوتی۔ ابتدائی درجوں کے لیے تدریس زبان کے ۴ عام مقاصد ہیں۔

۱۔ آوازوں کے ذریعہ یعنی بول کر مافی الضمیر کے اظہار کی مہارت پیدا کرنا۔

۲۔ علامتوں کے ذریعے یعنی لکھ کر مافی الضمیر کی مہارت پیدا کرنا۔

۳۔ سُنی ہوئی بات کو سمجھ کر تفاعل کی صلاحیت پیدا کرنا۔

۴۔ لکھی ہوئی بات کو پڑھ کر تفاعل پر قدرت حاصل کرنا۔

عام مقاصد کے تحت زبان کی تدریس سے کوئی خاص مہارت یا صلاحیت پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔

خاص مقاصد:

۱۔ **بولنا سکھانا:** ہمارے مدارس میں پڑھنا اور لکھنا سکھانے کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ بولنا سکھانے پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ بولنا سکھانے کے باب میں ذیل کے پہلوؤں پر توجہ ضروری ہے۔

۱۔ بات چیت پر قدرت حاصل کرنا۔

۲۔ بولتے وقت صاف صاف اور صحت کے ساتھ بولنے کی مہارت پیدا کرنا۔

۳۔ صحیح تلفظ کے ساتھ بولنے کی مشق کرنا۔

۴۔ بولتے وقت لہجے پر قدرت حاصل کرنا۔

۵۔ فطری انداز میں بولنے کی عادت ڈالنا۔

ان مہارتوں کو حاصل کرنے کے لیے اساتذہ کو چاہیے کہ (۱) بچوں میں پائے جانے والے خوف کو دور کریں تاکہ وہ بلا جھجک اظہار خیال کر سکیں۔۲) بچے سے گردوپیش کی مانوس اشیاء جیسے کھلونوں، پھلوں، پالتو جانوروں، غذا، لباس اور مانوس شخصیتوں جیسے والدین، بھائی بہن اور دوستوں کے بارے میں گفتگو کی جائے۔ گویا معلوم سے نامعلوم کی طرف اقدام کیا جائے۔۳) بچہ کو اپنی جگہ کھڑے ہو کر جماعت کے سامنے بولنے اور جواب دینے کی مشق کروائی جائے۔۴) مکالمے، لطیفے اور زرین اقوال زبانی یاد کروائے جائیں۔ طلبہ کے سامنے دہرانے کی مشق ہو۔۵) دورانِ گفتگو بچوں کے غلط جملوں کی اصلاح بھی ضروری ہے۔۶) قوتِ گویائی میں نقائص دو اسباب کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا سبب جسمانی نقص کی وجہ سے اور دوسرا لسانی اور جذباتی سبب کی بنا پر۔ا: جیسے بچوں کا ہکلانا عضویاتی سبب ہے۔ دانت اور جبڑے کی بناوٹ کے باعث بچے صاف طور پر الفاظ کی ادائیگی سے قاصر ہیں۔ اساتذہ کو چاہیے کہ ایسے بچوں کے والدین کو مشورہ دیں کہ وہ کسی ماہر ڈاکٹر سے رجوع ہوں۔ جذباتی الجھن اور تفکرات بھی ہکلانے کا سبب ہیں۔ اساتذہ ایسے بچوں کو جماعت میں اظہار کا پورا موقع دیں۔

ب: بچوں کو بعض حروف کی ادائیگی میں دشواری ہوتی ہے۔ مثلاً س، ش، ج، ز، ف اور ق کی آوازیں ٹھیک سے ادا نہیں کر پاتے اس جانب بھی اساتذہ کی توجہ درکار ہے۔

ج: لاڈ و پیار کی وجہ سے بعض بچوں کی گفتگو میں نقص پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ تتلانے لگتے ہیں۔ اساتذہ کو چاہیے کہ ایسے بچوں کو زیادہ اظہار کا موقع دیں اور بولنے میں ان کی حوصلہ افزائی کریں۔

۲۔ **پڑھنا سکھانا:** عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ پڑھنا ایک معمولی اور آسان عمل ہے۔ جس کے لیے کسی خاص توجہ یا اہتمام کی ضرورت نہیں اس کے تحت محض حروف کی آوازوں کو سیکھ لیا جاتا ہے۔ یہ تصور صحیح نہیں ہے۔ یہ ایک پیچیدہ عمل ہے۔ جس کے بارے میں ماہر لسانیات، ماہرین نفسیات اور ماہرین عضویات نے پوری تحقیق کی ہے ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر نام ولیم ایس۔ گرے کا ہے۔ انھوں نے اپنی ساری عمر پڑھائی کی باریکیوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں صرف کی ہے۔ بچہ جب لفظ کی شناخت کرتا ہے۔ تو وہ بصارتی

لفظ کہلاتا ہے۔ اگر لفظ کی شناخت نہ کر پائے تو وہ بصارتی لفظ نہیں کہلائے گا اسی لیے پڑھائی کی جانب زیادہ جتن کی ضروت ہے۔ طلبہ کو چاہیے کہ (۱) صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ ۲) اعراب کے ساتھ پڑھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ ۳) صحیح لہجے پر قدرت حاصل کریں۔ ۴) مناسب رفتار موزوں لب و لہجے کے ساتھ پڑھنے کی مہارت پیدا کریں۔ اس خصوص میں مرحلہ وار بلند خوانی، خاموش مطالعہ، انفرادی عبارت خوانی اور اجتماعی بلند خوانی کی مشق ضروری ہے۔

پڑھنا سکھانے کے لیے حسب ذیل طریقے مروّج ہیں۔

ترکیبی طریقہ: اس طریقہ میں جُز سے کُل کی جانب اقدام کرتے ہیں۔ آغاز میں حروف تہجی سکھاتے ہیں اور حروف سے لفظ سازی کرتے ہیں۔ اسے طریقہ تہجی بھی کہتے ہیں۔

تحلیلی طریقہ: اس میں کُل سے جُز کی جانب اقدام کرتے ہیں۔ جملہ سے کلمہ، کلمے سے لفظ اور لفظ سے حروف کی شناخت کرائی جاتی ہے۔

صوتی طریقہ: اس طریقے کے تحت حروف سکھانے کے بجائے حروف کی آوازیں سکھائی جاتی ہیں۔

مخلوط طریقہ: موجودہ طریقہ تدریس میں ضروری ترمیمات کرلی جائیں۔

۳۔ **لکھنا سکھانا:** زبان کی تدریس کا تیسرا خاص مقصد لکھنا سکھانا ہے۔ اس مقصد کے تحت طلبہ کو چاہیے کہ وہ اپنی تحریر میں ایسی قابلیت پیدا کریں کہ کسی موضوع پر اپنی استعداد اور درجے کے لحاظ سے صحیح جملوں میں خوبصورت اور فکر انگیز خیالات کا اظہار کرسکیں۔ اساتذہ کی رہنمائی میں طلبہ صحیح املا کے ساتھ لکھنے کی مہارت پیدا کریں۔ لکھتے وقت شوشے، دائرے اور مرکز کا خیال رکھیں۔ صحت اور صفائی کے ساتھ لکھنے کی مشق ضروری ہے۔ جہاں ناگزیر ہو بعض حروف پر اعراب بھی لگائیں۔ اہم بات یہ ہے کہ علامت اوقاف (Punctuation) کا خیال رکھیں یعنی سکتہ، وقفہ، رابطہ، ختمہ، سوالیہ، فجائیہ، قوسین اور واوین کا خیال رکھیں۔ اُردو کی تحریریں ان اوقافی علامتوں سے معریٰ نظر آتی ہیں۔

لکھنے کا قدیم مروجہ طریقہ ابجدی طریقہ ہے پہلے بچوں کو حروف تہجی لکھنا سکھایا جاتا ہے اسکے بعد حروف کی طولانی شکلیں سکھائی جاتی ہیں۔ یعنی مفرد سے مرکب کی طرف اقدام کیا جاتا ہے۔ پہلے الفاظ پھر جملے لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ اس تدریس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ نامعلوم سے معلوم کی طرف اقدام ہے

جونفسیاتی اُصول کے خلاف ہے۔ پڑھائی کی طرح لکھائی کی بھی بنیادی اکائی لفظ یا جملہ ہونا چاہیے۔ حروف نہیں، مغربی مفکر پستالوجی کے مطابق حروف لکھنے میں جس قسم کی مہارت درکار ہے وہ خطِ مستقیم و خطِ منحنی کھینچنے سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ لہٰذا اسکی رائے میں لکھنا سکھانے کا آغاز خط کشی سے کیا جائے۔ ٹیڑھی اور سیدھی لکیریں کھینچنے کی خوب مشق کروائی جائے۔ مانٹیسوری کے مطابق بچوں کو لکھنا سکھانے کے لیے حروف کی شکلیں لکڑی یا ریگ مال پر کاٹ لی جاتی ہیں۔ بچے ان پر انگلی پھیرتے ہیں اس طرح حروف کی شکلیں بچوں کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ کھیل کھیل میں لکھنا سیکھ جاتے ہیں۔ ایک اور طریقہ پڑھو اور لکھو بھی ہے۔ نقل نویسی میں بھی خوش نویسی کا لحاظ ضروری ہے۔ تاکہ طالب علم کو خوش خطی کی طرف مائل کیا جاسکے۔ ماہرینِ تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ لکھائی کی ابتدا ڈرائنگ سے کرائی جائے۔ سادہ لکیروں، چوکور، تکونی اور گول شکلوں کی مشق کروائی جائے۔ رفتہ رفتہ حروف اور الفاظ کی ڈرائنگ کرائی جائے۔ اس خصوص میں بروکے قلم کے ذریعے خوش خطی کے طریقے کے احیا کی ضرورت بھی محسوس کی جارہی ہے۔

۴۔ **سمجھنا سکھانا:** زبان کی تدریس کا ایک اور مقصد سمجھنا سکھانا ہے۔ یعنی طلبہ میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ زبان کی ہر تقریر و تحریر کے مفہوم تک جلد رسائی ہو اور کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔ تفہیم کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ ابتدائی درجوں میں تفہیم کا پہلو اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا ثانوی درجوں میں ہوتا ہے۔ ان درجوں میں جملوں کی صحیح ترتیب، سوالات کے صحیح جوابات، اظہار کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب، الفاظ کا جملوں میں مناسب استعمال، ذخیرہ الفاظ، عبارت کی تفہیم وغیرہ تفہیم کے مقاصد میں شامل ہیں۔

ہمارے اساتذہ تربیت یافتہ اور معیارِ قابلیت سے مملو ہیں۔ اس لیے انھیں یہ جتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ نثر کس طرح پڑھائی جاتی ہے؟ تدریس نظم کا کیا طریقہ ہے؟ نظم لطف اندوزی کے لیے پڑھائی جاتی ہے۔ یا سخن فہمی کے لیے؟ انشا کی تدریس کو کس طرح موثر بنایا جاسکتا ہے؟ تدریس قواعد کا کونسا طریقہ کارگر و مفید ہے؟ قواعد استخراجی طریقے سے پڑھائی جائے یا استقرائی طریقے سے؟ عملی قواعد سے کیا مراد ہے؟ زبان کی تدریس میں امدادی اشیاء کا کیا رول ہے؟ ایسے کئی سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اور اسکے ساتھ ہی ہمارے مدارس کی زبوں حالی منہ چڑانے لگتی ہے۔ اساتذہ تربیت پذیری کے باوصف اپنی صلاحیت کو بروئے کار لانے سے گریز کرتے ہیں۔ اگرچہ تدریس کے اُصول انھیں ازبر ہیں۔ لیکن ان پر عمل بھی

توضروری ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر مدارس میں طلبہ زبان کا غلط استعمال کرتے ہیں۔اس کے علاوہ طلبہ میں بولنے میں جھجک ،ان کی عبارت خوانی پُرعیب،تشریح و توضیح غیر تشفی بخش،مطالعہ کا شوق کم ،تحریری خط خراب،املازیادہ تر غلط،خیالات میں ناداری،ذخیرہ الفاظ میں افلاس،تفہیم کمزور اور ذہن ابہامات سے پُر۔ہمارے مدارس میں زبان کی یہ صورت حال ہے،جبکہ ہمارے جمہوری ملک کو آزادی حاصل کیے 66برس گذر چکے ہیں۔اور اکیسویں صدی کا ایک دہا گذر چکا ہے۔

وسائل کی کمی ،والدین کی بے رخی اور انتظامیہ کی بے اعتنائی کا گلہ ہم کب تک کرتے رہیں گے۔بقول ڈاکٹر ذاکر حسین ”اساتذہ ہی امید کی آخری کرن ہیں۔“ ہمارے اساتذہ کو چاہیے کہ فرض شناسی،آگہی اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ صورتِ حال میں تبدیلی لائیں۔بقول اقبال ؎

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

●●

(دسمبر2013ء)

کرناٹک میں اُردو درسی کتابوں کا جائزہ

(پہلی سے بارہویں تک)

کرناٹک میں اُردو کی تدریس کے لیے پہلی جماعت سے ساتویں جماعت تک تین طرح کا نصاب مروج ہے۔ پہلا نصاب ان طلبہ کے لیے ہے جو مادری زبان اُردو کو زبان اول کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ دوسرا نصاب ان طلبہ کے لیے ہے جو پنجم تا ہفتم اُردو کو زبان دوم کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ تیسرا نصاب ان طلبہ کے لیے ہے جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے۔ مگر وہ ششم تا ہفتم اُردو پڑھتے ہیں ثانوی درجات کے لیے یعنی ہشتم تا دہم اُردو زبان اول کے تحت دو طرح کا نصاب مروج ہے۔ پہلا مکمل کورس، دوسرا مخلوط کورس یعنی Composite کہلاتا ہے۔ مکمل کورس کے تحت اقلیتی زبان کے طلبہ اپنی مادری زبان کے علاوہ انگریزی اور علاقائی زبان پڑھتے ہیں۔ اور مخلوط نصاب کے تحت مادری زبان ،انگریزی اور علاقائی زبان کے علاوہ ہندی بھی پڑھتے ہیں۔ ہر دو نصاب کے لیے اُردو میں علاحدہ علاحدہ درسی کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔ تعلیمی سال 72-1971ء سے دہم کے بعد دو سالہ پی۔ یو۔ سی یعنی گیارھویں اور بارھویں کا نیا نصاب شروع کیا گیا اس طرح پی۔ یو۔ سی نصاب Part-I کے تحت طالب علم اُردو کے علاوہ ایک اور زبان منتخب کرسکتا ہے۔

ابتدائی جماعتوں یعنی اول تا چہارم کے طلبہ کو اُردو رسم الخط سکھانا، آسان عبارت سمجھنے، پڑھنے اور لکھنے کے قابل بنانا، ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنا، بول چال کی صحیح اُردو سے روشناس کرانا، بعدازاں اس زبان سے کچھ مختلف معیاری زبان سکھانا، نیز ذہنی استعداد کے مطابق موضوعات پر اظہار خیال کے قابل بنانا مادری زبان کی تعلیم کے مقاصد میں شامل ہے۔ ان مقاصد کے پیش نظر ہماری ریاست میں اُردو کی جو درسی کتابیں حکومت کی سرپرستی میں مرتب کی گئی ہیں وہ اس معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ ''پہلی کتاب'' میں حرف شناسی کے لیے ''دیکھو اور بولو'' کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ ابتدا مخلوط حروف کے الفاظ سے کی گئی ہے۔ جیسے انار، حویلی وغیرہ۔ بہتر یہ ہے کہ ابتدا مفرد حروف سے کی جائے جیسے دادا، دوات، ورق وغیرہ مشکل اور مخلوط

الفاظ جیسے حویلی، طبیل، صغیر وغیرہ سے اجتناب مناسب ہے۔ حرف شناسی کے بعد الفاظ کی شناخت کا مرحلہ آتا ہے۔ الفاظ کی تشکیل سے پہلے مفرد و مخلوط، ہم آواز و مختلف آواز حروف کی تمیز پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ حروف صحیح اور حروف علت کی آمیزش سے ابتدا میں ہم آواز ہم وزن الفاظ روشناس کروائے جائیں۔ اس طرح کی مشقوں کے ذریعہ جب ذخیرہ الفاظ میں قابل لحاظ اضافہ ہو تو جملے تشکیل دیئے جائیں مگر زیرِ نظر پہلی کتاب میں تیسرے سبق ہی سے جملوں کی ساخت کا آغاز ہوا ہے۔ اسی طرح موضوعاتی اسباق کے شروع کرنے میں بھی عجلت سے کام لیا گیا ہے۔ 56 صفحے کی اس کتاب میں 30 سے زاید صفحات موضوعاتی اسباق پر محیط ہیں۔ دوسری کتاب کی ضخامت بھی قدرے زیادہ ہے۔ تیسری اور چوتھی کتاب کا بھی یہی حال ہے۔ مجموعی طور پر نصاب زیادہ اسباق پر مشتمل ہے اس لیے نہ صرف اسباق کی تعداد میں کمی کی ضرورت ہے بلکہ ان کا متن بھی قدرے کم ہونا چاہیے۔ فہرستِ مضامین کا آغاز تیسری کتاب سے ہوا ہے۔ پہلی اور دوسری کتاب میں بھی مضامین کی فہرست دی جا سکتی ہے۔ جماعت دوم ہی سے سبق کے اختتام پر نئے الفاظ کے معنی دیے گئے ہیں۔ دوسری اور تیسری کتاب میں دیے گئے بعض الفاظ کے معنی ہماری خصوصی توجہ کے طالب ہیں۔ جیسے

خفا = غصہ ، خلیفہ = مسلمانوں کا بادشاہ ، بالکل = بہت ہی

عقیدت = ایمان ، مسافت = طئے کیا ہوا فاصلہ

اس طرح یہ جملے بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

۱۔ وہ اس کو اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے انجکشن دلوائے

۲۔ وہ ہم پر غصہ نہیں ہوئے۔

۳۔ خلیفہ نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی تھی۔

۴۔ سب نے مل کر کھائے

۵۔ چیچک کے علامات کیا ہیں۔

مشقی سوالات کا آغاز بھی دوسری کتاب سے ہوتا ہے۔ زیادہ تر سوالات موضوعاتی اور اعادی نوعیت کے ہیں۔ مقصدی طرز کے سوالات کا آغاز چوتھی جماعت سے کیا گیا ہے۔ دوسری اور تیسری کتاب

کی مشقوں میں بھی اس قسم کے سوالات کا عنصر زیادہ ہونا چاہیے۔ عملی کام کے سوالات کا آغاز دوسری کتاب سے ہوا ہے۔ مگر عملی کام کے لیے علاحدہ ''ورک بک'' موجود نہیں ہے۔ جس کی شدت سے ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ نیز تحریری مشق کے علاوہ زبانی مشق کے لیے بھی سوالات شامل کیے جائیں۔ ابتدائی جماعت کی ان درسی کتابوں میں توضیحات (Illustrations) عموماً متعلق وموزوں ہونے کے باوجود دلکشی و دیدہ زیبی سے محروم ہیں۔ پہلی کتاب کے صفحہ 4 پر صغیر کی وضاحت کے لیے جوتڑ کے کی تصویر دی گئی ہے وہ سپاہی معلوم ہو رہا ہے اسی طرح دوسری کتاب میں نظم کا موضوع ہے ''ماں باپ کی اطاعت'' مگر تصویر صرف ماں اور بچہ کی دی گئی ہے۔ اسی کتاب میں چڑیا گھر کے لیے جو توضیح دی گئی ہے اس میں چند بچوں کو یونیفارم میں گیٹ کے باہر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ صرف پہلی اور دوسری کتاب میں تصاویر رنگین ہیں۔ تیسری کتاب سے سیاہ وسفید خاکوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چوتھی کتاب میں توتا، مینا اور کوئل کی جو تصاویر دی گئی ہیں ان میں تمیز مشکل ہوگئی ہے۔ اس لیے رنگین تصاویر کا استعمال چوتھی کتاب تک ہو تو مناسب ہے۔ تصویری خاکے صرف ساتویں کتاب تک دیے گیے ہیں۔ ثانوی جماعت کی کتابوں میں بھی جہاں ضروری ہو خاکے شامل کیے جائیں۔ جہاں تک قواعد کا تعلق ہے فی الوقت ہماری ریاست میں کسی بھی اُردو جماعت کے لیے قواعد کی علاحدہ کتاب نہیں ہے۔ قواعد کا آغاز تیسری جماعت سے ہوتا ہے۔ ہر سبق کے اختتام پر عملی قواعد کی مثالیں دی گئی ہیں۔

جماعت پنجم تا ہفتم کی کتابوں کے عام موضوعات مذہب، سائنس، کھیل، تہوار، مہم پسندی، شخصیات وحیوانات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کتابوں میں قصے کہانیوں کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ خصوصاً جماعت ہفتم کی کتاب سوانحی مضامین و شخصیات سے پُر ہے۔ البتہ اس کتاب میں وضاحتی خاکے (Illustrations) موثر اور فنکارانہ ہیں۔ لسانی، موضوعاتی اور اعادی مشقی سوالات ہر سبق کے اختتام پر دیے گیے ہیں۔ جس میں تفصیلی مختصر جوابی اور مقصدی طرز کے سوالات بھی شامل ہیں۔ البتہ ارتقائی، نتائجی اور تشخیصی سوالات کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کتابوں میں بھی جگہ جگہ غلط محاورے اور زبان وبیان کی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔ مثلاً ساتویں کی کتاب کا یہ جملہ ''جو نیک ہیں جو بنی نوع انسان کی خدمات کرتے ہیں''۔ توجہ طلب ہے۔ قواعد کا جو نصاب ہے اُس کی مدد سے بچہ ہفتم کے اختتام پر تحلیل صرفی کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

ثانوی درجوں کے لیے چونکہ دو طرح کا نصاب ہے اس لیے مکمل نصاب کے تحت ہشتم تا دہم انیس ادب حصہ اول تا سوم اور مخلوط نصاب کے تحت سرمایہ اُردو حصہ اول تا سوم نصاب میں شامل ہے۔ انیس ادب حصہ اول (برائے ہشتم) کے موضوعات میں بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ جہاں محنت کی تعظیم، مذہبی اقدار، اختراع وایجاد، قدیم یادگاروں اور قومی قائدین پر مضامین ملتے ہیں۔ وہاں ''چچا چھکن کی عینک'' سے طلبہ کو طنز و مزاح سے روشناس کیا گیا ہے۔ فہرست کے حصہ نثر میں قلمکاروں کے نام نہیں دیے گئے جبکہ شعراء کے نام درج کیے گئے ہیں۔ مضمون نگار و شاعر کا تعارف سبق کے اختتام پر دیا گیا ہے۔ اگر یہ تعارف سبق کی ابتدا میں دیا جائے تو مناسب ہے۔ اس کتاب میں مولوی عبدالحق کے تعارف کے سلسلے میں یہ جملہ ملاحظہ ہو۔

''کچھ عرصے تک نظام کالج اورنگ آباد کے پرنسپل ہوے۔'' ابھی حیدرآباد سے نظام کالج کی اورنگ آباد منتقلی کا غم غلط نہ ہوا تھا کہ کاتب کی نوازش سے سبق ''میوہ فروش'' میں قریبی رشتہ دار ''فریبی'' رشتہ دار قرار دیے جاتے ہیں۔ گیارھویں جماعت کی کتاب میں اسی کتابت کا کرشمہ ہے کہ علمی گھرانے کے ایک فرد مولوی محمد حسین فلمی گھرانے سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ اور ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کی کتاب ''ابہام کے مسائل'' الہام کے مسائل ہو جاتی ہے۔ درسی کتابوں میں اس قسم کی کرشمہ سازیاں بھی ہمارے لیے لمحہ فکر ہیں۔ کیا پروف ریڈنگ کے ذریعہ ان دشواریوں پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ ہم کب تک صرف کاتبوں کو نشانہ بناتے رہیں گے۔ قابل ذکر کتاب تو انیسِ ادب برائے نہم ہے۔ 268 صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب ''تدریسی چبوترہ'' معلوم ہوتی ہے۔ جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ میری دانست میں اس کا شمار قابل ضبطی کتابوں میں ہونا چاہیے۔ اس بھاری بھرکم کتاب کا حجم ''انیسِ ادب برائے دہم'' سے بھی زیادہ ہے کیوں کہ دہم کی کتاب تو صرف 224 صفحات کی ہے۔ پتا نہیں کیوں اس کتاب میں شبلی کا مضمون ''مصر کی قدیم یادگاریں'' دوبارہ شامل کیا گیا ہے۔ جبکہ یہی مضمون انیس ادب برائے ہشتم میں بھی شریک ہے اور طلبہ پڑھ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک ہی مضمون نگار (عبدالحلیم شرر) کے دو مضامین ''اچھائی اور برائی'' اور ''مغرور جوتا'' اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ کسی بھی ادیب و شاعر کا نام نہ فہرست میں درج ہے اور نہ ہی اسباق میں۔ طلبہ اور اساتذہ کو آخر وقت تک پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس کی تخلیقات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اس کتاب کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ابتدا میں مہین اور آخر میں دبیز کاغذ استعمال کیا گیا

ہے۔گویا صوری اور معنوی حیثیت سے یہ کتاب دوعملی کا شکار ہوگئی ہے۔

درسی کتابوں کی ترتیب کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرتبین یہ دیکھنے یا جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ طلبہ پچھلی کتابوں میں کونسے مضامین پڑھ چکے ہیں۔اور آئندہ کونسے پڑھنے والے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہماری درسی کتابوں میں من وعن مضامین کی تکرار و اعادہ ملتا ہے۔مخلوط نصاب کی کتاب ''سرمایۂ اُردو'' برائے ہشتم ونہم دونوں میں میر کی غزل:

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا

لہو آتا ہے جب نہیں آتا

شریک ہے۔ولی دکنی کی غزل:

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا

ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

بہ یک وقت انیس ادب دہم اور بارھویں جماعت کی کتاب ''فانوسِ ادب'' دونوں میں شامل تھی۔اسی طرح اصغر گونڈوی کی غزل:

ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرحِ زباں رکھ دی

زبان بے نگہ رکھ دی نگہ بے زباں رکھ دی

گیارھویں اور بارھویں دونوں جماعتوں کی کتاب میں شامل ہے اس طرح کی تکرار کے باعث درسی کتاب سے طلبہ کی عدم دلچسپی فطری امر ہے۔درسی کتابوں میں افراط وتفریط کی ایک اور مثال بھی ہمارے لیے رہنمائی کا باعث ہوسکتی ہے۔کہ گیارھویں جماعت کی کتاب ''بہارِ ادب'' میں افسانہ یا ڈرامہ نام کی کوئی چیز نصاب میں شامل نہیں ہے۔جبکہ بارھویں جماعت کی کتاب کا کل نثری حصہ صرف تین ڈراموں پر مشتمل ہے۔اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ Non Detailed (سرسری مطالعہ) کی کتاب میں بھی صرف دو ڈرامے دیے گئے تھے۔بارھویں جماعت کی کتاب میں ڈراموں کی بہتات ہے تو گیارھویں جماعت میں 63 منظومات کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔اگر طلبہ واساتذہ درسی کتاب میں دلچسپی نہ لیں یا اس سے بے اعتنائی کا مظاہرہ کریں تو اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ہمارے تعلیمی اداروں میں آج بھی درسی کتاب ہی

تدریس واکتساب کا نہایت اہم اور موثر آلہ ہے۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ As the Text book So the Teaching and Learning امریکہ کے بعض ماہرین تعلیم نے Bookless School کا تجربہ بھی کیا مگر بالآخر وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ درسی کتاب کو تعلیمی نظام سے یک لخت خارج نہیں کیا جا سکتا۔ آج سائنس اور صنعت کی غیر معمولی ترقی کے باعث ہمارا سماج نت نئی تبدیلیوں سے دو چار ہے۔ جد وسعی، اختراع وایجاد کے اس دور میں انسانی فکر کے دھارے بھی بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔اس تبدیلی سے نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہماری درسی کتابوں کو بھی نئی تبدیلیوں کا بھی آئینہ دار ہونا چاہیے۔ ادق ترجموں، بے لطف مضامین اور ایک ہی نہج پر لکھی ہوئی نظموں اور غزلوں سے معمور درسی کتابیں طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے بے سود ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ درسی کتاب کیسی ہو؟ ماہرین تعلیم کے مطابق اسے Child Centred ہونا چاہیے یعنی وہ بچے کی عمر، صلاحیت ، استعداد، اور دلچسپی سے ہم آہنگ ہو۔ یہ کتاب نہ صرف امتحان پاس کرنے کا ذریعہ بنے بلکہ طلبہ اس کے مطالعہ سے لطف اندوز بھی ہو سکیں۔ کتاب پڑھنے والے تنگ اور محدود دنیا میں غوطہ زن نہ ہوں۔ بلکہ خارجی دنیا سے بھی آگاہی حاصل کریں اور ان کے دماغ وقلب کو روشنی مل سکے اور وہ بھی بلند پروازی میں غالبؔ کی ہمسری کر سکیں:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
کاش کہ پرے ہوتا عرش سے مکاں اپنا

••

(مارچ/1982ء)

بین قومی اردو میڈیا کانفرنس : تجارتی امکانات و مواقع

مہمانِ خصوصی : عزت مآب کے رحمٰن خان صاحب ڈپٹی چیرمین راجیہ سبھا

مہمانانِ اعزازی، دانشوران ملک وملت، خواتین وحضرات

آپ سب ہی واقف ہیں کہ ہم آج اردو پریس کلب نئی دہلی کی جانب سے بین قومی اردو میڈیا کے ایک اہم موضوع ''تجارتی امکانات اور مواقع'' پر منعقدہ کانفرنس میں شرکت کے لیے یکجا ہیں۔ جس میں مہمان خصوصی اور مہمانانِ اعزازی کے علاوہ پرنٹ اور الکٹرانک میڈیا سے وابستہ دانشوروں نے نہ صرف شرکت فرمائی بلکہ اپنے موثر خیالات کا اظہار فرمایا۔ تمام مقررین کے خیالات کا اجمالی جائزہ لینے سے قبل، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو میڈیا کے تاریخی رول اور آئندہ اس کے امکانات کا جائزہ لیا جائے۔

سامعین کرام: اردو نہ صرف برصغیر کی اہم زبان ہے بلکہ اپنی وسعت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے اُسے عالمی درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ اُس کے بولنے والے دنیا کے گوشے گوشے میں آباد ہیں۔ ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے اعتبار سے ہمارے ملک میں اردو بولنے والوں کی تعداد 60 تا 70 ملین تھی، ۲۰۱۱ء کے اعداد شمار ابھی منظر عام پر نہیں آئے لیکن اب یہ تعداد 80 تا 90 ملین سے تجاوز کر گئی ہے۔ ملک کی پانچ ریاستوں بہار، جھارکھنڈ، آندھرا پردیش، جموں وکشمیر اور دہلی میں اردو سرکاری اغراض کے لیے استعمال کی جارہی ہے۔ یہ زبان 300 سے زائد ممالک بشمول ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، خلیجی ممالک، ایران، افغانستان، ملائشیا، نیپال، سری لنکا، میانمار، امریکہ، کنیڈا، برطانیہ، جنوبی افریقہ وغیرہ میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

میڈیا کے دونوں اجزا، پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کا اردو دنیا میں خاص رول ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اردو صحافت کی اپنی ایک تاریخ ہے، انیسویں صدی کے اوائل میں جاری، منشی سدا سکھ لال کے ''جام جہاں نما'' (کلکتہ) سے اکیسویں صدی کے اوائل میں جاری، کے بی این ٹائمز (گلبرگہ) تک اردو صحافت نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔ خصوصاً جدوجہد آزادی میں اس کے رول کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ''انقلاب زندہ باد'' کے تناظر میں اردو صحافیوں نے قوم کو بیدار کیا اور تحریک آزادی کے سلسلے میں انگریز

سامراج کا ظلم وستم سہا۔ انھوں نے قید وبند کی صعوبتیں جھیلیں، اُن کے اخبارات کے پریس جلائے گئے اور ان کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ اردو صحافیوں کو سخت اور اذیت ناک مرحلوں سے گزرنا پڑا مگر انھوں نے حوصلہ نہیں ہارا بلکہ آزادی کا ہراول دستہ بن کر ملک کو آزادی سے ہمکنار کیا۔ پہلی جنگ آزادی کے موقع پر دلی اردو اخبار کے اڈیٹر مولوی محمد باقر انگریز سامراج کی مخالفت کرتے ہوئے دشمنوں کی گولی کا نشانہ بنے۔ یقیناً اردو صحافیوں کی یہ قربانیاں ہماری تاریخ کا ایک اہم باب ہیں، شاعر یہ کہنے میں حق بجانب ہے:

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے

وہ قرض چکائے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

بیسویں صدی کے ربع اوّل میں ظفر علی خاں کے زمیندار، مولانا محمد علی کے ہمدرد مولانا حسرت موہانی کا اردوئے معلی، مولانا آزاد کے الہلال والبلاغ، شوکت علی کا خلافت، عبدالماجد دریابادی کے سچ اور صدق، قاضی عبدالغفار کا پیام، مولانا محمد عثمان فارقلیط کا الجمیعۃ، مہاشئے کشن کا پرتاب، لالہ خوش حال چند کے ملاپ اور دیگر اخبارات نے جہاد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آزادی کے فوری بعد ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے قوم کو "آرام حرام ہے" کا نعرہ دیا تو اردو صحافی ملک کی تعمیر نو میں جٹ گئے۔ آج شمال سے لے کر جنوب تک کئی اخبارات خصوصاً ہند سماچار، اخبار مشرق، راشٹریہ سہارا، عظیم آباد ایکسپریس، سیاست، منصف، رہنمائے دکن، اعتماد، انقلاب، اردو ٹائمز، سرینگر ٹائمز، آفتاب، پاسبان، سالار، اورنگ آباد ٹائمز، انقلاب دکن، کے بی این ٹائمز و دیگر اخبارات ملک کے استحکام اور تہذیبی اقدار کی پاسداری میں اپنا حق ادا کر رہے ہیں۔ آج ہندوستان میں اردو رسائل واخبارات کی تعداد تقریباً تین ہزار تک پہنچ گئی ہے اس کے علاوہ پاکستان میں جنگ، نوائے وقت، ملت اور اردو پوئنٹ کے علاوہ اردو کی نئی بستیوں سے بھی اخبارات ورسائل منظر عام پر آرہے ہیں نیویارک سے شائع ہونے والے اخبارات میں اردو ٹائمز، اردو خبریں، اردو نیوز، آزاد، عوام، ایشیا، صدائے پاکستان، ماہنامہ انکشاف واشنگٹن سے اردو پوئنٹ لندن سے اردو ٹائمز اردو پوئنٹ کینیڈا کا ہفتہ وار لیڈر، جدہ کا اردو نیوز اور دوحہ کے روزنامہ الشرق اور ہفتہ وار سمندر پار کو خصوصیت حاصل ہے۔ یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔

بقول شاعر

ہم ہیں وابستگانِ زلفِ دراز
دور تک سلسلہ ہمارا ہے

جہاں تک الکٹرانک میڈیا کا تعلق ہے، اس کے اثر ورسوخ کے باعث موجودہ دور کو اطلاعاتی دھماکوں کا دور کہا گیا ہے۔ فلم، ریڈیو، ٹی وی، فیاکس، ای میل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ویب سائٹ، سوشل نیٹ ورکنگ، سائٹ (فیس بک، ٹوئٹر) وغیرہ کا شمار الکٹرانک میڈیا میں ہوتا ہے۔ انٹرنیٹ اگرچہ ۱۹۶۹ء میں شروع ہوا لیکن ۱۹۸۹ء میں ویب سسٹم کے آغاز سے یہ گلوبل کمیونیکیشن کا اہم ذریعہ بن گیا۔ ان ذرائع ابلاغ کی فراوانی کے سبب دنیا ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل ہوئی ہے۔ گویا الکٹرانک میڈیا نے دنیا کو گھر آنگن میں بدل کر رکھ دیا ہے۔ آج گھر کے دریچوں سے سارے عالم کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ انٹرنیٹ سے مختلف ممالک میں حائل حد بندیوں کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔ اس نئے معاشرہ کے فرد کو نیٹی زن اور سائبر مین کہا جا رہا ہے۔

مقام مسرت ہے کہ آج (۲۶ رمئی ۲۰۱۱ء) کی شام ''تجارتی امکانات ومواقع'' کے موضوع پر اردو پریس کلب نئی دہلی انڈیا کے زیر اہتمام ایک بین قومی اردو میڈیا کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کانفرنس کا اہم مقصد اردو زبان کی اہمیت ووسعت سے عالمی سماج کو واقف کراتے ہوئے اُن فوائد سے آگاہ کرنا ہے جو اس زبان کے ذریعے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ آج زندگی کا دارومدار میڈیا ہی پر ہے۔ جنگ ہو یا امن یا اشیا کی مارکیٹنگ کا معاملہ، میڈیا کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ آج میڈیا سب سے بڑی صنعت بن کر اُبھر رہا ہے۔ ہم اشیا کی خرید وفروخت کے لیے میڈیا کا کامیاب استعمال کر سکتے ہیں۔ آج میڈیا کے باعث بڑی تجارتی کمپنیوں میں تعلقات عامہ کے دفاتر کے قیام کے علاوہ اہلکار، مترجمین و منتظمین کی حیثیت سے کام کرنے کے مواقع بڑھ گئے ہیں۔ علاوہ ازیں اشتہارات نے تو آج کے دور میں باضابطہ فن کی صورت اختیار کر لی ہے، جس کے ذریعے تاجر اور گاہک ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں۔ F.M. ریڈیو کی مقبولیت ہمارے سامنے ہے، علاوہ ازیں ای ٹی وی اردو، زی سلام، سہارا، منصف اور دور درشن چینلس، عوامی ضروریات کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ مزید چینلس کے قیام کے امکانات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے، جس سے

تجارت کو فروغ حاصل ہوگا۔

حاضرین کرام! آج کی اس کانفرنس میں مہمان خصوصی اور مہمانانِ اعزازی کے علاوہ پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا سے وابستہ عظیم شخصیتیں شریک ہوئیں اور اپنے اظہار خیال کے ذریعے مشوروں سے نوازا۔ جناب طارق فیضی، معتمد عمومی اردو پریس کلب اور جناب رضوی کی رپورٹ سے کانفرنس کی غرض وغایت اور اردو پریس کلب کی کارکردگی روشن ہوئی۔ جناب اے آر شاہین صدر نشین اردو پریس کلب نے واضح کیا کہ اردو اپنی طاقت سے زندہ ہے انھوں نے اردو کو تجارتی صلاحیتوں کی حامل زبان قرار دیا اور کہا کہ میڈیا میں نئی ٹکنالوجی کی وجہ سے اردو کے ذریعے تجارت کو فروغ دینے کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ جناب لیس جی سنگھ ہیڈ آف چینل آپریشن، ای ٹی وی اردو نے شستہ لب ولہجے میں نہایت روانی کے ساتھ اردو میں تقریر کی۔ انھوں نے اردو ای ٹی وی کی ابتدائی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ اردو میں بے پناہ صلاحیت وطاقت ہے انھوں نے تیقن دیا کہ ای ٹی وی اردو کی انفرادیت باقی رہے گی۔ جناب وارث احمد خاں ڈپٹی ڈائرکٹر اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی نے اردو کی ترقی میں فلم، پارسی تھیٹرس اور اردو ڈراموں کے رول کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج آن لائن میڈیا کا زمانہ ہے اردو میڈیا سے تجارت کا آغاز ہو چکا ہے اردو میڈیا کو ہم مزید فروغ دیں گے تو تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ جناب اسد رضا اڈیٹر راشٹریہ سہارا نے کہا کہ ۲۱ ویں صدی مارکیٹنگ کی صدی ہے۔ اردو کی ریڈر شپ کو بڑھانا چاہیے اردو کی مقبولیت وسعت، تجارت میں فروغ کا باعث ہوگی۔ ڈاکٹر معراج الدین احمد سابق کابینی وزیر یوپی نے اردو کو زندگی کی علامت قرار دیا اور کہا کہ اردو جذبہ کی زبان ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مقبول عام ہو رہی ہے اس کے ذریعے تجارت کو فروغ دینے کے مثبت امکانات ہیں جناب سراج الدین قریشی، صدر نشین اسلامک سنٹر، نئی دہلی نے کہا کہ اردو کا مستقبل اردو کی تعلیم پر منحصر ہے اردو کے بہی خواہوں کو چاہیے کہ اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کا اہتمام کریں۔ مہمان خصوصی جناب کے رحمٰن خاں ڈپٹی چیئرمین راجیہ سبھا نے کہا کہ ہمارے ملک میں اردو دس کروڑ لوگوں کی مادری زبان ہے اس کی مقبولیت کا راز اس کی تہذیب وشائستگی میں ہے۔ ہمارے ملک کے علاوہ مزید ۳۵ ممالک میں یہ زبان پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے دائرہ کو مزید وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس راہ میں کوئی مشکلات ہوں تو قابو پا کر آگے بڑھنا چاہیے، جناب رحمٰن خاں

صاحب نے زور دے کر کہا کہ اردو کی مقبولیت کو باقی رکھتے ہوئے اس کی وسعت اور فروغ کے لیے کام کریں تو تجارت میں بھی کامیابی حاصل ہوگی۔

سامعین کرام! مجھے امید ہے کہ آج کے اظہارات، مذاکرات و مباحث کی روشنی میں مقاصد کے حصول کی جانب پیش رفت ہوگی اور یہ کانفرنس یقیناً بین قومی اردو میڈیا کے ذریعے معاشی و تجارتی ترقی اور سماجی قلب و ماہیت کے لیے بنیاد فراہم کرے گی۔

میں ارباب اردو پریس نئی دہلی کا سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے اس بین قومی اردو میڈیا کانفرنس میں بہ حیثیت صدر، اپنے خیالات کے اظہار کا موقع فراہم کیا۔ شکریہ ●●

(خطبہ صدارت، دوبئی یو اے ای، 26 مئی 2011ء)

ج ۔ تبصرے

میراں جی شمس العشاق

پروفیسر محمد ہاشم علی

دکھنیات کے جواں سال محقق اور ادیب جناب محمد ہاشم علی کی یہ دوسری تصنیف ہے۔ ۱۹۶۶ء میں موصوف نے دکن کے شیخ کامل وصوفی واصل میراں جی شمس العشاق کی دو مثنویوں ''مغز مرغوب وچہار شہادت'' کو مرتب کر کے اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا جسے ملک کے علمی وادبی حلقوں نے تحقیقی کارنامہ قرار دیا۔ جس طرح مولوی عبدالحق نے پہلے نصرتی کی ''گلشن عشق'' کو مرتب کیا بعد میں نصرتی پر ایک مستقل کتاب لکھی، اسی طرح محمد ہاشم علی صاحب نے دکن کی اس برگزیدہ ہستی کی حیات، شخصیت اور تصانیف کے بارے میں ''میراں جی شمس العشاق'' کے نام سے ایک علاحدہ جامع ومفصل کتاب تصنیف فرمائی ہے تاکہ نہ صرف شیخ دکن کی شخصیت کی ہر جہت پر روشنی پڑے بلکہ اس عظیم ہستی کے اصل نام، سنہ پیدائش، سنہ وفات اور ان کی مختلف تصانیف کے بارے میں محققین میں جو اختلاف رائے موجود ہے اس کا تنقیدی جائزہ لے کر قطعی رائے قائم کی جاسکے۔ یقیناً محمد ہاشم علی صاحب نے اپنے سائنسی رجحان، دل نشیں انداز بیان اور مثبت استدلال کے ذریعہ میراں جی شمس العشاق کے بارے میں جو قولِ فیصل دیا ہے اس سے اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اگرچہ مصنف موصوف نے اپنے لیے ادب کی اس صنف کا انتخاب کیا ہے جسے ناہموار اور سنگلاخ کہہ سکتے ہیں مگر جستجو، تگ ودو، اور کاوش کے ذریعہ وہ اس میدان میں بھی سرخروئی حاصل کررہے ہیں۔ بلاشبہ ان کی یہ تصنیف اُردو کے تحقیقی سرمایہ میں نہ صرف قابلِ قدر اضافہ ہے بلکہ بحیثیت محقق مصنف کے درجہ ومقام کے تعین میں بھی ممد ومعاون ہوسکتی ہے۔

کتابت وطباعت کی نفاست اور سرورق کی دیدہ زیبی کے لیے شالیمار پبلی کیشنز ذمہ دار ہے۔ جس کا شمار ملک کے معیاری اشاعتی اداروں میں ہوتا ہے۔

●●

(مارچ 1975ء)

سائے اور ہمسائے

یوسف ناظم

''سائے اور ہمسائے'' ممتاز مزاح نگار یوسف ناظم کی پانچویں تصنیف ہے جو ''کیف وکم'' (۱۹۶۳ء) ''فٹ نوٹ'' (۱۹۶۹ء) ''دیوارِیے'' (۱۹۷۱ء) ''زیرِ غور'' (۱۹۷۳ء) کے بعد نومبر ۱۹۷۶ء میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ ویسے اگر آپ یوسف ناظم کو نصف درجن کتابوں کا مصنف قرار دینا چاہیں تو بچوں کے لئے لکھی گئی ان کی ایک کتاب کو بھی اس فہرست میں شامل کر سکتے ہیں۔ مزاح نگار یوسف ناظم 'سائے اور ہمسائے' میں خاکہ نگار کے روپ میں جلوہ گر ہیں۔ یوں بھی خاکہ نگاری کا مزاح اور طنز سے گہرا علاقہ ہے۔ اُردو ادب میں ایسے خاکوں کو امتیاز حاصل ہے جن میں مزاح کی پھلجھڑیاں اور طنز کی چوٹیں شامل ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین نے خاکہ نگاری کے عمدہ نمونے فراہم کیے ہیں۔ یوسف ناظم اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں خوش رنگ اور خوش طبع۔

دیگر اصنافِ سخن کی طرح خاکہ نگاری بھی انگریزی سے اُردو ادب میں داخل ہوئی ہے۔ مگر اسے اپنی انفرادیت اور وجود کا احساس بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوا کیونکہ اس سے قبل کے دور کو ہم سوانح اور تذکروں کا دور کہہ سکتے ہیں۔ خاکہ نہ تو مدح سرائی ہے۔ اور نہ نثری ہجو، سوانح عمری ہے نہ تاریخ، انٹرویو ہے نہ شخصی ملاقات کا ذکر، بلکہ ایک نفسیاتی مطالعہ ہے جس کے ذریعہ کردار اپنی اصلی شکل میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ خاکہ میں کسی کردار سے قربت و وابستگی کے باوجود بے تعلقی ضروری ہے تب ہی ہم کسی شخصیت کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کر سکتے ہیں۔

یوسف ناظم کے خاکوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ احساس ہوتا ہے اشفاق حسین، مخدوم اور باقر مہدی اس مجموعہ کے سب سے عمدہ خاکے ہیں۔ 'جاں نثار اختر' خاکہ کم، ان کی رباعیوں کا مجموعہ ''گھر آنگن'' پر

تبصرہ زیادہ ہے۔اسی طرح سلیقہ مند (لطیف ساجد) بھی ایک ایسا خاکہ ہے جس میں شخصیت سے کم اور شاعری سے زیادہ بحث کی گئی ہے۔'امجدیات' کا شمار بھی تبصرہ میں ہوتا ہے۔خاص بات یہ ہے کہ یوسف ناظم نے قریبی احباب کے علاوہ اُردو کے خاموش خدمت گزاروں ڈاکٹر حامد اللہ ندوی،ڈاکٹر عبدالستار دلوی، ممتاز طبلہ نواز اللہ رکھا خاں اور ان کے فرزند ذاکر حسین (ساز کے رستم وسہراب) صاحب خیر محمد حاجی صابو صدیق پر بھی قلم اٹھایا ہے۔آخر میں ''بمبئی کا ادبی جغرافیہ'' کے عنوان سے ایک مضمون بھی شامل کیا گیا ہے۔ جسے ہم بمبئی کے ادیبوں کا مختصر تعارف نامہ کہہ سکتے ہیں۔خاکہ نگار کو کرداروں کا سراپا کھینچنے میں کمال حاصل ہے۔مخدومؔ،راجندر سنگھ بیدی،جاں نثار اختر اور سرور ڈنڈا اسکی اچھی مثالیں ہیں۔''سائے اور ہمسائے'' میں خاکہ نگار نے اپنے مخصوص انداز نگارش کے علاوہ طنز و مزاح سے بھی کام لیا ہے۔بے ساختگی اور معنی آفرینی کے لحاظ سے ان خاکوں کے بعض جملے قول محال سے کم نہیں۔''شاگرد رشید بن کر وہ یوں خوش ہوتا ہے گویا ہارون رشید بن گیا ہو۔(اشفاق حسین) پروفیسروں کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ اقبال پر وہ چٹکی بجاتے مقالہ لکھ دیں گے لیکن اشفاق حسین نے مقالہ نہیں لکھا صرف چٹکی بجاتے رہے۔'' (اشفاق حسین) ''ان کی پتلون اور کوٹ میں جیبیں تو ضرور ہوتیں لیکن آسیب زدہ مکان کی طرح خالی۔'' (مخدوم) ''باقر مہدی کی شخصیت کا نمایاں پہلوان کا روادارانہ مزاج ہے اور وہ سب کو یکساں طور پر ناپسند کرتے ہیں۔'' (باقر مہدی) ''تحقیقی اور عملی کام کرنے والے حضرات میں خوش مزاجی کا عنصر کم پایا جاتا ہے۔یہ لوگ خوش مزاج ہونے پر خشک مزاج ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔'' (ڈاکٹر حامد اللہ ندوی) ''ڈاکٹر زورؔ کی موت ہی سے ہمیں معلوم ہوا کہ کشمیر کی سرسبز و شاداب وادی میں بھی آدمی مر سکتا ہے۔'' (ڈاکٹر زور) ''محمد حاجی صابو صدیق کی بنائی ہوئی یہ سرائے مغل سرائے سے کم مشہور نہیں اور ان کا اسکول محمود گاواں کے اسکول سے کم معروف نہیں۔'' (محمد حاجی صابو صدیق) اُردو ادب میں شخصیات سے متعلق تحریروں کا فقدان تھا۔بعض ایڈیٹروں کو شکایت تھی کہ کسی آدمی کے چل بسنے پر وفیات (OBITUARY) کے لیے بھی مواد نہیں ملتا۔مگر اب یہ امر طمانیت بخش ہے کہ ادھر چند سالوں سے خاکہ نگاری پر کافی توجہ دی جارہی ہے۔حال میں خاکوں کے کئی نئے مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔ان میں زیر نظر تصنیف 'سائے اور ہمسائے' یقیناً ایک خوشگوار اضافہ ہے۔●●

(جون 1976ء)

پہچان کا درد

حمید الماس

پہچان کا درد، حمید الماسؔ کی ۱۹۵۱ء تا ۱۹۷۴ء کی شاعری کا انتخاب ہے۔ جس میں ۹۲ نظمیں اور ۳۸ غزلیں شامل ہیں۔ اس انتخاب کو ہم شاعر کی پہچان کا وسیلہ قرار نہیں دے سکتے کیونکہ بہت پہلے ہی انھیں یہ سعادت حاصل ہو چکی ہے۔ یوں بھی وہ ۱۹۵۰ء سے طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ اور جودتِ طبع وندرتِ خیال کے باعث ایک عرصہ سے ہندو پاک کے ادبی حلقوں میں مقبول وممتاز ہیں۔

حمید الماسؔ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ اس لیے غزل سے زیادہ نظم سے متاثر کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں لوچ اور نرمی پائی جاتی ہے۔ فراقؔ نے صحیح تجزیہ کیا ہے کہ ''حمید الماسؔ کی نظمیں چیخ وپکار، بلند آہنگی، سخت لہجگی، ظاہری طمطراق اور زبردستی کے طرزِ بیان سے بالکل پاک صاف ہیں''۔ شاید اسی لیے شمس الرحمٰن فاروقی نے انھیں خاموشی کا شاعر کہا ہے۔

''پہچان کا درد'' کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ شعری سوغات حمید الماسؔ کی سماجی ونجی زندگی کے پریشان اوراق کا مجموعہ ہے خود ان ہی کے الفاظ میں:

اُمنگوں کی آنکھوں میں دو چار آنسو
اُمیدوں کے ہونٹوں پر دو چار آہیں

مجموعہ میں شامل غزلوں کے جائزہ سے بھی یہ پتا چلتا ہے کہ شاعر کو فقط غم سے شناسائی ہے۔

یوں بھی ہوتا ہے کبھی ہجر کی شب اے الماسؔ
دل سلگتا ہے تو ہم شمع بجھا دیتے ہیں

روز احساس کے زینے سے ہے نوحہ کا گزر
ذہن کو جیسے فقط غم سے شناسائی ہے

''پہچان کا درد'' کے اوراق اُلٹتے جایئے تو ایک ایسے درد سے آپ کی پہچان ہوگی جو صرف شاعر کا نہیں، آپ کا اپنا بھی ہے۔ یہ غم، یہ درد، نارسائی وعدم پذیرائی کی دین ہے۔ ●● (اگست 1976ء)

پریم چند

منصف : پرکاش چندر گپت ، مترجم: ل احمد اکبر آبادی

ساہتیہ اکاڈمی قومی اہمیت کا ایک خود مختار ادارہ ہے جسے حکومت ہند نے ۱۹۵۴ء میں قائم کیا۔ اس اکاڈمی کے پہلے صدر نشین پنڈت جواہر لال نہرو تھے اور موجودہ صدر نشین ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی ہیں۔ اس ادارہ کا اہم مقصد ہندوستانی زبانوں میں پائے جانے والے عمدہ ادب کو سارے ملک کے پڑھنے والوں تک پہنچانا بھی ہے۔ اکاڈمی کا اشاعتی پروگرام بشمول اُردو ۲۰ زبانوں میں جاری ہے۔

ترقی پسند نقاد پرکاش چندر گپت کی انگریزی تصنیف ''پریم چند'' کو ممتاز ادیب ل۔ احمد اکبر آبادی نے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ انگریزی، ہندی اور اُردو میں پریم چند پر بہت کچھ کام ہوا ہے لیکن پھر بھی اُسے اطمینان بخش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اب بھی پریم چند سے متعلق کئی گوشے بے نقاب ہو سکتے ہیں۔ اگر چہ قلم کا سپاہی (امرت رائے)، قلم کا مزدور (مدن گوپال)، پریم چند کے خطوط (مدن گوپال)، پریم چند گھر میں (شورانی)، پریم سوگ (محمد حسام الدین غوری)، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ (ڈاکٹر قمر رئیس)، منشی پریم چند: شخصیت اور کارنامے (ڈاکٹر قمر رئیس)، پریم چند (ڈاکٹر رام بلاس شرما)، پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار (ڈاکٹر شمیم نکہت) اور گئودان کا تنقیدی مطالعہ (سید احتشام احمد ندوی) پریم چند (محمد اکبر الدین صدیقی) سے پریم چند کی زندگی، شخصیت اور ادبی عظمت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ تاہم پریم چند کی شخصیت اور تصانیف اس امر کے متقاضی ہیں کہ اب بھی مختلف نقاط نظر سے ان کا بھرپور جائزہ لیا جائے۔

ساہتیہ اکاڈمی کے سلسلہ ''ہندوستانی ادب کے معمار'' کے تحت اہم ہندوستانی مصنفین کی زندگی اور کارناموں کو پیش کیا جا رہا ہے۔ پرکاش چندر گپت کی یہ تصنیف ''پریم چند'' بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ پریم چند کی پرورش و پرداخت کس ماحول میں ہوئی۔ انھیں زندگی میں کن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے سیاسی رجحانات کیا تھے۔ نیز اپنے ۱۲ ناولوں اور ۳۰۰ کہانیوں کا مسالا انھوں نے کہاں سے سمیٹا تھا۔ کسان کی دردناک زندگی پر قلم اُٹھانے کی انھیں کیوں ضرورت پیش آئی؟

پریم چند کا عہد ۱۸۸۰ سے شروع ہو کر ۱۹۳۶ میں ختم ہوتا ہے۔ بلاشبہ انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں ہندوستان کی سچی تصویر کھینچی ہے۔ اس ہندوستان کی تصویر جو شہروں اور دیہاتوں میں کھیتوں اور چراگاہوں میں، شاہراہوں اور گلیوں میں، کیاریوں اور شکستہ جھونپڑیوں میں نظر آتی ہے۔ پریم چند اُردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے ادب کو عوام سے قریب تر کیا۔ ل۔ احمد اکبرآبادی نے نہایت سلیس اور شستہ ترجمہ کیا ہے۔ جس سے خود پریم چند کی تحریروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ پریم چند نے اپنے بے شمار پڑھنے والوں تک پہنچنے کے لیے ایک سادہ، سلیس اور موثر زبان کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔ زیرِ نظر تصنیف ''پریم چند'' ادبیاتِ پریم چند میں ایک کارآمد اضافہ ہے۔

••

(اکتوبر1976ء)

بدنام کتاب

فکرتونسوی

فکرتونسوی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔ شاعری میں بیل منڈوے چڑھتی نظر نہیں آئی تو نثر کا انتخاب کیا۔ گذشتہ تین دہائیوں سے تو وہ صرف نثر ہی لکھ رہے ہیں اور نان اسٹاپ لکھ رہے ہیں۔ بسیار نویسی میں ان کا کوئی جواب نہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ آواز کی رفتار اور فکرتونسوی کے لکھنے کی رفتار میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ روزانہ کالم نگاری ان ہی کا حق ہے۔ سالہا سال سے مستقلاً روزنامہ ملاپ میں ''پیاز کے چھلکے'' اور ماہنامہ ''بیسویں ی صدی'' میں طنزیہ کالم لکھ رہے ہیں۔ فکر صاحب کو مزاح نگاری اور طنز نگاری کے علاوہ خاکہ نگاری سے بھی نسبت ہے مگر طنز کے تیر چلانا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کے طنز کے سوتے خشک ہی نہیں ہوتے۔ وہ ہر بار اپنے گاہکوں کو نیا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اس میدان میں ان کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ ''خدوخال'' ہو کہ ''چوپٹ راجہ'' یا زیرِ نظر تصنیف، تلخ حقائق سے معمور ہے۔

حقیقت نگاری ان کی تحریروں کا بنیادی وصف ہے۔ مجتبیٰ حسین نے صحیح تجزیہ کیا ہے۔ ''وہ ہمیشہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر مضامین لکھتے ہیں۔'' وہ اپنے کالموں، مضامین اور تصانیف پر انقلابی اور پرولتاری رجحانات کی تبلیغ کرتے بھی نظر آتے ہیں انہیں سماجی مسائل کا گہرا شعور ہے۔ بقول کرشن چندر ''وہ ہمارے زمانے کی پیچیدگیوں کا شعلہ بار تجزیہ کرنے میں مشہور ہیں''۔ زیرِ نظر تصنیف ''بدنام کتاب'' کا نام کچھ دیر کے لیے قاری یا سامع کو چونکا ضرور دیتا ہے اور وہ دل ہی دل میں اسے کوک شاستر یا پریم شاستر ٹائپ کی کوئی قابلِ ضبطی کتاب سمجھنے لگتا ہے۔ مگر ورق الٹنے سے اس کی غلط فہمی دور ہوتی ہے کیوں کہ ''بدنام کتاب'' دراصل نیک نام انشاء نگار فکرتونسوی کے تیکھے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں تلخ حقیقت بھی ہے اور لطیف چبھن بھی۔

اس مجموعہ میں طنز و مزاح سے پر ۱۶ مضامین کے علاوہ کرشن چندر اور رامانند ساگر کی آرا، مجتبیٰ حسین کا تعارفی خاکہ (بھیڑ کا آدمی) اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا پیش لفظ (دھرتی کا باسی) بھی شامل ہے۔

مجتبیٰ حسین نے فکر تونسوی کی شخصیت وفن کا اپنے مخصوص انداز میں بھرپور جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے فکر کے فن کا شوکت تھانوی، عبدالمجید سالک، پطرس اور رشید احمد صدیقی کے فن سے موازنہ کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے بارے میں ڈاکٹر صاحب سے منسوب اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا طنز ومزاح صرف رئیسوں کے لیے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ جملہ کتابت یا پروف ریڈنگ کی سہو کا شکار ہوگیا ہو ورنہ اس جملہ معترضہ کا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے ممتاز ماہر لسانیات وبالغ نظر نقاد سے تعلق بے جوڑ ہی تو ہے۔

''بدنام کتاب'' میں مصنف نے ان ہی مسائل پر قلم اٹھایا ہے، جن کے باعث ہماری معاشرتی زندگی زہر آلود ہوگئی ہے۔ عورتوں اور بیماروں کی نفسیات، ہسپتالوں کی بدانتظامی، الیکشن کی دھاندلیوں، فلمی صنعت کی بدعنوانیوں، چور بازاری اور کنبہ بندی کے علاوہ، دلی کی بائیسکلوں، تانگوں، بسوں، کاروں، حسیناؤں، عاشقوں اور مکانوں پر بھی بڑی چابکدستی سے قلم اٹھایا گیا ہے۔ اس مجموعہ کا سب سے عمدہ انشائیہ ''بیویوں کی ٹریڈ یونین'' ہے۔ جو عورت کی نفسیات کا خوبصورت تجزیہ ہے۔ دیگر انشائیوں میں ''میں بیمار ہوئے'' اور میں مالک مکان بنا، خاصے کی چیزیں ہیں، قبر سے واپسی، میری وصیت، میرا پتر جنم، ذاتی محرومیوں اور مایوسیوں کا المیہ ہونے کے باوجود عمومی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن میں طنز غالب ہے۔ ''اوٹ پٹانگ'' اور ''ایڈیٹر کے نام لو لیٹرز'' صحافتی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ فکر تونسوی کے طرز نگارش کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ عوام سے عوام کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ اب کی بار بھی انھوں نے اس روایت کی پاسداری کرتے ہوئے ہندی اور انگریزی کے عام فہم الفاظ کا بے تکان استعمال کیا ہے۔

لاجپت رائے اینڈ سنز پبلشرز اردو بازار دہلی نے ''بدنام کتاب'' کو بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کتابت وطباعت معیاری اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ یقین ہے کہ یہ مجموعہ نہ صرف پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا بلکہ مصنف کی نیک نامی میں مزید اضافہ باعث ہوگا۔

●●

(دسمبر 1976ء)

میرا شہر میرے لوگ

ڈاکٹر طیب انصاری

اردو ادبی حلقوں کیلئے طیب انصاری کا نام نیا نہیں ہے۔ اپنے دو تنقیدی مجموعوں تحریر و تنقید (۱۹۶۹ء) اور ادارک معنی (۱۹۷۲ء) کی اشاعت کے ذریعے انھوں نے بدنامی کی حد تک شہرت حاصل کرلی ہے۔ مذکورہ تصانیف کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ادب میں شرافت کے علاوہ شرارت کے بھی قائل ہیں۔ یہاں ان کے تنقیدی مضامین کا محاسبہ مقصد نہیں میرے پیش نظر تو ان کی تیسری تصنیف میرا شہر میرے لوگ ہے، جس میں ادب اور صحافت سے وابستہ اہم شخصیتوں کے خاکے شامل ہیں۔ ان میں نامی گرامی اصحاب بھی ہیں اور ہم عمر احباب بھی۔

جارحانہ تنقید اور تیکھی تحریروں کے بعد طیب صاحب نے خاکہ نگاری کو اپنایا تو یہ خطرہ لاحق تھا کہ وہ بعض چہرے مسخ کردیں گے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ خلاف توقع "میرا شہر میرے لوگ" میں تو وہ ایک مسیحا سے خاکہ نگار نظر آتے ہیں۔ بعض صاحبان خاکہ کی، بزرگی، حرمت اور علمی منزلت نے انہیں فدوی بنا دیا ہے۔ اکثر خاکوں میں ذہنی تحفظات سے کام لیا گیا ہے صرف کہیں کہیں تکلف کے پردے اٹھائے گئے ہیں۔ بلاشبہ خاکہ نگاری ایک مشکل فن ہے جس سے عہدہ برآ ہونا دریا کو کوزہ میں بند کرنا ہے۔ مصنف کا یہ اعتراف کہ "خاکہ نگاری میرا فن ہے اور نہ ہی مقصد" عجز و انکساری کا مظہر ہے نہ کہ دامن بچانے کی سعی، کیونکہ طیب انصاری خاکہ نگاری کی جانب فطری میلان رکھتے ہیں اور اس صنف میں ان کے جوہر کھلے ہیں۔

مارچ ۷۴ء میں جب یہ مجموعہ منظر عام پر آیا تو تمام اصحاب خاکہ بقید حیات تھے مگر اب یم نرسنگ راؤ، اشفاق حسین، پروفیسر مبارز الدین رفعت، پروفیسر عاقل علی خاں، احمد مکی اور میر حسن، راہی ملک بقا ہو چکے ہیں۔ مرحوموں کے ان خاکوں کی اہمیت آج دو چند ہوگئی ہے۔ اس مجموعہ کا سب سے کامیاب خاکہ محبوب حسین جگر ہے۔ جس میں خاکہ نگاری اور صاحب خاکہ دونوں سے انصاف کیا گیا ہے۔ احسن علی مرزا، بانو طاہر، سعید، زینت ساجدہ، آمنہ، ابوالحسن اور چاند انصاری بھی اچھے خاکے ہیں۔ جن میں تنوع پایا جاتا

ہے۔ عبدالقادر دجیلانی کا خاکہ انٹرویو کے زمرے میں آتا ہے۔ بقیہ خاکوں کی نوعیت تعارفی ہوگئی ہے۔
اسے مصنف کی وسیع النظری پر محمول کیا جائے گا کہ انھوں نے اپنے وطن کی بجائے حیدرآباد کو اپنا شہر کہا ہے۔
جس سے وہ قلبی و ذہنی تعلق رکھتے ہیں جہاں موصوف کی تعلیم و تربیت کے علاوہ، ذوق و شوق کی تکمیل ہوئی۔
یوں بھی یہی شہر آرزو مصنف کی رنگین و پر بہار جوانی کا راز دار ہے۔ خاکہ نگار نے اس شہر کی ان شخصیتوں پر قلم
اٹھایا ہے جن سے وہ متاثر ہوئے ہیں اور فیضان بھی حاصل کر چکے ہیں۔

''میرا شہر میرے لوگ'' ولا اکیڈیمی کی بائیسویں پیش کش ہے۔ قلیل عرصہ میں اس اکیڈیمی نے
کتابوں کی اشاعت کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی جو بیش بہا خدمت انجام دی ہے اس کے لیے اکیڈیمی
کے بانی و صدر حسن الدین احمد مبارکباد کے مستحق ہیں۔ زیر نظر تصنیف کی کتابت و طباعت اطمینان بخش ہے
اور قیصر سرمست کا بنایا ہوا سرورق بھی متاثر کن ہے فہرست مضامین کی پشت پر طیب انصاری کے فن کے
بارے میں وقار خلیل کی رائے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

●●

(دسمبر 1976ء)

غزلوں کی رات

سالانہ ترجمان (محفل خواتین، حیدرآباد)

حیدرآباد فرخندہ بنیاد جہاں کئی منفرد خصوصیات کے باعث ملک بھر میں امتیاز رکھتا ہے، وہاں اسے یہ بھی افتخار حاصل ہے کہ خاتون شعرا اور ادبا کی ایک انجمن "محفل خواتین" یہاں گذشتہ ۵ سالوں سے خواتین کے ذوق ادب کی آبیاری کر رہی ہے۔ شعری، ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کو فروغ دینا اور خاتون شعرو ادبا کی تخلیقات شائع کرنا محفل خواتین کے مقاصد میں شامل ہے۔

"غزلوں کی رات" اسی انجمن کا سالانہ ترجمان ہے۔ جو انجمن کے زیر اہتمام سالانہ تہذیبی پروگرام "غزلوں کی رات" کے انعقاد کے موقع پر شائع کیا جاتا ہے۔ زیر نظر شمارہ تیسرا سالانہ میگزین ہے جو محترمہ عظمت عبدالقیوم کی ادارت میں اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر ثمینہ شوکت، ڈاکٹر حمیرہ جلیلی، ڈاکٹر صابرہ سعید، رفیع روف کے مضامین جیلانی بانو، طیبہ خسرو، انیس قیوم فیاض، فاطمہ عوض سعید کے افسانے، سلیم النساء اور فاطمہ عالم علی کے انشائیے متاثر کرتے ہیں۔ شعراء میں بانو طاہرہ سعید، نایاب سلطانہ ڈاکٹر اشرف رفیع، زبیدہ تحسین اور جمیلہ نشاط قابل ذکر ہیں۔

صوری و معنوی حیثیت سے مزین، ۱۴۰ صفحات پر محیط شمارہ ہذا کی قیمت ۳ روپے نہایت ہی کم ہے۔ محفل خواتین کا یہ اقدام کہ کم قیمت میں رسالہ زیادہ ہاتھوں تک پہنچے، نہ صرف لائق ستائش ہے بلکہ قابل تقلید بھی۔

(مئی 1977ء)

●●

رات کا سفر (افسانے)

قدیر زماں

آج اُردو افسانہ داستانوں ،جن پریوں کے قصوں ،رومانی المیوں اور طربیوں ،زندگی کی ناہمواریوں اور تلخیوں سے گذر کر ذات کے حصاروں میں راستہ ٹٹول رہا ہے۔حقیقت پسندی وسماجی شعور کی بجائے جدید تر افسانوں میں کردار کی ذہنی رو کو پیش کیا جا رہا ہے۔نظریہ کی جگہ نظر نے لے لی ہے۔چونکہ اشارتی عنصر کو تمام اصناف ادب میں اہمیت حاصل ہوگئی ہے اس لیے افسانہ بھی اس سے اپنا دامن نہیں بچا سکا۔چنانچہ اب نئی نسل کے افسانہ نگاروں نے تجرید اور علامت کو ایک رجحان کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے۔

اس تناظر میں قدیر زماں کے افسانوی مجموعہ ''رات کا سفر'' کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ قدیر زماں نے جب افسانہ نگاری شروع کی تو ترقی پسند کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا۔لیکن ابھی اس کے اثرات پوری طرح زائل نہیں ہوئے تھے۔اس لیے قدیر زماں کے ابتدائی افسانوں پر حقیقت پسندی کا اثر نمایاں ہے۔اس قبیل کے افسانوں میں ''دودھ کے دانت'' اور ''گیلا کفن'' کا شمار ہوتا ہے۔عاتق کی طرح کئی بچے دودھ کے ایک ایک گھونٹ کے لیے ترستے ہیں تو مبارک کی طرح کئی بوڑھوں کی حسرتیں دل ہی دل میں پامال ہوجاتی ہیں۔ان کا افسانہ ''امن کی بستی'' سیاسی موضوع لیے ہوئے ہے۔جس میں نام نہاد امن پسندوں کے فریب کو آشکار کیا گیا ہے اور ان کے چہروں کی نقاب کشائی کی گئی ہے جو بنام امن جبر وظلم کو روا رکھتے ہیں۔قدیر زماں نے یہ افسانے 1963ء اور 1964ء میں لکھے۔اس کے بعد گیارہ سال تک ان کا قلم خاموش رہا۔ایک طویل عرصہ کے بعد 1975ء اور 1976ء میں انھوں نے پھر افسانہ نویسی کی طرف توجہ کی ہے۔ان کی تازہ ترین کہانیوں میں ''آوازیں'' روایتی طرز کا رومانی افسانہ ہے،جس میں جبران اور سلمٰی کی محبت پر آوازیں اٹھتی ہیں،دیواریں کھڑی ہوجاتی ہیں کیونکہ وہ ہم مذہب اور ہم وطن نہیں تھے۔مگر پیار کی سچائی سے یہ بودی دیواریں ٹوٹ جاتی ہیں۔''رات کا سفر'' ایک ایسا افسانہ ہے جو ہمیں پھر سے طلسماتی فضا میں لے جاتا ہے۔دراصل یہ ایک خواب ہے جس کو حقیقت سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی گئی

ہے۔افسانہ کا انداز اچھوتا اور روایتی ڈگر سے ہٹا ہوا ہے۔''ہیرے کا زخم'' ''دھند'' اور ''دیوار کا آدمی'' علامتی افسانے ہیں۔ان میں ''دیوار کا آدمی'' کو خصوصیت حاصل ہے۔اگرچہ افسانہ کا آغاز قصہ چہار درویش کی یاد دلاتا ہے مگر اشارتی عنصر اور نئی تکنک نے اس افسانہ کو جدید تر افسانہ بنادیا ہے۔''دیوار کا آدمی'' نہ صرف اس مجموعہ کا سب سے کامیاب علامتی افسانہ ہے بلکہ اس افسانہ کی شمولیت نے اس مختصر سے مجموعہ کو وزنی بنادیا ہے۔

قدیر زماں نے ۹ کہانیوں کے اس مجموعہ کے ذریعہ بسیار نویسوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔کہا جاسکتا ہے۔کہ انھوں نے اس مجموعہ کی اچانک اشاعت کے ذریعہ ادب میں شب خون مارا ہے۔لیکن یقین ہے کہ اُن کا یہ رات کا سفر منقطع نہیں ہوگا بلکہ طلوع صبح کے بعد بھی وہ اُردو ادب کو اپنی چونکا دینے والی کہانیوں سے مالا مال کریں گے۔

''رات کا سفر'' جولائی ۷۷ء میں مکتبۂ شعر وحکمت حیدرآباد کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت معیاری ہے۔خوبصورت سہ رنگی سرورق ڈاکٹر مغنی تبسم کی فن کارانہ چابکدستی کا مظہر ہے۔

●●

(اگست1977ء)

گستاخی معاف

ایم اے حنان

اُردو میں طنز و مزاح کا آغاز ہجو اور ہزل سے ہوا مگر رفتہ رفتہ اس میں نمایاں تبدیلی آئی۔ پھکڑ پن، پھبتی، استہزا، فحش، تمسخر، رکاکت، فقرہ بازی، اور دشنام طرازی کا نام مزاح نہیں ہے۔ بقول حالی ''مزاح کا کام پژمردہ دلوں کو خوش کرنا ہے۔ نہ کہ کسی کا دل دُکھانا۔'' مزاح کا صحیح اور صحت مند مفہوم ہمیں سب سے پہلے غالبؔ کے ہاں ملتا ہے۔ غالبؔ مزاح میں پُر وقار سنجیدگی کے قائل تھے۔ طنز و مزاح ادب کی مشکل ترین صنف ہے۔ اکثر ادیبوں کے قدم اس راہ میں ڈگمگا جاتے ہیں۔ لیکن جن ادیبوں نے اس صنف میں سرخروئی حاصل کی ہے۔ ان میں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شفیق الرحمن، یوسف ناظم، مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین قابلِ ذکر ہیں۔

۲۳ سالہ نوجوان، ایم اے حنان نے بڑے عزم و اعتماد کے ساتھ اس دشوار گزار گھاٹی میں قدم رکھا ہے۔ ''گستاخی معاف'' ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس میں مختلف موضوعات پر ان کے ۲۱ مضامین شامل ہیں۔ رونمائی (مصنف کا پیش لفظ) سے آشکار ہے کہ نوعمر مزاح نگار نے انگریزی ادب کی شاہکار تخلیقات کے علاوہ رشید احمد صدیقی، ابراہیم جلیس، پطرس بخاری، شفیق الرحمن اور مشتاق احمد یوسفی کو چاہت سے پڑھا ہے۔ آخر الذکر دونوں مزاح نگاروں نے انھیں متاثر بھی کیا ہے۔ اس سے اُس ڈگر کا پتہ چلتا ہے جس پر چل کر حنان اپنی منزل کو پانا چاہتے ہیں۔ منزل دور سہی لیکن انھوں نے راہِ راست کا انتخاب کیا ہے۔ اس لیے زیرِ نظر مجموعہ ہمیں مایوس نہیں کرتا۔ مصنف کا طنز تیکھا اور مزاح لطیف ہے۔ اگر موصوف زیبِ داستاں کی حاشیہ آرائی سے اپنے قلم کو بچا کر زندگی کے حقائق رقم کرتے رہیں تو بہت جلد طنز و مزاح کی وادی میں اپنی مستقل جگہ بنالیں گے۔ 'چوتھی بھوک' نہ بن سکے ادیب' نیا نوکر اور حضرت کاتب اس مجموعہ کے دلپذیر مضامین ہیں۔ شہر حیدرآباد کا طنز و مزاح سے گہرا علاقہ رہا ہے۔ فرحت اللہ بیگ، قاضی عبدالغفار، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، زینت ساجدہ، بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، رشید قریشی، برق آشیانوی، خواجہ عبدالغفور، مجتبیٰ حسین، پرویز یداللہ مہدی، مسیح انجم جیسے طنز و مزاح نگار اسی شہر سے اُبھرے ہیں۔ اس باب میں ایم اے حنان ایک خوشگوار اضافہ ہیں۔ ●●

(ستمبر 1977ء)

اُجالوں کا سفر

ضمیر عاقل شاہی

''اُجالوں کا سفر'' میسور (کرناٹک) کے کہنہ مشق شاعر ضمیر عاقل شاہی کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔قبل ازیں ''لالہ صحرا'' شائع ہوکر مقبول ہو چکا ہے۔ چونکہ زیر نظر مجموعہ 1976ء کے مفاجاتی حالات کے دوران اشاعت پذیر ہوا ہے۔اس لیے اس میں جو نظمیں شامل ہیں۔وہ زیادہ تر ہنگامی، واقعاتی، موضوعی اور فرمائشی ہیں۔انتخاب کے موقع پر تلخیص وتوازن سے پہلوتہی کی گئی ہے جسکے باعث قاری اکثر نظموں میں خیال واسلوب کی تکرار سے دوچار ہوتا ہے۔

''اُجالوں کا سفر'' میں جملہ 24 نظمیں شامل ہیں۔ان میں سے بعض نظمیں ضمیر صاحب کے اولین مجموعے ''لالہ صحرا'' میں بھی شریک ہیں۔''اُجالوں کا سفر'' کی نظموں کا موضوع ''حب الوطنی''، ''قومی یکجہتی'' اور ''وقتی سیاست'' ہے۔اس میں بعض ایسی شخصیتوں کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے جنکی قومی ،سیاسی اور ادبی سرگرمیوں سے شاعر متاثر ہے۔امیر خسرؔو، ٹیپو سلطان، شیخ احمد ڈھونڈ اجی واگ، غالب، ٹیگور، اقبال، مہاتما گاندھی، ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق، ذاکر حسین، خان عبدالغفار خان ،اندرا گاندھی، سجاد ظہیر، خواجہ احمد عباس، فیض احمد فیض، سید مبارز الدین رفعتؔ کا شماران شخصیتوں میں ہوتا ہے۔بعض ایسی شخصیتوں پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے جن سے شاعر کے دیرینہ وشخصی تعلقات ہیں۔ریڈیو کے لیے تحریر کردہ بعض فرمائشی نظمیں بھی اس میں شریک ہیں۔

ضمیر عاقل شاہؔی قادر الکلام شاعر ہیں۔ان کی نظموں میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ انھیں زبان وفن کے نکات پر بڑی دسترس حاصل ہے۔البتہ موضوعی نظموں میں وہ کہیں شخصیت پرستی کا شکار ہوگئے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا یہ مجموعہ ایمرجنسی کی دین ہے۔تاہم اُن کی بعض مشمولات دل ونگاہ کے لیے مسرت وانبساط کا سامان مہیا کرتے ہیں۔امیر خسرؔو، انسان، کافر، میل کا پتھر، مولانا ابوالکلام آزاد اور کرناٹک کا شمار اس مجموعہ کی اچھی نظموں میں ہوتا ہے۔اس مجموعہ میں ڈاکٹر ہاشم علی اور مظہر الصمد شاہد کا تعارف بھی شامل ہے۔جس سے شاعر کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ●● (دسمبر 1978ء)

اک چاند چمکتا ہے

حسنیٰ سرور

حسنیٰ سرور کرناٹک کی معروف ومقبول شاعرہ ہیں۔ ایک عرصہ سے ان کا کلام ہندوپاک کے ممتاز رسائل وجرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ "اک چاند چمکتا ہے" ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ قبل ازیں ۱۹۸۳ء میں "خواب راز" شائع ہو چکا ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں غزلیات (۱۱۰) صفحات پر محیط ہیں، بقیہ (۶۶) صفحات نظم کے لیے وقف ہیں۔ غزلوں کی ابتدا نعتوں اور نظموں کی ابتدا حضرت امام حسینؓ سے متعلق نوحوں سے ہوتی ہے۔

"اک چاند چمکتا ہے" کے صفحات عام طور پر درد کی خوشبو، یاد کی قندیل، آرزو کے گلاب اور کچھ نئے خواب سے بھرے پُرے ہیں لیکن بعض نظموں میں شاعرہ اس ڈگر سے ہٹ بھی گئی ہیں جیسے نئے اُفق، تمام منظر بہشت دانش، اے عروس وطن، ہمارا شاعر، آنسوؤں کا خراج، آفاق میں گم نغمہ اور نذرِ اقبال وغیرہ۔

حسنیٰ سرور رومانی شاعرہ ہیں۔ "خواب" ان کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے۔ عصری حسیت اور مسائل سے پرے ایک عرصہ سے نہ صرف خواب کی وادیوں میں بھٹک رہی ہیں بلکہ اب بھی سنہرے خواب بُننے کا عمل جاری ہے، ذیل کا مصرع ان پر صادق آسکتا ہے: ہیں خواب میں ہنوز کہ جاگے ہیں خواب سے

حسنیٰ سرور کے نظریہ شعر کی مزید وضاحت ان کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے:

دن کے ہنگاموں میں کس کو فرصت ہے مل بیٹھنے کی :: یار وہ آتے ہیں تو حسنیٰ مل لیتے ہیں خوابوں میں

اگرچہ "خواب زار" سے "اک چاند چمکتا ہے" تک ان کی شاعری روایت سے چھٹکارا نہ پا سکی لیکن انکے تازہ کلام میں زندگی سے محبت، جینے کی امنگ اور مستقبل کو سنوارنے کا جذبہ بھی ملتا ہے۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

کس کی چشم عنایت کا صدقہ ہے یہ لمحہ لمحہ سنورتی گئی زندگی

روشنی قلب ونظر کی جو سلامت ہے تو دوست تیرگی میں بھی نظر آئیں گے ساحل کتنے

حوصلہ دیکھیے اپنے دل کا روز اک زخم نیا مانگے ہے

شالیمار پبلی کیشنز حیدرآباد کی اس ۳۱ ویں پیشکش کو ممتاز صحافی محمود خاور نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کتابت وطباعت اطمینان بخش اور گٹ اپ عمدہ ہے۔●●

(جون 1979ء)

مٹھی بھر دھول

قمر جمالی

ادب کی دیگر اصناف کے مقابلے میں ڈراموں کی تخلیق واشاعت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے جب بھی ڈراموں کا کوئی مجموعہ منظر عام پر آتا ہے تو وہ اردو ادب میں اضافہ ہی ہے۔ کرشن چندر، ڈاکٹر محمد حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، ریوتی سرن شرما، حبیب تنویر، کرتار سنگھ دگل، منظور الامین، ساگر سرحدی، انور معظم، قدیر زمان، اظہر افسر اور ابراہیم یوسف وغیرہ نے اردو کو بہت اچھے ڈرامے دیے ہیں مگر ان کے درمیان ترقی پسند ڈرامہ نگار قمر جمالی نے بھی اپنا منفرد مقام بنالیا ہے۔

زیر نظر مجموعے میں صرف ۴ ڈرامے شامل ہیں جو موضوع، پلاٹ، کردار اور کامیاب مکالمہ نگاری کے باعث قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ ان ڈراموں میں ''منزل اور دھواں'' اور ''مٹھی بھر دھول'' کو اہمیت حاصل ہے۔ ''منزل اور دھواں'' کا موضوع بے کاری، بے روزگاری، نا آسودگی اور معاشی و معاشرتی ناہمواری ہے جس کے اظہار میں قمر جمالی کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔ 'مٹھی بھر دھول' میں یونانی سماج کے توہمات پر زخمہ لگایا ہے اور اس امر پر تاسف کا اظہار کیا ہے کہ انسان اپنی طاقت کو جانے بغیر بے جان مورتوں کو معبود بنا رکھا ہے اور اسے یہ عرفان نہیں کہ زندگی انسانی صنعت گری کا کارنامہ نہیں بلکہ ایک ناقابل تسخیر فطرت کا کرشمہ ہے۔ تاریخی ڈرامے ''راوی کے کنارے'' میں عدل جہانگیری کی جھلک دکھائی گئی ہے اور ''خون کا رشتہ'' میں فتح باز کے ذریعہ ہندوستان کے لیے آدرشوں کو پروان چڑھایا گیا ہے۔

قمر جمالی نے اپنے کرداروں کے ذریعے انسانی فطرت کی صحیح عکاسی کی ہے۔ سریتا اپنی تمام تر خواہش کے باوجود فتح باز کو اپنا بھائی نہ بنا سکی۔ سماجی بندشوں کے باعث منزل کی طرف گامزن ہونے کی بجائے خودکشی کرتی ہے۔ اس طرح قمر جمالی کا فن حقیقت نگاری سے قریب تر ہوگیا ہے۔ ابتدا میں اخلاق اثر نے ۲۴ صفحات پر مشتمل اپنے مقدمے میں قمر جمالی کی شخصیت اور فن کو آئینہ دکھایا ہے۔ اس تصنیف کو بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ چوں کہ ڈراموں کا مجموعہ ہے اس لئے قیمت پندرہ روپے کچھ زیادہ نہیں۔ ●●

(جولائی 1981ء)

پسِ غبار

مختار شمیم

''پسِ غبار'' مختار شمیم کی ان کہانیوں کا مجموعہ ہے جو ریڈیو کے لیے لکھی گئی تھیں۔ شمیم کا شمار نئی نسل کے باشعور اور عوامی احساسات رکھنے والے کہانی نویسوں میں ہوتا ہے۔ وہ معاشرے اور ماحول سے کہانیوں کا مواد حاصل کرنے کے ہنر سے آشنا ہیں۔ بھوپال کے علم اور تہذیبی حلقوں میں رہی ذہانت اور دروں بینی کے باعث عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی کہانیوں میں روایت اور جدت کی آمیزش کے ساتھ ساتھ ماحول کے اثرات کا غلبہ ہے۔ فاضل افسانہ نویس نے مسرتوں، محرومیوں، آرزووں اور تمناؤں کو کرداروں کے ذریعہ ماہرانہ انداز میں روشن کرنے کی سعی کی ہے۔ نانی ماں، ہوا تیز ہے، وہی کارواں وہی مرحلے اور پسِ غبار کا شمار روایتی کہانیوں میں ہوتا ہے جب کہ ''پہچان'' اور ''کتنی بلندی اور کتنی پستی'' جدید کہانیاں ہیں۔ مختار شمیم کا اندازِ بیاں فطری اور عام فہم ہے۔ قاری کے لیے ترسیل وابلاغ کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے، جس کے باعث قاری کو کسی ذہنی جمناسٹک کا شکار ہونا پڑے۔ فاضل افسانہ نگار نے اپنی ذات کے کرب کے علاوہ زندگی کے عام مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ ''وہی کارواں وہی مرحلے'' کلرکوں کی زندگی کے دکھ درد سے عبارت ہے۔ یہ کہانی ان کی ناکامیوں ونامرادیوں اور تمناؤں وآرزووں کا موثر مرقع ہے۔ 'پہچان' میں اپنی ذات کی تلاش کی سعی کی گئی ہے 'نانی ماں' کا کردار روایتی ہونے کے باوصف متاثر کن ہے۔ 'ہوا تیز ہے' فرقہ وارانہ جنون کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ اس کہانی کے ذریعے مصنف نے مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا پرچار کیا ہے۔ 'پسِ غبار' اصولوں کی پاسداری کا بھیانک انجام اور صلاحیتوں کے خون کی عبرتناک تصویر ہے۔

یہ کتاب ڈیمائی سائز میں شائع کی گئی ہے مجموعہ عمدہ کاغذ، نفیس طباعت اور سادہ و پُرکار سرورق کے باعث بھی متاثر کرتا ہے۔●●

(جولائی 1981ء)

ادھورے چہرے

شمیم صادقہ

معروف افسانہ نگار شمیم صادقہ پٹنہ کے سرکاری زنانہ کالج کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ ''ادھورے چہرے'' موصوفہ کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے قبل ازیں ''کرچیاں'' شائع ہو چکا ہے۔ پہلا مجموعہ کرب وفا اور احساس نارسائی سے عبارت تھا جب کہ ''ادھورے چہرے'' میں زندگی کی محرومیوں، کھوکھلے نظریات، جنس زدگی اور انسانیت کی شکست وریخت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں شامل ۷ کہانیاں ۱۹۷۹ء کے دوران مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو چکی ہیں ان میں زیادہ تر کہانیاں جنس کے گرد گھومتی ہیں۔ ''دھند کی دیوار'' میں بے وجہ ایک سڑی ہوئی مچھلی کو صاف وشفاف تالاب، ناپاک کرنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ ''ایک شام'' میں ان چہروں سے نقاب الٹا گیا ہے جو کلچرڈ کہے جانے کے باوجود بڑے وحشی ہوتے ہیں۔ جنس کے موضوع پر تحریر کردہ کہانیوں میں ''بجھی تتلی'' سب سے زیادہ اپیل کرتی ہے 'چائے پانی' اور ادھورے چہرے کا موضوع مختلف ہے، ادھورے چہرے، سفید پوشوں کے کرتوت کی ادنیٰ جھلک ہے۔ جس میں 'اکرم' بے نام و بے چہرے باپ کا بیٹا اپنی شخصیت کی عدم تکمیل کے باعث ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ 'چائے پانی' دفتری بابو (کیس ورکر) اور ان کے ہمکاروں کی سرگرمیوں کا خوب صورت تجزیہ ہے۔

مختصر یہ کہ کہانیوں کا یہ مختصر مجموعہ اس قابل ہے کہ مانگ تانگ کر پڑھنے کی بجائے خرید کر اپنی لائبریری کی زینت بنائیں۔ ●●

(جولائی 1981ء)

تذکرہ حضرت سید شاہ اسماعیل قادری

محمد معین الدین اختر

حضرت سید اسماعیل قادری ؒ متوفی ۸۸۲ھ م ۱۴۷۸ء نویں صدی ہجری کے مشہور صوفی بزرگ ہیں۔ جن کا مزار شریف گھوڑواڑی شریف ضلع بیدر (کرناٹک) میں مرجع خاص و عام ہے۔ زیر نظر تذکرہ محمد معین الدین اختر کا مرتب کردہ ہے جو حضرت کے خادمین کے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ موصوف نے محض خوش عقیدگی اور جذبات سے کام نہیں لیا بلکہ کافی جانفشانی و ضروری تحقیق کے بعد حضرت کے صحیح حالات زندگی سے عوام کو روشناس کروایا ہے۔ اس تذکرہ کا پہلا ایڈیشن ڈسمبر ۱۹۷۵ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے جسے ترمیم و اضافے کیساتھ حضرت کے ۵۱۸ ویں سالانہ عرس کے موقع پر (اکتوبر ۱۹۸۰) میں شائع کیا گیا ہے۔

اس تالیف میں حضرت کے سنہ ولادت، مقام ولادت، سلسلۂ ارادت، ارشادات عالیہ اور تصانیف کے بارے میں ضروری تفصیلات نہیں ملتیں کیوں کہ قدیم کتب و رسائل میں حضرت ممدوح کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے۔ علاوہ ازیں مولف نے ایک ہی واقعہ کو بیان کرتے وقت مختلف کتابوں کی مکمل عبارتیں نقل کی ہیں۔ حالاں کہ ان عبارتوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ بہتر تھا کہ صرف اختلاف کو اختصار کیساتھ واضح کردیا جاتا۔ سلسلہ نسب کے بیان میں بھی یہی سقم نظر آتا ہے۔ تاہم مرتب نے حضرت ممدوح کے مستند حالات کو یکجا کرنے کی ممکنہ سعی کی ہے۔ جس کیلئے وہ قابل مبارکباد ہیں۔

حضرت کے مزار شریف، دیگر مزارات و عمارات اور بہمنی سلاطین کے مقابر سے متعلق ۳۰ تصاویر کے علاوہ درگاہ شریف کا ایک نقشہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ افضل العلماء مولانا سید عبدالوہاب صاحب بخاری کے پیش لفظ سے اس کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ کتاب کے آخر میں ہم عصر اولیاء اللہ کے اسمائے گرامی کے علاوہ حوالہ جاتی کتب کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ ●●

(اگست 1981ء)

البیرونی اور جغرافیۂ عالم

مولانا ابوالکلام آزاد

البیرونی اور جغرافیۂ عالم (مولانا ابوالکلام آزاد) کو ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے جس سے البیرونی کی شخصیت اور علمی کارناموں خصوصاً جغرافیہ عالم سے متعلق اس کی سیاسی تحقیق اور تدقیق کا پتا چلتا ہے۔ البیرونی کے علمی کارنامے ایک عرصہ تک پس پردہ رہے مگر جب اس کی گرانقدر تصانیف کا سراغ ملا تو محققین نے اسے آسمان علم کا تابندہ ستارہ قرار دیا۔ البیرونی کو ریاضی، ہیئت، نجوم، حکمت، معدنیات، پیمائش ارض، نباتات، علم الانسان اور جغرافیہ میں امتیاز حاصل تھا۔ خصوصاً ہندوستانی تہذیب وثقافت اور علم ودانش سے اسے بے حد لگاؤ تھا۔ اس نے کوئی بارہ تیرہ برس ہندوستانی علوم سیکھنے اور ہند کی تہذیب وثقافت کو سمجھنے میں صرف کیے۔ اسی لیے وہ کئی بار ہندوستان آیا۔ اس نے سنسکرت زبان میں مہارت حاصل کی اور سنسکرت کی دو کتابوں ''سانکھ'' اور ''پاتنجلی'' کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ وہ بڑا جید فاضل، سائنسداں، مورخ اور عالم متبحر تھا۔ اس کی تصانیف میں ''آثار باقیہ'' کتاب الہند اور القانون کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ کئی زبانیں جانتا تھا۔ عربی، فارسی، خوارزمی اور جرجانی زبانیں اس کے لیے بمنزلہ مادری زبان تھیں۔ وہ سنسکرت، یونانی، سریانی اور عبرانی زبانوں سے بھی واقف تھا۔ اگرچہ مولانا آزاد کو زیر نظر کتاب کا مصنف تو تسلیم کرلیا گیا ہے مگر اہل تحقیق کے لیے ہنوز اس میں شبہ کی گنجائش ہے۔ اس کتاب کا مسودہ (قلمی مخطوطہ) انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی لائبریری کی اس الماری سے حاصل کیا گیا ہے جسے ''آزاد کلکشن'' کا نام دیا گیا ہے۔ ضیاء الحسن فاروقی پرنسپل جامعہ کالج اور ڈائرکٹر ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بطور مقدمہ البیرونی پر ایک جامع مضمون لکھ کر اس کتاب میں شامل کردیا ہے اور اس عالمانہ مقدمہ کے باعث البیرونی اور اس کے علمی کارناموں سے متعلق نئی معلومات منظر عام پر آئی ہے۔ اس کارآمد مقدمے کے بعد جناب مسیح الحسن صاحب نے قبل مخطوطے کی کہانی بیان کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ اس مخطوطے سے متعلق معلومات حاصل کرنے

کی انھوں نے بہت کوشش کی۔ مولانا آزاد کی تصانیف دیکھیں، ان کے خطوط پڑھے، دوسروں کی تحریریں مطالعہ کیں مگر مصنف کے بارے میں کوئی سراغ نہیں ملا۔ البتہ محمد عتیق صدیقی صاحب نے انھیں بتایا تھا کہ مولانا غلام رسول مہر سے ان کی اس سلسلے میں خط و کتابت ہوئی تھی اور مولانا مہر نے انھیں لکھا تھا کہ شاید ۱۹۲۷ء سے پہلے اس مقالے کا مسودہ مولانا آزاد نے بغرض اشاعت لاہور بھیجا تھا لیکن یہ مقالہ اس وقت چھپ نہ سکا۔ مولانا مہر نے اپنے خط میں مقالے کے محفوظ رہنے پر خدا کا شکر بھی ادا کیا ہے مگر زیر نظر کتاب کے صفحہ ۳۶ کے حاشیہ سے پتا چلتا ہے کہ مسیح الحسن صاحب کو بھی مولانا غلام رسول مہر کا مذکورہ خط پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ نیز انھیں اس کا بھی علم نہیں کہ عتیق صاحب اور مولانا مہر کے درمیان مراسلت کب ہوئی۔ علاوہ ازیں اس مخطوطے پر مولانا آزاد کے دستخط کہیں موجود نہیں ہیں اور نہ ہی مخطوطہ نویس نے ان کا نام تحریر کیا ہے۔ مخطوطہ پر نام نہ ہونے کی وجہ یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید یہ مولانا کی تصنیف نہ ہو، اس امر کا بھی امکان ہے کہ مخطوطہ کسی دوسرے شخص نے لکھا ہو اور مولانا آزاد نے بعد میں اصلاح کی ہو چونکہ مذکورہ تصنیف کا طرز نگارش مولانا آزاد کی دوسری نگارشات سے بالکل مشابہ ہے اور مخطوطہ کے بعض صفحات پر مولانا کی اصلاحیں بھی ہیں۔ اس لئے مقدمہ نگاروں نے اس رسالے کو مولانا آزاد کی تصنیف تسلیم کر لیا ہے۔ زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے جہاں البیرونی کے عہد اور اس کے کارناموں، عربی فن جغرافیہ، اقلیموں کی مسافت اور کرہ کی مجموعی مسافت، خط استوا اور قبۃ الارض، البیرونی کے اطوال اور موجودہ اطوال کے باہمی فرق اور اس کے عہد کے جغرافیائی خصوصیتوں، البیرونی اور محمود غزنوی کے باہمی تعلقات، البیرونی کی سیاحت ہند اور ہندوستان کے بارے میں اس کی معلومات پر روشنی پڑتی ہے وہیں پہلی بار یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ مولانا آزاد جغرافیہ داں بھی تھے۔

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل یہ مجلد کتاب ڈیمائی سائز میں سادہ مگر پُر کار سرورق کے ساتھ سلیقے سے شائع کی ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت نہایت عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ پندرہ روپے میں یہ کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی، ممبئی اور علی گڑھ سے حاصل کی جا سکتی ہے اور اس قابل ہے کہ مطالعہ کے بعد اپنی لائبریری کی زینت میں اضافہ کریں۔ ●● (اگست 1983ء)

جاگتی دہلیز

مظہر محی الدین

جاگتی دہلیز مظہر محی الدین کا اولین شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۸۴ء کے اواخر میں شائع ہوا۔ ان کا تعلق جدید شعراء کے اس گروہ سے ہے جو عصری آگہی کے ساتھ ساتھ فنی اقدار کی پاسداری کو عزیز رکھتا ہے اور صالح اور صحت مند روایات کو اپناتے ہوئے جدید عہد کے تقاضوں سے بھی چشم پوشی نہیں کرتا۔

مظہر محی الدین ۱۹۷۰ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ملک کے معیاری رسائل میں ان کا کلام چھپتا ہے۔ زیر نظر مجموعے کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ ادب میں کسی خاص نظریے کے حامی نہیں۔ اچھی تخلیق کے لیے شعریت، رچاؤ اور جذبے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری تقلیدی نہیں ہے۔ انھوں نے مجموعے کی ابتداء میں ''اتنی سی بات'' کے ذریعہ یہ واضح کر دیا ہے کہ تقاضائے فن کیا ہے وہ شاعری کو صرف زلف جاناں اور جام و مینا تک محدود کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کے کینوس کو خارجی و داخلی محسوسات کی بھرپور تر جمانی کے ذریعہ وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے فیشن زدہ جدیدیت پر اس طرح ضرب لگایا ہے:

جی میں جو آئے لکھو اور جیسا جی چاہے لکھو
کوئی یہ پوچھے تو بتاؤ یہ فن تجرید ہے

اس مجموعے میں شامل ۴۹ غزلوں اور ۳۵ نظموں سے یہ متشرح ہوتا ہے کہ انھیں غزلوں اور نظموں پر مساوی قدرت حاصل ہے۔ ان کے ہاں غمِ جاناں بھی ہے اور غم دوراں بھی۔ روایات سے استفادہ بھی ہے اور روح عصر سے آگہی بھی۔ ان کے رومانی اشعار میں بھی طرحداری اور بانکپن ملتا ہے۔ جیسے:

وصال یار ہو یہ غم نہیں ہے — خیال یار بھی کچھ کم نہیں ہے
کٹ کے بکھرا ہوں انا کی طرح — مجھ کو ہاتھوں پہ رکھ لو حنا کی طرح
گرایا تھا نظر سے جس نے مجھ کو — اسی کی آنکھ سے اب بہہ رہا ہوں

ان کی غزلیں سوز و گداز اور درد کی تاثیر سے مملو ہیں۔ جہاں عصری کرب، غم آشنائی کا ثبوت دیتا

ہے۔ وہیں یاسیت بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

کوئی ٹھہرے تو روداد غم کہہ سکوں — لوگ چلتے ہیں بہتی ندی کی طرح

دیکھ کر تیور غزل کے سب سخنور — مجھ کو درد و غم کا مظہر بولتے ہیں

سلگتی رات کے لمحات کی لو — جہنم کی تپش سے کم نہیں ہے

آج کے انسان کے کرب واضطراب کی اس طرح ترجمانی کی گئی ہے:

ہر جسم اک الاؤ ہے ہر سانس ایک تپش — انسان آج نرغۂ برق و شرر میں ہے

ایک سورج سے جھلس جاتے ہیں انسان — کتنے سورج میرے اندر بولتے ہیں

اگر ایک کوچہ یہاں ریگزار جیسا ہے — اک ایک چہرہ شکستہ مزار جیسا ہے

آج ہمارے معاشرے میں تاحد نگاہ سراب، بے وفائی، تشنگی اور ناہمواری کا ڈیرا ہے۔ ہر سمت انتشار، اختلال اور بحران کا دور دورہ ہے۔ معاشرتی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی قدروں کی پامالی عام ہے۔ کوئی بھی حساس شاعر ان موضوعات سے پہلو تہی نہیں کرسکتا۔ مظہر محی الدین کی شاعری بھی عصر حاضر کے ان ہی موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ معاشی عدم توازن کا شکوہ ملاحظہ ہو:

امیر شہر نے سورج دبا کے رکھا ہے
اندھیرے چیخ رہے ہیں ہرا یک چوکھٹ پر

دوست کی بے اعتنائی و بیوفائی پر اس طرح تحیر کا اظہار کرتے ہیں:

حیف ہے وہ آستیں کا سانپ کیسے بن گیا
اس کے چہرے پر کہیں ایسا تو کچھ لکھا نہ تھا

اپنی گلی میں یوں تو شناسا کئی ملے
اک اجنبی سے جیسے کوئی اجنبی ملے

شاعر دنیا کے بکھیڑوں سے اکتا کر پھر جنگل کی طرف لوٹنا چاہتا ہے:

میں چاہتا ہوں کہ پھر جنگلوں میں بس جاؤں
گھروں میں سسکیاں، چیخ اور پکار چوکھٹ پر

نام نہاد قیادت جب خود اپنا محاسبہ کرتی ہے تو اس کی پشیمانی کا اندازہ کیجیے:

آئینہ یوں تو زمانے کو دکھایا عمر بھر
آئینہ خود دیکھ کر ڈر جاؤں گا سوچا نہ تھا

مظہر کی نظمیں بھی تاثر سے بھرپور ہیں۔ سادگی اور پرکاری ان نظموں کا نمایاں وصف ہے۔ عصری شعور اور حسیت کے باعث ان کی منظومات تاثیر اور دلآویزی سے پُر ہیں۔ پہچان، اعتراف، مشورہ، کل اور آج، جاگتی دہلیز اور اخراج دراصل فرد اور معاشرے کے اخلاقی زوال کے مرثیے ہیں۔ زندگی کی بے معنویت اور بے رنگی کی کامیاب عکاسی ان کی مختصر نظم ''زندگی'' میں ملتی ہے۔ اسی طرح زندگی کی بے ربطی کا اظہار ''بھرتی کے مصرعے'' سے ہوتا ہے۔ ہلکی پھلکی رومانی نظمیں، بس کا سفر اور میں جانتا ہوں بھی انداز بیان کے باعث متاثر کرتی ہیں۔ ''محرم'' مذہبی رواداری کی عمدہ مثال ہے۔ ''بھوکی موت'' ایک حادثہ پر مبنی بیانیہ نظم ہے جو تاثر سے خالی نہیں۔ فرار، تلاش اور تسکین اس امر کی غمازی کرتی ہیں کہ شاعر علاحدگی اور تنہائی کا شکار ہو کر تسکین کی تلاش میں نقل مقام کرتا ہے۔ متاع مسرت بھی اس مجموعے کی خوبصورت نظم ہے۔ یہ مجموعہ دو پر اثر نعتوں سے شروع ہوتا ہے اور ۱۱۰ صفحات پر پھیل کر ایک ایسی حدیث پر ختم ہوتا ہے جس میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

مجموعی طور پر شاعر کو احساس ہے کہ وہ ایک دشتِ بے برگ میں رواں دواں ہے اور اسے دم لینے کے لیے شجر سایہ دار بھی میسر نہیں۔ وہ اپنی اسی تھکن کے باوجود سفر سے خائف اور مستقبل سے مایوس نہیں۔ اسے راہ کے پُر خطر ہونے کا احساس بھی ہے اور جدوجہد پر یقین بھی:

خطرہ قدم قدم پہ ہر اک رہگذر میں ہے
لیکن حیات ہے کہ مسلسل سفر میں ہے

●●

(اکتوبر 1984ء)

کڑی دھوپ کا سفر

ڈاکٹر وحید انجم

''کڑی دھوپ کا سفر'' جواں سال افسانہ نگار وحید انجم کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جو 1988ء کے اواخر میں شائع ہوا۔ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے رومانی افسانے لکھ رہے ہیں۔ انکے یہ افسانے کالج اور یونیورسٹی کی خوشگوار فضا اور طلبہ و اساتذہ کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ بے روزگاری، سماجی ناانصافی، عورت کی بے وفائی، جہیز اور شادی بیاہ کے مسائل، فسادات، توہمات اور نظام تعلیم کی ناہمواری وغیرہ ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ ان کہانیوں میں رومانیت کا عنصر غالب ہے چونکہ یہ کہانیاں بھی سماجی حقیقتوں سے عبارت ہیں، اس لیے ان میں تنوع ملتا ہے۔ وحید انجم نے ان افسانوں میں زندگی کی المناک حقیقتوں کی ترجمانی کی ہے۔ بیشتر افسانوں کا مرکزی کردار خود وحید انجم ہیں۔ انھوں نے ان افسانوں میں طلبہ کی بے راہ روی کے علاوہ اساتذہ کے غیر منصفانہ رویے پر بھی زخمہ لگایا ہے۔

افسانے ''بدلتے موسم'' ''موم کا پہاڑ''، یکے پہ یکہ، زخم جب ابھرے، رومانی افسانے ہیں، مگر ان کے ذریعہ بھی یہ تاثر دیا گیا ہے کہ زندگی کے راستے بہت ہی پیچیدہ اور ناہموار ہیں۔ خیالوں کی حسین وادی سے نکل کر جب ہم حقیقت کی سنگلاخ زمین پر قدم رکھتے ہیں تو پتا چلے گا کہ زندگی کیا ہے۔ موم کا پہاڑ اور یکے پہ یکہ میں تعلیمی معیار، طلبہ کی تعلیم سے بے توجہی اور اساتذہ کی فرض ناشناسی کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ دراصل ان لڑکوں کی روح بیمار ہے جسم نہیں اور ہم ان کے جسم کا علاج کر رہے ہیں۔ ''ٹائم ٹیبل'' اور ''کھوٹے سکے'' کا موضوع بے روزگاری ہے۔ مصنف کے خیال میں روزگاری کے حل کے لیے کوئی بھی کام بڑا یا چھوٹا نہیں ہوسکتا۔ انسان پیشہ سے نہیں کردار سے پہچانا جاتا ہے۔ تعلیم صرف سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت کے حصول کے لیے نہیں بلکہ اپنے آپ کو کسی پیشہ سے وابستہ کرنے کے لیے بھی ہے۔ وحید انجم کے ایک افسانے ''دوسرا ڈرائنگ روم'' کے عنوان پر نظر جاتی ہے تو ہمیں سریندر پرکاش کا افسانہ ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'' یاد آتا ہے۔ اس افسانے میں آج کے دور کی برق رفتار صنعتی ترقی اور

جوہری خطرات سے پریشان انسانوں کے مسائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان میں عدم تحفظ، تنہائی اور علاحدگی کے جذبات گھر کر رہے ہیں اور انسان اپنے معاشرے، اپنی زمین اور تہذیب میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اجنبی محسوس کر رہا ہے۔ اس طرح وہ اپنے ہی ڈرائنگ روم کو دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم سمجھتا ہے مگر وحید انجم کا افسانہ ''دوسرا ڈرائنگ روم'' کا موضوع بالکل الگ ہے۔ انھوں نے اس افسانے میں جہیز اور شادی بیاہ کے مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔ نیز بہتر زندگی کیلئے عورت کو بھی کسب معاش کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ ''منزل دور نہیں'' کا ہیرو اپنی محبوبہ پر واضح کردیتا ہے کہ وہ صرف لو اسٹوری نہیں لکھتا بلکہ اس کے سینہ میں ایک ایسا دل ہے جس میں ساری کائنات کا درد پوشیدہ ہے۔ اس افسانے میں ذات پات، ریت رواج، بھید بھاؤ، اونچ نیچ کی مخالفت کی گئی ہے۔

کڑی دھوپ کا سفر متعدی مرض، نیا آدمی اور خوشبو کی موت، اس مجموعے کے عمدہ افسانے ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعے سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار فطرت نگاری اور خارجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ کم کم ہی سہی داخلی احساس کو اہمیت دے رہا ہے۔ یقین ہے کہ وہ مستقبل میں کالج کے باہر کے ماحول یعنی زندگی اور اس کے نت نئے مسائل کا بھی اسی فنکاری کیساتھ جائزہ لیں گے۔

●●

(اگست 1988ء)

پیوند خستہ بادبان

خمار قریشی

"پیوند خستہ بادبان" جدید لب و لہجے کے ممتاز شاعر خمار قریشی کا اولین مجموعہ ہے۔ جو دسمبر 1988ء میں شائع ہوا۔ خمار 1965ء سے شعر کہتے ہیں۔ انھوں نے نظم و غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل ان کا خاص میدان ہے۔ جدید تر شاعروں میں اسلوب، تنوع اور فنی اقدار کی پاسداری کے باعث ممتاز ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات ملک کے معیاری رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔ فکر و خیال، اظہار و اسلوب کے اعتبار سے ان کے کلام میں ندرت پائی جاتی ہے۔ کلاسیکیت اور جدیدیت کے حسین امتزاج نے ان کی شاعری کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ وہ یقیناً جدیدیت کے طرفدار ہیں مگر ایسی جدیدیت جو عصری آگہی کے ساتھ روایات کی پاسداری کا تقاضا کرتی ہے۔ خمار شاعری سے نہ صرف حالات اور وقت کی ترجمانی کا کام لیتے ہیں بلکہ شاعری ان کے لیے اظہار ذات کا ذریعہ بھی ہے۔ وہ ادب اور آرٹ کے سماجی مقصد کے معترف ہیں۔ ترسیل و ابلاغ کے مسئلہ پر بھی متوازن رائے رکھتے ہیں۔ شدید ابہام پرستی اور مہمل گوئی کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے کلام پر غالب کی مشکل پسندی اور میر کی سہل نگاری دونوں کا اثر ہے۔ میر ہی کے شعر سے ان کے مجموعہ کلام کا آغاز ہوتا ہے۔ انھوں نے میر کی زمین میں کئی غزلیں لکھیں اور ان کے عام فہم انداز کو بھی اپنایا جیسے:

اندھیرے رستوں پر پھیلاؤں بات کہاں
میرے نصیبوں میں تاروں کی رات کہاں

اے ہجر کی رات دم نہ لینا
جو سہہ رہا ہوں وہ کہہ رہا ہوں

بہر حال انھیں میر سے گہری دلبستگی ہے۔ چنانچہ معترف بھی ہیں:

غزل لطف و اثر پا کر بہ طرز میر رقصاں ہے
چلو برپا کریں محفل چلو دیکھیں شرر لمحا

انھوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر نامانوس اور کم مستعمل بحروں میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور جدیدیت کے زیر اثر زندگی کی لایعنیت، تنہائی کے کرب، عدم تحفظ اور اجنبیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اب طرف تا بہ طرف چھائی ہے بس گم شدگی
استعارہ ہے علامت ہے عیاں تھا پہلے

ہوا میں زور اُدھر سود و زیاں کا
اِدھر پیوند خستہ بادباں کا

جو محافظ تھا میرے اس خوش یقیں کا
وہ بھی خود اب بے اماں ہے اور میں ہوں

ہر طرف منظر یہ سائیں سائیں کرتا ہے خمار
مجھ کو میرے گھر میں تنہا کر گیا ہے کون

شاعر صرف ظفر مندی پر اکتفا کرنا نہیں چاہتا، روسیاہی کا مزہ بھی چکھنا چاہتا ہے:

اے ظفر مندی ترا سایہ غنیمت ہے مگر
ہم سے خوش بختوں کو تھوڑی روسیاہی چاہیے

خمار نے تجربات و حوادث زندگی کو غزل کے فارم میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

آگہی میں آکر اب پچھتاتا ہوں
کتنی پیاری پچھلی وہ گمنامی تھی

تم نے پتھروں کے بس نام سن رکھے ہوں گے
ہم نے سنگ باری کے حادثے بھی جھیلے ہیں

جلا کے راکھ کرو اب یہ کشتیاں ساری
قدم قدم پہ نیا سلسلہ ہے پانی کا
کس کے پاس جائیں ہم عکس جانچنے اپنا
لوگ سارے جھوٹے ہیں آئینے بھی میلے ہیں

اس مجموعے میں ۲۲ نظمیں بھی شامل ہیں۔ یہ نظمیں بھی تاثر سے خالی نہیں۔ رومانی نظموں میں ''میرے نام میں تیرا نام بھی زندہ ہے'' اور سہیلی قابل ذکر ہیں۔ ''رت جگے'' بے مائیگی، بے چہرگی، اور خود علامت جدید موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ مخدوم، اور شاذ کی جناب میں شاعر کا خراج عقیدت بھی خاصا متاثر کن ہے۔

مختصر یہ کہ خمار کی غزلیں و نظمیں ان کی پر خلوص تخلیقی لگن کی غماز ہیں۔ پیوندِ خستہ بادبان ایک ایسے شاعر کا تعارف نامہ ہے جس کو اپنے محسوسات اور تجربات پر اعتماد ہے۔ امید ہے کہ اسی طرح فن کی اعلیٰ منزلوں کی جانب خمار کا شعری سفر جاری رہے گا۔

●●

(1988ء)

گاندھیائی تحریک اور نہرو

ساحل احمد

اُردو رائٹرس گلڈ۔ الہ آباد نے اُردو میں مختصر اور مُفید کتابوں کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کا سہرا گلڈ کے روحِ رواں ساحل احمد کے سر ہے۔ ساحل احمد، درس و تدریس کا دیرینہ تجربہ رکھتے ہیں۔ ان دنوں کرسچین کالج الہ آباد کی صدارت پر فائز ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ طلبہ کی مشکلات و ضرورتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ گلڈ کی جانب سے شائع ہونے والی درجنوں کتابیں ان ہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ ذیل میں ان کی چار کتابوں کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

ا۔ گاندھیائی تحریک اور نہرو:

انڈین نیشنل کانگریس کے ذریعے گاندھی جی نے ملک کی آزادی کے لیے جو جدوجہد کی وہ ہماری تاریخ کا انمٹ و انمول باب ہے۔ گاندھی جی نے اہنسا، ستیہ گرہ، ہوم رول، عدم تشدد، ترکِ موالات، ہندو مسلم اتحاد برت اور گرفتاری کے ذریعے آزادی کی تحریک کو استحکام بخشا اور آزادی کے بعد بھی فرقہ بندی اور تعصب کے خلاف اپنا جہاد جاری رکھا۔ یہاں تک کہ ان کے آخری لمحات بھی ہندو مسلم اتحاد کی نذر ہو گئے۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیرِ اعظم پنڈت نہرو، مہاتما جی کے حقیقی سیاسی وارث تھے۔ جنھوں نے مہاتما جی کے آدرش اور نظریات کے مطابق نئے ہندوستان کی تعمیر کی۔

ساحل احمد نے یہ واضح کیا ہے کہ جدوجہد آزادی اور آزادی کے بعد بھی ملک کی تعمیر تو جمہوری حقوق اور سیکولر اقدار کی برقراری کے لیے اردو کے ادبا و شعرا کا بھی حصہ رہا ہے۔ چکبست لکھنوی سے لے کر سردار جعفری تک کئی شعرا نے مہاتما جی اور پنڈت نہرو کی سرگرمیوں اور خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ساحل احمد نے اس باب میں کئی اردو شعرا کے احساسات کو پیش کیا ہے:

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے (چکبست)

اکبرالہ آبادی کے گاندھی نامہ کا یہ شعر زبان زد خاص وعام ہے:

انقلاب آیا نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے :: شاہ نامہ ہو چکا اب دور گاندھی نامہ ہے

گاندھی جی کی تحریک ترک موالات کی حمایت میں ظفر علی خاں رقمطراز ہیں:

دے کر وطن کو ترک موالات کا سبق :: ملت کی مشکلات کو آسان کر دیا

مہاتما جی کی شہادت کے المناک سانحہ پر بھی اردو شاعروں نے موثر انداز میں اپنے جذبات کی ترجمانی کی:

السلام اے کعبہ و کاشی کے دربان السلام :: السلام اے ہند کے شاہ شہیداں السلام

(جوش ملیح آبادی)

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا — انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

ساتھیو راہبر اٹھ گیا — آدمیت کا پیامبر اٹھ گیا

(جاں نثار اختر)

اردو شاعروں نے نہرو کی حب الوطنی، قوم پروری اور حریت پسندی کو بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے:

گنگا کا وہ امین وہ ہمالہ کا پاسبان :: قوموں میں جس کے اتری نئے دور کی برات

(سید حرمت الاکرام)

بھائی چارے کا امیں انسانیت کا پاسباں

دوستی کا دیوتا پیمبر امن و اماں

نازش ہندوستان فخر زمین و آسماں (شوق لکھنوی)

ہر ایک بے کس و بے زر تری پناہ میں ہے :: دلوں کے زخم کا مرہم تری نگاہ میں ہے

(سکندر علی وجد)

سنا ہے جس کی چتا ہے یہ خاک آئی ہے :: وہ فصل گل کا پیمبر تھا عہد نو کا رسول

(سردار جعفری)

بہر کیف وہ لوگ جنھیں شکایت ہے کہ اردو میں ملکی سرمایہ نہیں ہے۔ یہ کتابچہ ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔● (فروری 1997ء)

غالب کی ہندوستانیت

ساحل احمد

ساحل احمد نے غالب کی شاعری اور ان کے مکتوبات کے حوالے سے اس دور کے ہندوستانی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے۔ غالب نے علاء الدین علائی کے نام ایک منظوم خط میں 1857ء کے بعد کی دلی کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنہ خوں ہے ہر مسلمان کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جاسکے یاں کا

1857ء کے انقلاب نے شاہ ظفر کو جلاوطن کیا، ان کے جوان بیٹوں کو گولی کا نشانہ بنایا اور خود مرزا غالب کے چھوٹے بھائی یوسف کو قید و بند میں ڈال کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس دور کی خلش کا غالب یوں اظہار کرتے ہیں:

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
حال دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلاؤں — انگلیاں فگار اپنی ، خامہ خونچکاں اپنا

بہادر شاہ کی جلاوطنی پر یوں اظہار خیال کیا:

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی — ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
تھی وہ ایک شخص کے تصور سے — اب وہ رعنائی خیال کہاں

غالب جب کلکتہ سے دلی لوٹے تو کلکتہ کی یاد ان کو ستاتی رہی:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تونے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

1860ء میں رام پور پہنچے تو اس شہر کے بارے میں اپنے ایک خط میں تاثرات کا اظہار کیا:

"یہ رام پور ہے دار السرور ہے جو بات یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔ پانی، سبحان اللہ، شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمہ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی

ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے مگر اتنا شیریں کہاں؟'' غالب، رام پور اور حیدر آباد دکن کو گلستان ارم سے تشبیہ دیتے ہیں:

ہند میں اہلِ تسنن کی ہیں دو سلطنتیں — حیدر آباد دکن ، رشکِ گلستان ارم
رام پور اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر — کہ جہاں ہشت بہشت آئے ہوئے ہیں باہم

غالب کی شاعری میں مشترکہ تہذیب اور ملکی تمدن کے خد و خال تمام تر لطافتوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں جیسے:

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخلِ رُطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مرد میدا ں ہے
ثمر و شاخ گوئے وچو گان ہے
مجھ سے پوچھو تمھیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے

غالب عید نوروز اور ہولی کا ذکر بھی خلوص و یگانگت سے کرتے ہیں:

گرچہ ہے بعد عید کے نوروز
ایک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
سوا کیس دن میں ہولی کے
جابجا مجلسیں ہوئی رنگیں

شب قدر اور دوالی ایک ساتھ آنے پر اپنی مسرت کا اس طرح اظہار کیا:

ہم شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے اب کے شب قدر دوالی باہم

ساحل احمد نے اس مختصر کتابچہ کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ غالب کو اپنے ملک ہندوستان اور اس کی تہذیب و تمدن سے والہانہ عشق تھا۔●

(فروری 1997ء)

محمد حسین آزاد : ایک تخلیقی فنکار

ساحل احمد

ساحل احمد نے آزاد کی تصانیف کا جائزہ لیتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ وہ بنیادی طور پر تخلیقی فنکار تھے۔ وہ مقلد نہیں تھے۔ ان کا انداز تحریر متوازن، شگفتہ و معتبر تھا۔ آزاد نے اپنی علمی زندگی کا آغاز درسی کتابوں کی تدوین سے کیا۔ یہ کتابیں بھی عام ڈگر سے ہٹ کر، سہل اور دلچسپ تھیں۔ ادبی تصانیف میں نیرنگ خیال، آب حیات، مکتوبات آزاد، دیوان ذوق، دربار اکبری، سخندان فارس، نگارستان فارس، سیر ایران اور نظم آزاد کو خصوصیت حاصل ہے۔ آب حیات آزاد کو بیک وقت محقق ناقد، تذکرہ نگار، مورخ، ماہر زبان اور انشاء پرداز قرار دیتی ہے۔ آب حیات اردو کا پہلا تنقیدی تذکرہ اور ادبی تاریخ ہے۔ آزاد کی تحقیق کے مطابق اردو زبان برج بھاشا سے نکلی۔ اس پر طویل بحثیں ہوئیں اور آج بھی سلسلہ جاری ہے۔ آزاد نے آب حیات میں جن ابتدائی اردو شعرا کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے ذریعے اس دور کی لسانی وشعری حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

نیرنگ خیال میں آزاد نے انشاء پردازی سے گل بوٹے کھلائے ہیں ان انشائیوں میں حسن کاری تروتازگی شعریت اور تخیلی قوت بدرجہ اتم موجود ہے۔ دربار اکبری میں شہنشاہ اکبر اور اس کے جلیل القدر امراء کے دلچسپ حالات درج ہیں۔ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے جسے آزاد نے تخلیقی بنا دیا ہے۔

سیر ایران، دوسو صفحات پر مشتمل سفر نامہ ہے۔ آزاد کا سفر ایران تحقیقی وعلمی اعتبار سے کارآمد ثابت ہوا۔ مختلف علماومشائخ سے مذاکرے اور بحثیں استفادہ کا باعث بنیں۔ تاریخی عمارات کی سیر کے علاوہ مقدس مقامات کی زیارت سے فیض یاب ہوئے۔

سخندان فارس میں لسانی بحثوں کے ساتھ ایران اور ہندوستان کے قدیم رسم ورواج کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس میں سنسکرت اور فارسی کے باہمی ربط ورشتے پر عالمانہ بحث ہے نیز عربی اور فارسی، ہندوستانی فارسی اور نظم فارسی کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

نگارستان فارس، اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ جس میں رودکی سے لے کر واقف بٹالوی تک کے مشاہیر شعراء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مکتوبات آزاد، میں محمد ابراہیم (فرزند آزاد) میجر سید حسین بلگرامی، محمد دین، منشی ذکاءاللہ، سرسید احمد خان، الطاف حسین حالی علاء الدین علائی، حافظ غلام رسول و دیگر مشاہیر کے نام خطوط شامل ہیں۔

دیوان ذوق، کی ترتیب کے لیے آزاد نے دس ماہ تک دن رات محنت کی، قلمی مسودوں، بیاضوں اور یادداشتوں سے مدد لی، غزلیات اور قصائد پر توضیحی نوٹ لکھے۔ نظم آزاد میں مثنوی کے ساتھ غزلیات قصائد، رُباعیات اور اخلاقی نظمیں شامل ہیں۔ ساحل احمد نے اپنی اس جائزے کے ذریعے آزاد کی تخلیقی، تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

●●

(فروری 1997ء)

خضرراہ : ایک تنقیدی جائزہ

ساحل احمد

ساحل احمد نے اپنے اس تنقیدی جائزے میں "خضرراہ" کی شانِ نزول پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ اقبال نے یہ نظم دوسری جنگ کے اختتام پر اس عہد کے سیاسی، تہذیبی وتمدنی پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھی تھی۔ اس دور کی حالت بقول مصنف عبرتناک تھی۔ نازی جرمنی جنگ ہار چکا تھا۔ روس میں اشتراکیت کا خورشید ضوفشاں تھا۔ عالم اسلام کا حال بھی دگرگوں تھا۔ اس قوم کو آپسی نفاق وتفرقے نے ذلیل ورسوا کر دیا تھا۔ عرب اور ترک باہم دست وگریباں تھے۔ ایران پر دشمنوں کا غلبہ ہو چکا تھا۔ مصر، مراکش اور طرابلس پہلے ہی سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے قبضے میں تھے۔ بیت المقدس پر صلیبی پرچم لہرا رہا تھا۔ ان حالات پر اقبال کی بے چینی خضرراہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس نظم میں اقبال نے سیاست عالم سے متعلق چند سوالات کیے ہیں اور خود ہی بتوسط خضر علیہ السلام، ان کا جواب دیا ہے۔ اقبال سے صحرانوردی کو اس لیے اہمیت دی کہ وہ حرکت کو زندگی اور جمود کو موت قرار دیتے ہیں۔ اقبال نے اس نظم کے ذریعہ مسلمانوں کو بھی آزادی، حرکت اور عمل کا پیام دیا ہے۔ ساحل احمد نے اس نظم کو ایک پرو قیع وپُر وقار قوم کا مرثیہ قرار دیا ہے۔ جس کے ذریعے شاعر نے مسلمانوں کے احساس کمتری ونامرادی کو زائل کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی کارزار عالم میں باعمل ہونے کی تلقین کی ہے۔

اردو رائٹر گلڈ کی مذکورہ کتب کی ضخامت یکساں (32 صفحات) اور قیمت مساوی (چھ روپئے) ہے یہ اشاعتی سلسلہ معلمین وطلبہ کی ضرورتوں کی بھی تکمیل کرتا ہے۔ گلڈ کی جانب سے کم دام پر عمدہ ادب کی فراہمی کی یہ کامیاب کوشش ہے۔

●●

(فروری 1997ء)

مصباحِ تصوف

ڈاکٹر عقیل ہاشمی

''مصباحِ تصوف'' ڈاکٹر عقیل ہاشمی (ریڈر شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی) کے مختلف سمیناروں کے لیے تحریر کردہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ مصنف نے خانقاہی نظام، شریعت اور تصوف، سلاسل طریقت، علم لدنی ، ترکِ دنیا، پیام صوفیہ، رواداری، تصوف اور اصلاحِ معاشرہ جیسے موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ حضرت سید شاہ محمد محمد الحسینی صاحب سجادہ نشین بارگاہِ بندہ نوازؒ نے اپنے پیش لفظ (ایک تاثر) میں حیرت کا اظہار کیا ہے کہ بعض لوگ ہنوز تصوف کو غیر اسلامی کردار کا مظہر تصور کرتے ہیں۔ حالاں کہ اس کی بنیاد قرانِ حکیم اور سرچشمہ حدیث ہے۔ محترم المقام نے اپنے اس ادعا کے ثبوت میں حضرت حمید الدین ناگوریؒ اور حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے اقوال بھی پیش کیے ہیں۔

تصوف کے اشتقاق اور اس کی ماہیت کے بارے میں ''کشف المحجوب'' سے ''مصباحِ تصوف'' تک ہر کتاب میں کافی بحثیں اور وضاحتیں مل جائیں گی۔ تمام صوفیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ تصوف اسلام سے علاحدہ کوئی نظام نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تصوف کے علم صحیح اور عملِ صالح سے امامِ غزالی اور امام ولی اللہ جیسے علم کلام کے علم بردار اور ابنِ سینا اور ابنِ طفیل جیسے فلسفی بھی متاثر ہوئے نیز حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد بن حنبل حضرت امام مالک اور حضرت یحییٰ بن معین، نے بھی صوفیوں کی صحبت سے فیض پایا۔ البتہ بعض علماءِ حق اصحابِ سلسلہ اور دانش ورانِ ملت نے رسمی و عجمی تصوف کے علاوہ جس تصوف کو اپنی تنقیدوں کا نشانہ بنایا اس کا ماخذ اشراقیت، سریت اور ویدانت ہے انھیں اس تصوف سے اختلاف نہیں جس کی بنیاد کتاب وسنت اور جس کا منتہیٰ رضائے حق ہے۔

مصنف کے مطابق آج بھی دنیا کو تصوف کے اسی مصباح کی ضرورت ہے جسے حضور اکرم ﷺ نے ۱۴ سو سال قبل تزکیۂ نفس و تربیتِ باطن کی شکل میں خیر امت کو سونپا تھا۔ صاحبِ ''مصباحِ تصوف'' نے خانقاہ کو روحانی تربیت گاہ قرار دیتے ہوئے خانقاہوں کی موجودہ صورتِ حال کا جو حقیقت پسندانہ جائزہ لیا

ہے وہ خود احتسابی کا نادر نمونہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اب تو خانقاہ، محض ایک ایسی اصطلاح ہوگئی ہے جہاں عہدِ رفتہ کے قصوں اور کہانیوں میں بزرگی وعبادت اور واقعات کا اعادہ بہ طور تبرک وعقیدت کیا جاتا ہے۔"

اس صورتِ حال کے باوجود مصنف کو یقین ہے کہ آج بھی خانقاہیں موثر اور کارگر ہو سکتی ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ اہل خانقاہ ان اوصاف سے متصف ہوں جن کے وہ امین ہیں" ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے اسلامی تصوف کو علم و عمل کا امتزاج قرار دیا ہے۔ ان کا یہ احساس ہے کہ "اسلامی تہذیب وتمدن کی آبیاری اور اصلاحِ معاشرہ کی جہتوں میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے بعد اگر کسی نے عمل کیا ہے تو وہ اولیاءِ عظام اور صوفیاءِ کرام ہی تھے۔ اگر تاریخِ عالم سے ان بزرگانِ سلف کے حالات نکال دیے جائیں تو وہ محض سازشوں، جنگوں، فتوحات اور ملوکیت کی داستان سے زیادہ نہیں جو اسلام کا مقصود نہیں ہمارے بزرگانِ سلف اور اکابر صوفیہ نے جس راہ سلوک کو اپنایا تھا مصنف اس کے احیا کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر چاہتے ہیں کہ اس کی ضیاپاشیوں سے اولاً خود اور بعدہ اپنے اہل وعیال، متعلقین، سماج، قوم اور امن وسلامتی کی متلاشی دنیا بہرہ ور ہو۔

صاحبِ "مصباحِ تصوف" نے واضح کیا ہے کہ اسلامی تصوف میں ترکِ دنیا یا ترکِ علائق کا کوئی تصور نہیں ہے۔ دنیا اور علائق سے علاحدگی، گپھاؤں، جنگلوں اور پہاڑوں میں چلہ کشی اور نفس کشی، تصوف نہیں بلکہ رہبانیت ہے، مصنف نے خدمتِ خلق اور حقوق العباد کے سلسلے میں صوفیہ کی خدمات کو ہماری تاریخ کا روشن باب قرار دیا ہے خانقاہی ربط ونسبت کے باوصف مصنف نے اہل خانقاہ کو دعوت دی ہے کہ وہ اپنے ورثہ پر تکیہ کرنے اور اسلاف کے کارناموں پر فخر کرنے کے بجائے جہد وعمل کے ذریعے راہِ سلوک کو زندہ وتابندہ کریں۔

●●

(دسمبر 1997ء)

دوناول : ایک موضوع

ا۔ اگلی عید سے پہلے

آنندلہر

ناول ادب کی اہم ومقبول صنف ہے جسے اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث ہر دور میں دلچسپی سے پڑھا گیا ہے اور آج بھی اس کی طلب برقرار ہے۔ عصری تقاضوں کے مطابق ناول کے موضوعات بھی بدلتے رہے ہیں۔ ناول نے جب تخیلی وتصوراتی دنیا سے رشتہ توڑ لیا تو واقعیت وحقیقت کی ترجمانی کی، حقیقت کے ادراک کے علاوہ ملکی حالات اور معاشرتی ومعاشی تبدیلیوں کو بھی موضوع بنایا۔ بعض ناول نگاروں نے تحلیل نفسی، ضمیر کی آواز، شعور کی رو، عرفان کائنات پر بھی توجہ مرکوز کی۔

زیرِ نظر ناول ''اگلی عید سے پہلے'' اور ''بیان'' دونوں کا موضوع تاریخ وثقافت کا تحفظ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہے۔ اس لیے ان کے بین السطور اور مرکزی خیال سے آگہی بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

ا۔ اگلی عید سے پہلے : کے مصنف شیام سندر جموں وکشمیر ہائی کورٹ کے سینئر ایڈووکیٹ، افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری اور ناول نگاری سے شغف رکھتے ہیں اور ادبی حلقوں میں آنند لہر کے قلمی نام سے معروف ہیں۔ اس ناول کی بنیاد شیر کشمیر کا نعرہ ''ہندو، مسلم، سکھ اتحاد'' ہے۔ ناول میں قبائلی حملے سے دہشت گردی تک (1946ء تا 1996ء) کشمیر کی خونچکاں داستاں کا حال رقم کیا گیا ہے۔ مصنف نے قبائلی حملہ آوروں، بیرونی ایجنٹوں اور دہشت گردوں کی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہوئے کشمیر کے حالات کی کھری تصویر کھینچی ہے۔ کلچے بنانے والا عبدل اور مندر کا پجاری بدری اس ناول کے دو اہم کردار ہیں جنکی باہمی رفاقت ودوستی ضرب المثل تھی۔ کشمیری ہندو مسلم صدیوں سے وادی میں بھائی بھائی کی طرح گذارہ کر رہے تھے مگر قبائلیوں نے مذہب کے نام پر یہاں کے لوگوں کو آپس میں لڑانے کا منصوبہ بنایا اور اس کے تحت مندر سے شنکھ چوری کیا تاکہ الزام مسلمانوں کے سر جائے اور کشیدگی پیدا ہو۔ شنکھ کی گم شدگی سے ہندو، مسلم دونوں مغموم تھے۔ شنکھ کی تلاش میں بدری تنہا نہیں تھا۔ عبدل اور مسلمان بھی ساتھ تھے۔ تلاش کے باوجود شنکھ نہیں ملا۔ اسی غم

میں بدری کی بیوی شانتی بیمار ہوگئی۔ ریشماں، کشمیر کی اَن پڑھ مسلمان عورت تھی جس نے اپنا زیور پیش کیا تاکہ اسے بیچ کر نیا شنکھ خریدا جائے۔ ریشماں کا زیور قبول کرنے کے بجائے مسلمان اپنی انگلیاں ہونٹوں پر رکھ کر شنکھ کی آواز نکالنے لگے۔ شنکھ کی آواز سن کر لوگ پھر سے مندر جانے لگے۔ قبائلیوں کو ناگوار گزرا۔ انھوں نے مسلمان کو گولی ماردی۔ حالات بد سے بدتر ہوگئے۔ بدری گاؤں چھوڑ دیا۔ عبدل بھی بھاگ کر سرحد پار چلا آیا۔ سرحد پار کے حالات بھی ناگفتہ بہ تھے۔ عبدل نے رفیوجی کیمپ میں دیکھا کہ کشمیری، فوجی تربیت حاصل کررہے ہیں۔ اس نے سوچا کہ ہمارے نوجوانوں کو تو ریاضی، سائنس اور فلسفہ پڑھانا چاہیے تھا مگر وہ موت کی ٹریننگ حاصل کررہے ہیں۔ پچھلے کئی برسوں سے وہ دیکھ رہا تھا کہ بچے جوان ہو رہے ہیں اور قتل کیے جارہے ہیں۔ سرحد پار سے وہ پھر وادی کو لوٹا یہاں بھی صورت حال ابتر تھی، دریا، پہاڑ اور چنار کے درخت وہی تھے مگر کشمیر سنساں تھا۔ دہشت گردی بڑھ گئی تھی، تشدد کا دور دورہ تھا۔ مگر اب بھی سنجیدہ لوگ ہندو مسلم اتحاد چاہتے تھے۔ جب عید قریب آئی تو لوگوں کو بدری کی یاد آئی کیوں کہ بدری ہی ہمیشہ پیش قیاسی کرتا تھا کہ چاند کب نکلے گا۔ اب لوگوں کو شدید احساس ہوا کہ بدری کو جانے کیوں دیا گیا۔ اس نے کس کا کیا بگاڑا تھا؟ لوگوں نے فیصلہ کیا کہ کسی طرح سے بدری کو لے آئیں۔ اگلی عید سے پہلے۔

'دیباچہ' جگن ناتھ آزاد نے تحریر کیا ہے۔ ۱۰۸ صفحات پر مشتمل، دیدہ زیب سرورق کے ساتھ یہ ناول قارئین کی توجہ چاہتا ہے۔ ●

۲۔ بیان

مشرف عالم ذوقی

مشرف عالم ذوقی منفرد اسلوب ومختلف لب ولہجے کے ناول نویس وافسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ بھوکا ایتھوپیا اور ناول ''نیلام گھر'' ادب میں اہمیت کے حامل ہیں۔

زیرِ نظر ناول کا موضوع فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہے، مصنف نے ایک تلخ حقیقت کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرتے ہوئے فسادات کے محرکات کا جائزہ لیا ہے۔اگرچہ مصنف وناشر کی جانب سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اس ناول کے تمام کردار، واقعات اور مقامات فرضی ہیں مگر ناول پڑھتے ہوئے یہ احساس جاگزیں ہوتا ہے کہ کردار آس پاس کے لوگ ہیں اور واقعات ومقامات بھی جانے پہچانے ہیں۔

بال مکند شرما جوش اور برکت حسین اس ناول کے دو اہم کردار ہیں جن کی دوستی ضرب المثل تھی۔دونوں اردو زبان کے شیدا اور مشترکہ تہذیب پر جان چھڑکتے تھے، بال مکند شرما جوش صاحب کی اردو دوستی پر آج حیرت ہو تو ہو لیکن پچاس سال قبل کے زمانے میں وہ حیرت کی بات نہیں تھی بلکہ اردو سے شغف، آداب وتہذیب کا تقاضا تھا۔ناول کے دونوں کردار اخلاق وتہذیب کی نسل کی آخری کڑی تھے دونوں کو پرکھوں کی میراث خطرہ میں نظر آئی۔نئی نسل کی بے راہ روی اور گمراہی پر اُن کا خون کھولتا رہا۔بال مکند شرما جوش کے لڑکے نریندر اور انیل، برکت حسن کا لڑکا منا (تنویر) خاندانی روایات سے انحراف کرتے ہوئے فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہوئے تھے برکت حسین خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔''یا اللہ یہ کیسے بچے ہیں۔آداب......تہذیب......!'' بال مکند شرما جوش اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں ''تم ایک مرتی ہوئی صدی کا تماشا دیکھنے کے لیے زندہ ہو اپنے گھر میں ہی کس پر ادھیکار ہے تمھارا؟ اپنے بچوں پر......؟'' کس طرح غلط فہمیاں تعلقات میں بگاڑ پیدا کرتے ہوئے مستقل دشمنی کی صورت اختیار کرتے ہیں۔اس کا اندازہ بال مکند شرما جوش کی معصوم پوتی مالو کے ان سوالات سے کیا جاسکتا ہے۔اپنے دڈو سے پوچھتی ہے۔

''کیا آپ مسلمان ہیں؟ اردو جو پڑھتے ہیں!''

''میں نے سنا ہے! مسلمان مہینوں نہیں نہاتے، گھر کو گندہ رکھتے ہیں، جانوروں کو
مارتے ہیں، تلوار دکھا کر مسلمان بناتے ہیں۔''

ایک دوسرے سے قربت نہ صرف غلط فہمیوں کو دور کرتی ہے بلکہ دشمنی کو دوستی میں بدل دیتی ہے۔ ''مالو'' جب بیمار ہوگئی تو رات کا وقت تھا گھر میں کوئی نہیں تھا جو ڈاکٹر کو لائے یا بیمار کو دواخانہ لے جائے۔ مالو کا چچا انیل کام کا بہانہ کر کے گھر سے چلتا بنا۔ ایسے میں برکت حسین کا بیٹا منا کام آیا۔ ڈاکٹر کو بلا لایا اور مالو کی دل و جان سے تیمارداری کی۔ مالو کی صحت یابی کے بعد اس کی ماں اوما کے خیالات میں یکسر تبدیلی آئی۔ مسلمانوں کے بارے میں جو غلط فہمیاں تھیں وہ دور ہوگئیں۔ اُسے وشواس ہو گیا کہ راج نیتی، بھید بھاؤ پیدا کرتی ہے اُس نے اپنے شوہر نریندر کو مشورہ دیا کہ وہ راج نیتی چھوڑ دے۔ منا کے والد برکت حسین سوال کرتے ہیں۔

''پتا نہیں سرکار آئین اور قانون توڑنے والی پارٹیوں پر بندش کیوں نہیں لگاتی؟''

مصنف نے قدیم و جدید تہذیب کے تصادم کے علاوہ جنریشن گیپ کو بھی موضوع بنایا ہے۔

۲۶۰ صفحات پر محیط یہ ناول ''بیان'' موضوع اور اسلوب سے متاثر کرتا ہے۔●

(اگست 1999ء)

ورفعنا لک ذکرک

ڈاکٹر سید شاہ خسرو حسینی

اصناف شعر میں نعت گوئی مشکل ترین صنف ہے اور اہمیت کی حامل بھی۔ نعت کے لفظی معنی وصف کے ہیں۔ بعدازاں یہ لفظ نبی کریم ﷺ کی تعریف و مدح کے لیے مخصوص ہوگیا۔ اسلام سے قبل بھی عہد جاہلیہ کے ادب میں شعروسخن کی اصناف ،قصیدہ، مثنوی، غزل، قطعہ، رُباعی، مخمس وغیرہ کسی نہ کسی شکل میں موجود تھیں۔ نعتیہ کلام یا مدحیہ قصیدے کو حضور اکرم ﷺ نے خود پسند فرمایا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن زبیرؓ، حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ، حضرت ضرر بن خطابؓ کے علاوہ عہد رسالت کے کئی اور صحابہ اور صحابیات نے بھی نعتیہ اشعار کہے ہیں۔ نعت کا موضوع حیاتِ طیبہ، صفاتِ مبارکہ اور عشق نبوی ﷺ ہے۔ نعت کے لیے کوئی مقررہ زبان یا فارم نہیں بلکہ نعت گو شاعروں نے غزل قصیدہ، مثنوی، رُباعی، قطعہ، مخمس، مسدس، گیتوں اور دوہوں کی ہیئتوں میں بھی نعت کہی ہیں۔ اسلام کے پیروؤں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ کی بھی اتباع کریں۔ قرآن خود نبی کریم ﷺ کی شان میں ثناخواں ہے کہ ''بے شک اے محمد ﷺ آپ حسن و اخلاق کے بڑے رتبے پر ہیں۔'' قرآن کے الفاظ ''ورفعنا لک ذکرک'' سے بھی آپ کے بلند مرتبے کا اظہار ہوتا ہے۔ گویا آیت مذکور خود نعت من اللہ ہے۔

زیر نظر مجموعہ نعت ''ورفعنا لک ذکرک'' کے ذریعہ جناب سید شاہ خُسرو حُسینی نے بھی بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ جناب سید شاہ خسرو حسینی، حضرت سید شاہ محمد محمد الحسینی صاحب سجادہ نشین بارگاہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے خلف اکبر ہیں۔ بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ موصوف شعر بھی کہتے ہیں ویسے شاعری ان کو ورثہ میں ملی۔ آپ کے دادا پیر حضرت سید شاہ حسینی خیر بندہ نوازی، پُر گوسخن اور نعت گو تھے۔ سید شاہ خسرو حسینی صاحب جامعہ عثمانیہ سے عربی اور میکگل یونیورسٹی ماٹریال (کینیڈا) سے اسلامیات میں پوسٹ گریجویشن کے بعد حضرت گیسو درازؒ کے تصوف میں عشق اور وحدت کے موضوع پر

تحقیقی مقالہ کی ترتیب میں مصروف ہیں۔

اُردو کے علاوہ انگریزی، عربی، فارسی اور ہندی پر کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ حضرت بندہ نوازؒ کی سوانح اور ان کے فلسفہ تصوف پر انگریزی میں ان کی دو کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی اور اُردو کے معیاری رسائل میں آپ کے تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

174 رصفحات پر مُحیط ''ورفعنا لک ذکرک'' میں نثر کے بشمول حرف اول و مقدمہ 98 صفحات اور نظم (نعت گوئی) کے صرف 70 صفحات شامل ہیں۔ اس طرح نعت گوئی کے اس مجموعہ میں نثر، نظم پر غالب آ گئی ہے۔ فاضل مصنف نے آرٹ، فنِ ادب اور فنِ شعر کے علاوہ نعت اور نعت گوئی کے موضوع پر جس عالمانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے، وہ ان کے وسیع مطالعے اور عمیق تحقیقی نظر کی آئینہ دار ہے۔

اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں آرٹ، اصطلاح آرٹ، فن ادب، فن شعر، عہد جاہلیہ اور شعر، اسلام اور شعر کے بارے میں تفصیلات دی گئی ہیں۔ دوسرے حصے میں نعت کے لفظی معنی و مفہوم، اقسام نعت، اصناف نعت، نعت گوئی، آدابِ نعت گوئی، نعت خوانی اور نعت خواں پر بھی مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ بلاشبہ مصنف کی یہ دیدہ ریزی اور علمی مشقت طلبہ اور اساتذہ، محققین اور نعت گو شعراء کے لیے ایک وقیع اور گراں قدر تحفہ ہے۔

کتاب کے جز ثانی میں نعتیہ کلام شامل ہے۔ ابتدا حمد سے کی گئی ہے یقین ہے کہ حمد کے یہ اشعار سادگی و پرکاری کے باعث زبان زد خاص و عام ہوں گے۔

خدائے دو جہاں تو ہے
مکین و لامکاں تو ہے
محمدؐ کی زباں تو ہے
محمدؐ کا بیاں تو ہے
یہاں تو ہے وہاں تو ہے
جدھر دیکھوں عیاں تو ہے

تجلی تیری ہر شے میں
زمیں تو آسماں تو ہے
عطاؤں پر عطا تیری
ہمیشہ مہرباں تو ہے

عربی میں تحریر کردہ سلام بحضور خیر الانام ﷺ بھی خاصے کی چیز ہے۔ اردو فارسی اور ہندی میں لکھی ہوئی نعتیں نہ صرف عشق رسول ﷺ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بلکہ ان کو پڑھتے ہوئے قارئین کا دل بھی عشق محمدی ﷺ سے سرشار ہو جاتا ہے۔ فارسی نعتیں، منم بر تو فدا احمد، اے حب ذوالجلال، نظر کن اور ہندی نعتیں، ''محمد پیا'' اور ''تیرے دوارے'' متاثر کن ہیں۔

ذیل کے ان اشعار سے بھی شاعر کے جذبات قلبی اور حضور پاک ﷺ سے وابستگی کا اظہار ہوتا ہے:

میرے منظوم تخیل پہ نکھار، آپ سے ہے
میرے گیتوں کے ترنم میں سمانے والے
وہی پائے گا تائید الٰہی دین و دنیا میں
ملے گا آپ کا جس کو سہارا یا رسول اللہ ﷺ
تیری یاد میرا سکون ہے تیری دید میرا جنوں ہے
میری دھڑکنوں میں تڑپ تری، دل مضطرب کا قرار ہے

عکس گلاب سے مزین کتاب کا دلآویز سرورق صرف دیدہ زیبی کی علامت نہیں بلکہ اس کا امر کا اظہار بھی ہے کہ اللہ پاک اور اس کے محبوب نبی کریم ﷺ کو سرخ گلاب پسند تھا۔ اسی پسندیدگی کے جواز میں سرورق کے اندرونی صفحات پر احادیث نبوی ﷺ بھی درج کیے گئے ہیں۔ کتاب نہایت اہتمام سے آرٹ پیپر پر شائع کی گئی ہے۔ اگر میگزین سائز کی بجائے ڈیمائی سائز میں شائع ہوتی تو اس کا حسن اور دوبالا ہوتا۔ اس کتاب کی اشاعت گیسو دراز اکادمی بارگاہ بندہ نواز روضہ بزرگ گلبرگہ سے عمل میں آئی ہے۔ ●●

(2003ء)

چند مضامین

پروفیسر صادق

''چند مضامین'' پروفیسر صادق کے 13 نثری مضامین کا مجموعہ ہے جو ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے 2004ء میں شائع ہوا ہے۔ صادق صاحب ادیب وشاعر تو ہیں ہی، اس کے علاوہ افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، ناقد اور مصور بھی ہیں۔ ان کی تخلیقات برصغیر کے موقر رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کئی ادبی رسائل وکتابوں کے سرورق، ان کے ماڈرن آرٹ کے دلکش نمونوں سے مزین بھی ہیں۔ ہم 1976ء سے پروفیسر صادق کی شاعری و مصوری سے آشنا ہیں جب کہ انھوں نے اردو اکادمی گلبرگہ کا ترجمان ''زاویے'' (ایڈیٹر، حامد اکمل) کا سرورق بنا کر بھجوایا تھا جو تجریدی آرٹ کا نمونہ تھا۔

پروفیسر صادق کتنی زبانیں جانتے ہیں، اس کا اندازہ نہیں ہے۔ ان کے ریڈیائی ڈرامے مختلف مراکز سے 12 زبانوں میں براڈ کاسٹ ہوئے ہیں۔ ''چند مضامین'' پڑھتے ہوئے ہمیں ان کی علمی استعداد، زباں دانی اور مختلف زبانوں سے کلی وجزوی واقفیت کا احساس ہوا۔ اردو، ہندی، انگریزی، عربی و فارسی کے علاوہ کم کم ہی سہی وہ کھڑی بولی، سندھی اودھی پنجابی سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کی ہندی شاعری کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی کتاب ''نئی مرہٹی شاعری'' جدید مرہٹی شاعری سے آشنائی کا ایک ذریعہ ہے۔

زیر نظر تصنیف میں تحقیقی وتنقیدی مضامین کے علاوہ شخصیات کا تعارف بھی شامل ہے۔ پروفیسر صادق اچھے محقق اور متوازن تنقید نگار جانے جاتے ہیں۔ قبل ازیں ان کی دو تنقیدی کتابیں ''ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ'' اور ''ادب کے سروکار'' منظر عام پر آچکی ہیں۔ زیر نظر تصنیف میں انھوں نے حیات اللہ انصاری اور عصمت چغتائی کے افسانوی فن کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر صادق، حیات اللہ انصاری کے افسانوں کو بے لاگ حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے کمزور پودا، ''ڈھائی سیر آٹا'' اور ''بھرے بازار میں'' جیسے افسانوں کی انفرادیت اور انداز تحریر کو سراہتے ہوئے ''آخری کوشش'' کو اردو ادب

کے شاہ کار افسانوں میں شامل کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ پروفیسر صادق نے ان کے افسانوں میں کوئی خامی تلاش نہیں کی، کہیں کوئی چیز کھٹکی بھی تو انھوں نے اُسے خوبی پر محمول کیا ہے۔

دوسرا تنقیدی مضمون ''عصمت چغتائی کا افسانوی فن'' ہے۔ عصمت چغتائی کا زمانہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی ہے۔ اس وقت تانیثیت یا تانیثی فکر ورجحان کی اصطلاحات مروج نہیں تھیں، اس کے باوصف جدید ناقدین نے عصمت چغتائی کو تانیثیت کا علمبردار قرار دیا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہے کہ عصمت چغتائی نمائندہ افسانہ نویس تھیں مگر ضروری نہیں کہ ان کا ہر افسانہ شاہ کار ہو۔ اس مضمون میں پروفیسر صادق، عصمت چغتائی کے مداح ہی نہیں بلکہ طرفدار کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے ''لحاف'' کے بارے میں عزیز احمد، پطرس بخاری، خلیل الرحمٰن اعظمی اور دیگر ناقدین سے اختلاف کیا ہے اور یہ پیش گوئی بھی فرمادی کہ ''عہد حاضر کا کوئی بھی قاری عصمت کے افسانے ''لحاف'' کو فحش قرار نہیں دے گا۔ ''لحاف'' جیسے افسانے کی نفسیاتی واقعیت سے انکار نہیں لیکن یہ افسانہ فحش ہے یا نہیں پر بحث ہوتی رہی ہے اور رہے گی اس میں شبہ نہیں کہ یہ بدن کو بیدار کرنے والا ایک افسانہ ہے جو جنسی چٹخاروں سے مبرا نہیں ہوسکتا۔ دراصل اس افسانے کے ذریعہ ترغیب دی جارہی ہے کہ عورت بھی مرد کے غیر فطری طریقوں کو اختیار کرے۔ اس طرح مردوں کے تئیں عورتوں کے انتقامی جذبے کو ابھارا گیا ہے۔ غالباً اسی جذبے کے تحت عصمت چغتائی کی ایک اور مداح سلمیٰ صدیقی علی گڑھ تالوں کا ذکر کرتے ہوئے عصمت چغتائی سے متعلق اپنے ایک مضمون ''عصمت چغتائی کا جادو'' میں رقمطراز ہیں۔ ''میرے بچپن میں مرد یہ تالے عورتوں کے ذہن پر لگاتے تھے اب عورتیں یہی تالے مردوں کے ذہن پر لگاتی ہیں سمجھوتہ مکمل ہے۔ انتقام پایہ تکمیل کو پہنچا''۔ 1

انتقامی جذبہ قابل قدر نہیں ہے۔ جہاں تک مرد کا عورت سے ناروا سلوک ہے وہ کل بھی قابل مذمت تھا اور آج بھی ہے۔ اسی طرح شوہر سے والہانہ لگاؤ، عفت شعاری اور پاکبازی کی قدریں ہر دور میں لازوال رہی ہیں اور رہیں گی۔

جہاں تک شخصیات کا تعارف ہے، اس کتاب میں پروفیسر صادق نے گوپال متل اور کالی داس گپتا رضا کی ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ گوپال متل کے بارے میں انھوں نے جو لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ ''وہ صرف کمیونسٹ دشمن نظریات کے ترجمان ماہنامہ تحریک کے ایڈیٹر نہیں تھے بلکہ مخلص اور بے باک

صحافی تھے۔ شاعر، افسانہ نگار، مبصر، نقاد اور مترجم کی حیثیت سے بھی انھوں نے اپنی شناخت بنائی ہے۔ انھوں نے سماجی حقیقت نگاری، ادب کے جدید رجحانات نیز ادب و سیاست کے موضوع پر بے تکان لکھا ہے۔ سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کرنے میں بھی ان کو مہارت حاصل تھی۔ کئی ناولوں کو انھوں نے انگریزی سے اردو میں منتقل کیا جس میں نوبل انعام یافتہ ناول کینسر وارڈ بھی ہے''۔

کالی داس گپتا رضا کے بارے میں لکھا ہے کہ ''وہ اردو کلچر کے پروردہ تھے۔ انھیں بہ حیثیت شاعر محقق اور ماہر غالبیات کی حیثیت سے اردو ادب میں شہرت دوام حاصل ہے۔ شاعری میں ان کے 15 مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں رباعی کہنے پر بھی قدرت حاصل تھی۔ رباعی گوئی میں ان کا نام امجد، جوش، یگانہ اور فراق کے ساتھ لیا جاتا ہے۔''

''چند مضامین'' میں شامل بقیہ مضامین کی نوعیت تحقیقی ہے۔ ''حیات آزاد کا ایک تشنہ تحقیق پہلو'' سے پتا چلتا ہے کہ جدو جہد آزادی کے دور میں مولانا آزاد کے خفیہ انقلابی تنظیموں سے گہرے روابط تھے۔ دیگر مشمولہ مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صادق کو تصوف اور متصوفانہ فکر سے بھی گہرا شغف ہے۔ شاہ جور سالو، بابا شیخ فرید اور مثنوی خواب وخیال سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ''فراق اور اسلامی ادب'' سے یہ گتھی سلجھائی نہیں گئی کہ اسلامی ادب کیا ہے؟ قرآنی افکار، سیرت اور اسلامی تاریخ سے معمور ادب، کس نام سے یاد کیا جائے گا؟۔ حالی، شبلی، اقبال اکبرالہ آبادی، حفیظ جالندھری کی تخلیقات، سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، عبدالماجد دریابادی، ابوالحسن علی ندوی، رضا خان بریلوی، ماہر القادری، نثار احمد فاروقی، عزیز احمد، حسن عسکری وغیرہم کی نگارشات نیز، حفیظ میرٹھی، ابوالمجاہد زاہد، ڈاکٹر ابن فرید، مظفر وارثی، اعجاز رحمانی، تسنیم فاروقی، ڈاکٹر تابش مہدی وغیرہم کی شاعری کس زمرے میں داخل کی جائے گی۔ کتاب کا آخری مضمون ''اردو شاعری اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے رابطہ'' نہایت اہم مشمولہ ہے۔ جس کے ذریعے مصنف نے ماقبل آزادی اور آزادی کے بعد ہندوستانی زبانوں کی تخلیقات کے اردو تراجم کا احاطہ کیا ہے۔ ڈیمائی سائز میں 112 صفحات پر محیط کتاب کا سرورق خود مصنف کے آرٹ سے محروم ہے حالاں کہ وہ پرکشش اور دیدہ زیب جدید ٹائٹل بنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ مضامین کے تنوع اور ان کی افادیت کے باعث کتاب کی قیمت 150 روپے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ●●

(نومبر 2008ء)

تعلیم وتدریس کے نئے تناظر

ڈاکٹر حلیمہ فردوس

ڈاکٹر حلیمہ فردوس ادبی دنیا میں بہ حیثیت مزاح نگار اپنی شناخت رکھتی ہیں۔ ان کی تصانیف ''ماشاءاللہ'' اور ''بہر کیف'' مزاح نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ کچھ عرصے پہلے حیدرآباد دہلی اور گلبرگہ میں پڑھا گیا ان کا انشائیہ ''دعاؤں میں یاد رکھیے'' خاصا متاثر کن ہے۔ ان کی دلچسپی کا دوسرا رخ تعلیم وتدریس بھی ہے، جس سے وہ گذشتہ کئی برسوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ انھوں نے اردو کی ایک فرض شناس استاد کی حیثیت سے نہ صرف اپنا فرض ادا کیا ہے بلکہ ہنوز وہ طلبہ و اساتذہ کے لیے رہنمایانہ کردار ادا کر رہی ہیں۔ درس و تدریس کے متعلق ان کی پہلی کتاب ''الفاظ کی دنیا'' ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی جو لسانی کھیلوں کا مجموعہ ہے۔ الفاظ کی دنیا کے ذریعہ اساتذہ، طلبہ میں زبان و ادب سے شغف پیدا کر سکتے ہیں۔

زیر نظر کتاب ''تعلیم وتدریس کے نئے تناظر'' موصوفہ کے تعلیمی مشاہدات، تجربات اور تدریسی سفر کے نتائج کا نچوڑ ہے۔ ۱۳۲ صفحات پر محیط یہ کتاب ۲۰۱۱ء میں کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں شامل ۱۵ مضامین کو انھیں مختلف سمیناروں اور اساتذہ کی کارگاہوں میں پیش کرنے کا شرف حاصل ہے۔ ان میں سے بیشتر مضامین اخبارات ورسائل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین کے ذریعے مصنفہ نے سوالات قائم کیے ہیں کہ ہم اردو زبان کے لیے کیا کر رہے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ خصوصاً نئی نسلوں تک اردو کی رسائی کا فریضہ کس طرح انجام دیا جائے؟ نیز اردو زبان کے فروغ اور تعلیم وتدریس سے متعلق اہم نکات ان مضامین کا محور ہیں۔ ہر موضوع پر اکٹھا کردہ نو بہ نو اعداد وشمار سے کتاب کی نوعیت دستاویزی ہوگئی ہے۔ ان ہی محصلہ اعداد وشمار کی روشنی میں انھوں نے اپنے مضامین کا تانا بانا بنا ہے۔ قارئین پر منحصر ہے کہ وہ اپنی بساط بھر کوششوں سے تازہ ترین اعداد وشمار سے بھی واقف ہوں۔

اردو زبان کی ترقی وترویج کے سلسلے میں ''ریاست کرناٹک میں اردو تعلیم ایک جائزہ''، ''کثیر لسانی ملک ہندوستان میں اردو کی شناخت'' اور اردو زبان کی ترقی وترویج میں مختلف اداروں اور تنظیموں کا

رول عالمی سطح پر" اہمیت کے حامل ہیں۔ آخر الذکر مضمون میں مصنف نے صفحہ ۲۲ پر مرکزی حکومت کی لسانی پالیسی کے تحت زبانوں کی ترقی کے لیے کام کرنے والے ادارے CIIL کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے "سولن لکھنو اور میسور میں اس کی شاخیں کام کر رہی ہیں۔ جہاں دیگر زبانوں کے علاوہ اردو زبان کی تدریس کے متعلق اہم پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔" یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ CIIL کا صدر دفتر میسور میں ہے۔ اس کی شاخیں سولن، لکھنو اور پٹیالہ میں کام کر رہی ہیں۔ سولن اور لکھنو کے مراکز خالصتاً اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے وقف ہیں جبکہ پٹیالہ کے مرکز میں ڈوگری، کشمیری، پنجابی کے علاوہ اردو کی ترقی و ترویج کا کام جاری ہے۔ CILL میسور میں دیگر زبانوں کے علاوہ اردو سے متعلق بھی کام انجام دیے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ابتدائی درجوں اور ڈگری کی سطح پر تدریس کے لیے" پرائمری سطح پر اردو زبان کی تدریس" اور کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر اردو زبان و ادب کی تعلیم اور تدریس کے مسائل "معلم بھی قائد بھی"" اور ذرا غم ہو تو یہ مٹی" یوم اساتذہ پر لکھی گئی تحریریں ہیں، جن میں اساتذہ برادری سے امید وابستہ کی گئی ہے کہ وہ صرف نصاب کی تکمیل کو شعار نہ بنائیں بلکہ بچوں کی صحیح خطوط پر تربیت کریں تا کہ وہ زندگی میں اپنے مسائل کا سامنا کر سکیں۔ اس قبیل کا ایک اور مضمون "طلبہ کی شخصیت کی تکمیل میں اساتذہ کا کردار" بھی ہے۔ کتاب کے دیگر مضامین "نصاب کی تکمیل فرض یا قرض"، "سند یافتہ بے شمار اور تعلیم یافتہ ہنر مند مٹھی بھر" فکر انگیز اور قابل مطالعہ ہیں۔ "سرو شکشا ابھیان" کی سرگرمیاں اور محکمہ ڈی۔ ایس۔ آر۔ ٹی۔ سی (DSRTC) جیسے مضامین سے تعلیم کے سلسلے میں حکومت کی کارکردگی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ کتاب بحیثیت مجموعی اس قابل ہے کہ وہ اردو کے تمام سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی لائبریریوں کی زینت بنے تا کہ طلبہ اور اساتذہ اسے پڑھیں اور اس میں درج تجاویز پر عمل پیرا ہوں تب ہی تو بات بنے گی، کیوں کہ بقول شاعر:

نوید صبح جو مل گئی تو کیا حاصل
یہ دیکھنا ہے کہ سورج طلوع کب ہوگا

●●

(ستمبر 2013ء)

آزاد بنام نذیر

(جگن ناتھ آزاد کے خطوط بنام ڈاکٹر نذیر فتح پوری)

نذیر فتح پوری کی ادبی فتوحات کا سلسلہ دراز ہے۔ وہ گذشتہ کئی برسوں سے قلم و قرطاس کے حوالے سے اردو دنیا میں اپنی ادبی، شعری، تحقیقی و صحافتی خدمات کے باعث استناد و اعتبار کا درجہ رکھتے ہیں۔ ۱۹۸۱ء سے سہ ماہی ''اسباق'' ان ہی کی ادارت میں آج تک شائع ہو رہا ہے۔ وہ لگ بھگ ۵۶ کتابوں کے مصنف ہیں۔

زیر مطالعہ کتاب ''آزاد بنام نذیر'' جگن ناتھ آزاد کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۳۰ر نومبر ۱۹۷۸ء تا ۱۴ر جنوری ۲۰۰۴ء نذیر فتح پوری کو تحریر کیے۔ یہ کتاب آزاد کے ۳۹ خطوط پر مشتمل ہے سوائے دو خطوط کے باقی سب جموں سے تحریر کیے گئے ہیں۔ ان خطوط کا دورانیہ ربع صدی پر محیط ہے، یہ خطوط تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ بعض خطوط مختصر تو بعض طویل ہیں، ان خطوط کا طرز تحریر نہایت شگفتہ ہے انھوں نے کسی خط میں بھی بقول نذیر فتح پوری ''اپنی علمیت کا رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی'' خطوط میں انھوں نے نذیر صاحب کو کبھی مجی، محب مکرم، محب گرامی قدر، مجی نذیر تو کبھی برادر عزیز، برادرم عزیز اور عزیز محترم کے القاب سے نوازا ہے۔ خطوط کی ابتدا تسلیم رآداب سے شروع ہو کر دعائیہ جملے ''خدا کرے آپ ہر طرح سے خیریت سے ہوں رامید کہ آپ ہر طرح خیریت سے ہوں گے'' پر ختم ہوتی ہے۔ ان مکتوبات کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بعض کا اختتام پس نوشت رمکرر پس نوشت پر ہوتا ہے۔

مکتوب مرقومہ ۷ر۲ر۱۹۹۴ء سے پتا چلتا ہے کہ جگن ناتھ آزاد ہندوستان کے پبلشروں سے ناراض تھے اُن کے مطابق ''ہندوستان میں کسی حد تک کام کے ناشر، تین چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ زیادہ تعداد پبلشروں کی ناقابل اعتبار ہے'' اس لیے انھوں نے اپنی کتابیں خود چھاپنا شروع کر دی تھیں۔ ایک اور مکتوب میں انھوں نے اردو والوں سے شکایت کی ہے کہ ''وہ کتابیں خریدتے نہیں یہاں تک کہ ریسرچ اسکالرس بھی اپنے موضوع یا ممدوح سے کتابیں طلب کرتے ہیں۔''

کتاب کی ابتدا میں آزاد سے کیا گیا انٹرویو بھی شامل ہے، انٹرویو اور خطوط سے آزاد کی اہم ادبی مصروفیت کے علاوہ علامہ اقبال سے ان کی بے پایاں عقیدت کا اظہار ہوتا ہے آزاد کے مطابق اقبال کا شمار نہ صرف برصغیر بلکہ دنیا کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ آزاد نے اقبال کو گوئٹے، دانتے، ملٹن، شیخ سعدی ،حافظ شیرازی، مولانا روم، فردوسی، تلسی داس، کالی داس اور رابندر ناتھ ٹیگور کی سطح کا شاعر قرار دیا ہے۔ انھیں اقبال کے بعض ناقدین سے شکایت ہے کہ انھوں نے اقبال کی شاعری کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے مذہبی وسیاسی افکار کو موضوع بحث بنایا۔ آزاد نے اقبال کے سلسلے میں سردار جعفری، یوسف سلیم چشتی، اسلوب احمد انصاری اور ڈاکٹر تارا چند رستوگی کے بعض نکاتِ نظر سے اختلاف کیا ہے اور سید مظفر حسین برنی اور ڈاکٹر رفیق ذکریا کے احساسات کی ستائش کی ہے۔ خود آزاد کے نوکِ قلم سے اقبال پر عالمانہ کتابیں منظر عام پر آئیں ان کتابوں میں روداد اقبال، ہندوستان میں اقبالیات، اقبال اور مغربی مفکرین، مرقع اقبال (مطبوعہ پاکستان)، تعمیر فکر (پہلا حصہ اقبالیات) اور Iqbal Mind and Art اہمیت کے حامل ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد نئے ملک کا پہلا ترانہ لکھنے کا سہرا بھی جگن ناتھ آزاد کے سر رہا۔ آزاد کا یہ ترانہ ذھن پر تحریر کردہ حفیظ جالندھری کے منتخبہ ترانہ کے منظر عام پر آنے تک پاکستان میں رائج رہا۔ ۲۰ر اپریل ۱۹۹۷ء کے مکتوب میں پہلے ترانہ سے متعلق تفصیلات ملتی ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کی فکر وفن پر پہلی بار ۱۹۹۷ء میں ایک باقاعدہ کتاب ''جگن ناتھ آزاد ...... ایک مستقل ادارہ'' ڈاکٹر نذیر فتح پوری نے شائع کی تھی اسی طرح پہلی بار آزاد کے خطوط کو مرتب کر کے شائع کرنے کی سعادت بھی ڈاکٹر نذیر فتح پوری کے حصہ میں آئی۔ بلاشبہ اسباق پبلی کیشنز پونے کی جانب سے ۲۰۱۱ء میں شائع شدہ یہ کتاب ''آزاد بنام نذیر'' آزاد شناسی کے باب میں ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

●●

(جنوری 2014ء)

د ۔ پیش نامے

گل رنگ

وزیر علی سہروردی

مولانا وزیر علی صاحب کا تعلق سہروردی خاندان سے ہے۔ آپ کا شمار شہر گلبرگہ کی ان چند شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ جنھیں ہم باقیات الصالحات کہہ سکتے ہیں۔ رواداری، وسیع النظری، کم آمیزی، منکسر المزاجی اور وسیع المشربی سے آپ کی شخصیت عبارت ہے۔ وہ ایک ایسے بزرگ ہیں۔ جنھیں نوجوانوں کا بھی اعتماد حاصل ہے۔

آپ کی علم دوستی اور ادب نوازی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا کوئی اُردو رسالہ یا کتاب خریدے بغیر پڑھنے کے روادار نہیں، باوصف دیگر مصروفیات کے تصنیف وتالیف کے کام میں مشغول ہیں۔ اپنے برادر اکبر مولانا مخدوم علی تابؔ سہروردی کے مجموعۂ ہائے کلام کو زیور طباعت سے آراستہ کرنے کے علاوہ انھوں نے خود گلبرگہ کے ماضی وحال یعنی پچھلے سو سال کے دیدہ وشنیدہ حالات کو مختلف کتابوں کی صورت میں اکھٹا کیا ہے۔

جن میں قابل ذکر (یاد گلبرگ جنوری ۱۹۶۷ء، یادِ صد برگ جولائی ۱۹۷۲ء اور یاد سبز برگ سپٹمبر ۱۹۷۲ء) ہیں۔ ''یاد گلبرگ'' اور ''یادِ صد برگ'' میں حسن گنگو بہمنی سے نواب اکرام اللہ خاں صوبہ دار کے عہد تک گلبرگہ کی تاریخ، معاشرت، تہذیب روایت اور رسم و رواج پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ''یاد سبز برگ'' میں صوفیوں، فقیروں اور مجذوبوں کے حالات، واقعات اور کرامات کا تذکرہ ہے۔ ہر سہ کتب کے مطالعہ سے ۱۰۹ سال قبل کے گلبرگہ سے واقف ہونے کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گلبرگہ میں سب سے پہلے موٹر، گراموفون اور ریڈیو کا استعمال کس نے کیا۔

مجھے یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ سلامتی پبلیکیشنز گلبرگہ کے زیر اہتمام مولانا کی نئی تصنیف ''گلرنگ'' زیور طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے جس میں گلبرگہ کے ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ اور اُردو کے تعلق سے مولانا کے مضامین اور مقالات شامل ہیں۔ مولانا کی یہ چوتھی تصنیف ہے، جس کا میں دلی خیر مقدم کرتا ہوں۔ ●●

(جنوری 1975ء)

حرفِ وفا

نیاز گلبرگوی

نیاز صاحب بیک وقت نثر نگاری اور شاعری دونوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ شاعری میں غزل ان کی پسندیدہ صنف ہے۔ انکی غزلیں کیف اور نغمگی سے معمور ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں شعری روایات کا احترام زیادہ اور روایت شکنی کا عنصر کم نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری ماضی کے جھروکوں، مستقبل کی جھلکیوں اور روح عصر کی تلخیوں سے عبارت ہے مگر یہ تلخی گھن گرج اور احتجاج کی شدت سے مبرّا ہے۔ گداز اور دھیمے لہجے والی ان کی شاعری قاری کے دل کو چھو لیتی ہے۔ انکے پیرایہ اظہار کی ندرت ملاحظہ ہو:

وادیٔ شوق میں ہم بن گئے منزل کا نشاں
نقش پا کوئی نہ تھا اپنے قدم سے پہلے

عشق کی دنیا ہجر سراپا
اشک بدامن درد کا حاصل

تو ہین امتحان محبت ہے دوستو
دشت وفا میں سایۂ دیوار دیکھنا

عیب و ہنر کس میں نہیں ہیں نیازؔ
اپنی خطا پیش نظر چاہیے

رات کے پاس اندھیرے کے سوا بھی کچھ ہے
چاند کا نور، ستاروں ضیا بھی کچھ ہے

میں نیاز صاحب کو ''حرفِ وفا'' کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور پر امید ہوں کہ ''یہ نقش اولین'' کئی دلوں پر نقش ہو جائے گا۔ ●●

(جون 1983ء)

بن باس

ڈاکٹر کوثر پروین

اردو افسانہ دیگر اصناف کے مقابلے میں نسبتاً کم عمر سہی مگر سرخرو ہے۔ کیونکہ اردو پڑھنے والی نئی نسل شاعری کے بعد سب سے زیادہ افسانے کی جانب راغب ہے۔ اردو افسانہ نگاری کی تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے ابتدائی افسانہ نگار رومانیت پسند تھے۔ پہلی بار پریم چند نے حقیقت پسندی کی راہ دکھائی۔ ۱۹۳۶ء کے بعد اردو افسانے پر سماجی شعور کا غلبہ رہا۔ بعض افسانہ نگاروں نے جنسی مسائل کو موضوع بنایا۔ ایک عرصہ تک اردو افسانے پر مارکس اور فرائیڈ بھی چھائے رہے۔ مگر بعد میں ایسے افسانے تخلیق کیے گئے جن میں شعور کی رو کو پیش کیا گیا۔ گذشتہ دو دہوں میں تجرید اور علامت کو بھی ایک رجحان کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس طرح اردو افسانہ طلسماتی، روحانی، جنسی اور شعوری پیرایہ اظہار سے ہوتا ہوا آج تجرید اور ترسیل کے دوراہے پر کھڑا ہے۔ ابتداء میں جن افسانہ نگاروں نے تجرید اور علامت کا سہارا لے کر افسانے تحریر کیے تھے وہ اب محسوس کر رہے ہیں کہ انھیں علامت کے برتنے میں صریحاً ناکامی ہوئی ہے۔ اس طرح اب افسانہ کشاں کشاں کہانی پن کی طرف مراجعت کر رہا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ اردو افسانہ ہیئت اور اظہار کے لیے نئے تجربوں سے دست کش ہوگیا ہے۔ بلاشبہ آج اردو افسانے کی ہیئت میں نمایاں تبدیلی ہوئی ہے۔ افسانہ نگار بیانیہ انداز کے بجائے اسطوری طریق کو کام میں لا رہے ہیں آج کا افسانہ نگار اپنے عہد کی حسیت کا ترجمان بھی ہے۔

گلبرگہ کے ادبی افق سے ابھرنے والی نوخیز افسانہ نگار کوثر پروین کو افسانے کی اس ارتقائی تاریخ کا گہرا شعور ہے۔ یہی وجہ ہے وہ جدید افسانہ کے پیرایہ اظہار سے متاثر ہیں اور روایت سے بھی ان کا رشتہ برقرار ہے۔

کوثر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ہلچل سی کوئی'' جنوری ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔ گذشتہ ۹ سال سے وہ مسلسل لکھ رہی ہیں مختلف جرائد اور اخبارات میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ریڈیو سے بھی

ان کی کئی کہانیاں نشر ہو چکی ہیں۔ آج جبکہ ۱۹۸۸ء پایۂ اختتام کو پہنچ رہا ہے ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''بن باس'' ہمارے پیش نظر ہے۔

ان کی ۹ سالہ افسانہ نگاری کے تقابلی مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ان کا فن مسلسل ترقی پذیر ہے۔ انھوں نے افسانوی اظہار کو عصر حاضر کے اسلوب سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ ان کے افسانے ہیئت اور اسلوب کے لیے تجربوں سے ناآشنا نہیں ہیں۔ ان افسانوں میں سطحیت اور روایتی رومانیت کا گذر نہیں ان کے افسانے عام مشاہدات کے علاوہ ذاتی احساسات سے بھی عبارت ہیں۔ ان کے انداز بیان میں ربط اور لب و لہجے میں اعتماد پایا جاتا ہے۔

اس مجموعے میں کوثر پروین نے اقدار کی شکست و ریخت، زندگی کی لایعنیت، تنہائی، اجنبیت، عدم تحفظ اور عدم تشخص کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جن احساسات کو افسانہ نگار نے اپنے قلم کی گرفت میں لیا ہے، وہ یقیناً جدید دور کی دین ہیں۔ یہ ان موضوعات سے یکسر مختلف ہیں جن کا احاطہ ''ہلچل سی کوئی'' میں کیا گیا تھا۔ نہ صرف موضوعات مختلف ہیں بلکہ بن باس کے افسانوں میں ہیئت اور اسلوب کے لحاظ سے بھی نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ ''کھڑکی'' ''ذات'' اور گمان کے دار پر'' عدم تحفظ کے موضوع پر موثر افسانے ہیں۔ ''خون'' اور ''میلہ'' اقدار کی شکست کا المیہ ہیں۔ ''وجود'' نہ صرف احساسِ تنہائی بلکہ اپنے وجود کی عدم موجودگی کا شدت سے احساس دلاتا ہے اور یہ تاثر دیتا ہے کہ اس دور میں ہر کوئی تنہا ہے اور سب کو اسی احساس نے وقت سے پہلے ختم کر دیا ہے۔ ''بن باس'' ہی اس مجموعہ کی عمدہ کہانی ہے جس کا مرکزی کردار رام ہے۔

یوں بھی ہر بچہ اپنے ماں کیلئے رام ہوتا ہے اور اس کی طویل جدائی بن باس کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اس افسانے میں مکھیا کے غیر قانونی کاروبار کی نقاب کشائی کرتے ہوئے گاؤں کے ماحول کی کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ یہ افسانہ سماجی انتشار اور تمدنی تغیر سے بوکھلائے ہوئے ایک ایسے کردار کی تصویر کشی کرتا ہے جو انسانی جبر اور رشتوں کے جال میں پھنس کر اپنی زندگی ختم کرتا ہے۔ ''تمغہ'' ایک محب وطن ہندوستانی فوجی بلونت سنگھ کے احساس ندامت کی کہانی ہے۔ اس فوجی نے برطانوی حکومت کی جانب سے دوسری جنگ عظیم میں صرف اس تیقن پر حصہ لیا تھا کہ جنگ کے بعد انگریز اس ملک کو آزاد کر دیں گے۔ مگر جب انگریز اپنے وعدے سے پھر گئے تو اس میں ندامت کا احساس پیدا ہوا۔ وہ کبھی اسے چین لینے نہیں دیتا۔ کوثر

کی دیگر کہانیاں بھی متاثر کن ہیں۔

اردو کی ممتاز افسانہ نگار ہاجرہ مسرور نے اپنے نصف درجن افسانوی مجموعوں کی اشاعت کے بعد یہ اعتراف کیا تھا کہ ''کوئی ایسی چیز ابھی تک لکھنے کا ارمان ہے جسے چھپوانے کے بعد پڑھوں تو کسی کمی کا احساس نہ ہو''۔

کوثر پروین کے صرف دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ یقیناً انھیں بھی اپنے افسانوں میں جو کمی ہے اس کا احساس ہوگا اور وہ ہمیں مستقبل میں ایسی کہانیاں ضرور دیں گی جن میں کسی کمی کا احساس نہ رہے۔ میں کوثر پروین کو ان کے دوسرے افسانوی مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں اور پُر امید ہوں کہ قارئین کے علاوہ ناقدین بھی اس کی پذیرائی فرمائیں گے۔

●●

(نومبر 1988ء)

متاع آگہی

محمد اعظم اثر شاہ پوری

الطاف حسین حالی سے شمس الرحمن فاروقی تک کئی ناقدین نے شعر کی تحسین و تنقیص کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ہر ایک نے اپنے نقطہ نگاہ سے شعر کی تعریف، تفہیم و توضیح کی ہے اور اچھے شعر کے لوازمات کا تعین کیا ہے۔ کسی نے فکر جمیل کو شعر قرار دیا تو کسی نے کہا کہ اخلاص شاعری کی روح ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اچھا شعر نہ صرف دل کو چھوتا ہے بلکہ قاری و سامع کی مسرت و بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔ تو کوئی شعر کے لیے وجدان و فکر دونوں کو ضروری سمجھتا ہے۔ اردو کے اولین ناقد نے شعر لے لیے تخیل یا قوت متخیلہ کو ناگزیر قرار دیا تو ایک جدید ناقد کی دانست میں شعر محض ہیئتی تجربہ ہے۔

اس تناظر میں اعظم اثر کی شاعری کا جائزہ ان کے اشعار کی تفہیم میں مددگار ہوگا۔ یقیناً ان کی شاعری میں مواد و ہیئت کی وحدت کے علاوہ داخلیت و خارجیت کا امتزاج ملتا ہے۔ جب ہم ان کا منتخب کلام پڑھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے درحصل یہی احساس شعر کے اچھے ہونے کا جواز فراہم کرتا ہے۔

اعظم اثر معروف شاعر ہیں۔ متاع آگہی ان کا دوسرا مجموعہ ہے "زخم آگہی" سے متاع آگہی تک اثر کا جو ادبی سفر ہے اس سے ان کی ذہنی اپج اور شعری رویوں کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے حمد، نعت و مناجات کے علاوہ قطعات، غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں۔ غزل ان کا خاص میدان ہے اور ان کی بعض غزلوں کا رنگ نکھرا اور روپ سہانا ہے۔ ان ہی کے الفاظ میں

مجھے وہ یاد پھر آیا بہت ہے :: غزل کا روپ بھی نکھرا بہت ہے

اعظم اثر نے متنوع مضامین کو موضوع سخن بنایا ہے۔ ان کے شعروں میں سطحی رومانیت کے بجائے حقیقی محبت کی جھلکیاں ملتی ہیں:

میں اب یہ سوچ رہا ہوں یہ سب ہوا کیسے　　تجھے بھلا کے میں خود اپنا بن گیا کیسے

ہوا کا زور بھی جس کو بجھا نہ پایا تھا　　دیا وہ کمرے کے اندر ہی بجھ گیا کیسے

شاعر کی یہ آرزو بھی کتنی حسین ولطیف ہے:

یوں تو رہنے کے لیے اور ٹھکانے ہیں کئی :: سب سے بہتر ہے کسی دیدہ تر میں رہنا

اعظم اثر ادب میں کسی خاص نظریہ کے پیرو نہیں ہیں۔ انہوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے زیر اثر شعر کہے ہیں، جیسے:

خدایا ان کو گہری نیند عطا کر　　ترستے ہیں جو بستر کے لیے بھی

عجیب لوگ ہیں اس آگ اگلتے موسم میں　　چمن میں اب بھی گل تر تلاش کرتے ہیں

آئینہ دیکھا تو اک چہرے پہ تھے چہرے کئی　　تھی خطا چہرے کی یا خامی کوئی درپن میں تھی

حصار ذات میں ہوں قید کب سے　　جہاں کوئی دریچہ ہے نہ در ہے

ہر دور کی شاعری اپنے عہد کے جذبات واحساسات کے علاوہ خود شاعر کے گردوپیش کی عکاس ہوتی ہے۔ اثر کے یہ اشعار میرے ادعا کی تصدیق کریں گے:

وہ جو حالات کے سیلاب میں بہہ جائے اثر　　ایسے انسان کو تم ریت کی دیوار لکھو

میں وہ شجر ہوں جو سایہ بھی کھو چکا اپنا　　جو چھلنی چھلنی ہوا ہے وہ سائبان ہوں میں

میرا ہر شعر ایسی کتاب زندگی جس میں　　میرے ماضی میرے حال اور مستقبل کا قصہ ہے

اعظم اثر نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ جو دوستی کے پردے میں درپئے آزار، ہو وہ دوست کیسے ہوسکتا ہے؟ طنز کی یہ کاٹ ملاحظہ ہو:

روبرو میرے میرا درپئے آزار ہے جو :: تم کو لکھنا اگر آتا ہے اسے یار لکھو

اعظم اثر کی آزاد نظمیں بھی بڑی پراثر ہیں۔ ''مجسمہ'' انتباہ، حیات نو اور سناٹا جیسی نظموں سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ''مجسمہ'' میں طنز کا عنصر غالب ہے جس کے ذریعے مردہ پرستی کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ ''انتباہ'' کے ذریعے ایسے بنیاد پرستوں کو متنبہ کیا گیا ہے جو حالات سے سمجھوتہ نہیں کرسکتے۔ ''سناٹا'' میں تنہائی کا کرب موجزن ہے۔ ''کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں'' میں انسان ماضی میں روندے

جانے کے باوجود اس لیے پرامید ہے کہ ایک دن اس کا مستقبل روشن ہوگا۔ اس قبیل کی دوسری نظمیں بھی قاری کا دل موہ لیتی ہیں۔

میرا احساس ہے کہ "زخم آگہی" کی اشاعت کے بعد شاعر کی زنبیل میں سوچوں کا جو سرمایہ اور تجربوں کا جو وافر ذخیرہ تھا اُسے من وعن پیش کردیا گیا ہے۔ کاش اثر کا دیوان مختصر ہوتا کیوں کہ اکثر مختصر دیوان میں منتخب اشعار ہی جگہ پاتے ہیں اور اعظم اثر خود یہ کہنے میں حق بجانب ہوتے!

جو لے کے پھر رہا ہوں دیوان مختصر ہے : ہر شعر میں ہے وسعت گہرے سمندروں کی

اس سے قطع نظر متاع آگہی میں جابجا ایسے اشعار ملتے ہیں جو اپنی تہہ داری اور اسلوب اظہار سے متاثر کرتے ہیں۔ نمونتاً چند اشعار پیش ہیں:

ہوں یقین میں نہ میں گمان میں ہوں
اب بھی دونوں کے درمیان میں ہوں

جلایا ہر بدلتی رت نے جس کو
اسے دیوار کا سایہ بہت ہے

آئے جو ہمیں سنگ اٹھانے سلیقہ
ہم سے بھی کئی شیشہ بدن بات کریں گے

گنہگاروں کی بستی کا ہے یہی دستور
کوئی گناہ بھی مجرم کے سر نہیں جاتا

وقت ہی کردے نہ کوئی فیصلہ
وقت پر ہر فیصلہ کرتے رہو

اعظم اثر کا ادبی سفر ختم نہیں ہوا۔ مستقبل میں ان سے اور اچھی امیدیں وابستہ ہیں۔ انکی صلاحیتیں انہیں دعوت سفر دے رہی ہیں۔ مجھے بھی انکے عزم سفر پر اعتماد ہے اور وہ خود بھی بڑے پر اعتماد ہیں:

ہے اگر عزم سفر تو تیرگی کا خوف کیا
پھر کوئی سورج اُگے کا چاند ابھرے گا چلو

●●

(اگست 1999ء)

مولانا انواراللہ فاروقی : شخصیت علمی وادبی کارنامے

ڈاکٹر محمد عبدالحمید اکبر

سرچشمہ علم وفضل حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد انواراللہ فاروقی علیہ الرحمہ، جامعہ نظامیہ اور دائرۃ المعارف النظامیہ کے بانیوں میں سے ہیں۔ موصوف اردو کے ممتاز نثر نگار وشاعر تھے۔ عربی اور فارسی میں بھی انھوں نے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھیں استادِ سلاطین آصفیہ ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ اپنے عہد کی اس عبقری شخصیت کے خدوخال وفن کے تحقیقی جائزے سے تقریباً ایک صدی تک پہلوتہی، دکن کے جامعات ودیگر علمی وتحقیقی اداروں کے لیے سوالیہ نشان ہے؟ مجھے بے پایاں مسرت ہے کہ بالآخر ارض گلبرگہ (کرناٹک) کے ایک ہونہار فرزند عبدالحمید اکبر نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا اور یہ سعادت ان کے حصے میں آئی۔

عبدالحمید اکبر نے جامعہ نظامیہ سے مولوی عالم، جامعہ عثمانیہ سے عربی اور کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ سے اردو میں پوسٹ گریجویشن کیا اور پروفیسر محمد اعظم (احمد نگر) کی نگرانی میں زیرِ نظر تحقیقی مقالے کے ذریعہ پونا یونیورسٹی (مہاراشٹرا) سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ تحقیقی مقالہ (۶) ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں حالات زندگی سے لے کر مولانا کے فکری پس منظر، نثری وشعری تصانیف کے علاوہ اسلوب نگارش کا معروضی جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے اسلوب کیا ہے؟ اسلوب کی تشکیل اور اس کے محرکات کی وضاحت کی ہے۔ نیز ممدوح کے اسلوب نگارش کا تعین کرتے ہوئے سرسید، حالی، شبلی اور نذیر احمد کے اسلوب سے تقابل کیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار کی کاوشوں سے جہاں ۱۸۵۷ء کے بعد کے ہندوستان کی اسلامی معاشرت وادبی تاریخ سے آگہی ہوتی ہے وہیں اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ مولانا محمد انواراللہ فاروقی نے آزاد فکر مصنفین کی جانب سے اسلامی احکامات کی جو غلط تاویلات کی جارہی تھیں، رسالہ مقاصد الاسلام کے ذریعہ ان کا سدباب کیا۔

مقالے کی زبان سادہ وشگفتہ اور انداز بیان دل نشین ہے، قوی امید ہے کہ ڈاکٹر عبدالحمید اکبر کی اس تحقیقی کاوش کی علمی، ادبی وتحقیقی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ ●● (جنوری 2000ء)

انوکھی شادی اور فقیر کی تین لکیریں

(بہمنی دور کے دو تاریخی ڈرامے)

ریون سدیا ئردرسوامی مٹھ

ڈرامہ کے آغاز کے بارے میں دو نظریات عام ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ یونانی قوم نے سب سے پہلے ڈرامے کا آغاز کیا۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ یونان سے پہلے ہندوستان میں ڈرامے کی ابتدا ہو چکی تھی۔ بھرت منی نے اپنی کتاب "ناٹیہ شاستر" میں ناٹک کی ابتدا کے بارے میں جو تفصیلات دی ہیں، ان سے ہندوستانی ڈرامے کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قدیم ہندوستان کے ڈرامہ نگاروں میں بھاس، کالیداس، مراری نرائن بھٹ، سری ہرش اور بھوبھوتی کے کارنامے بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ بکرماجیت کے بعد ڈرامہ کا فن پیشہ وروں کے ہاتھ لگ گیا۔ جنھوں نے سوانگ، لیلا، رام لیلا، نوٹنکی، رہس اور کٹھ پتلی سے تماشوں کو تفریح کا ذریعہ بنایا۔ اسی تفریحی دور میں اردو ڈرامے نے آنکھ کھولی۔

پندرھویں صدی عیسوی میں اردو ڈرامے کی ابتدا ہو چکی تھی۔ پرتگیزیوں نے جب گوا فتح کیا تو انھوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے اردو ڈرامے پیش کیے۔ ۱۵۳۴ء میں پرتگیزیوں نے بمبئی پر قبضہ کیا تو اردو اسٹیج نے بھی ترقی کی۔ اٹھارویں صدی کے اوائل میں فرخ سیر کے ایک درباری نواز نے 'شکنتلا' کا اردو میں ترجمہ کیا جو معیاری نہیں تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر مرزا کاظم علی نے شکنتلا کا پھر سے ترجمہ کیا جو مقبول عام ہوا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے مطابق اردو کا پہلا ڈرامہ "افسانہ عشق" تھا، رادھا اور کرشن کی کہانی پر مشتمل یہ ڈرامہ سلطان اودھ واجد علی شاہ نے ۱۸۴۳ء میں لکھا تھا۔ ۱۸۵۱ء میں امانت لکھنوی نے "اندر سبھا" لکھا۔ انگریزوں کے عہد میں بمبئی تھیٹر تعمیر ہوا تو پہلے انگریزی، مرہٹی اور گجراتی ڈرامے اسٹیج کیے گئے۔ بعد ازاں خود مرہٹوں نے اردو ڈرامے کی ابتدا کی جسے پارسیوں نے بام عروج پر پہنچایا۔ بقول ڈاکٹر عبدالعلیم نامی "۱۸۶۱ء میں ممبئی میں ۱۹ پارسی کمپنیاں کام کر رہی تھیں، جن میں بیشتر اردو ڈرامے اسٹیج کیا کرتی تھیں۔" رونق بنارسی، حسینی میاں ظریف، احسن لکھنوی، بے تاب دہلوی اور آغا حشر کاشمیری نے پارسی تھیٹروں کے

لیے کامیاب اردو ڈرامے لکھے۔ ان میں آغا حشر کاشمیری نے اپنی تمثیل نگاری سے ہندوستانی اسٹیج کی دنیا میں ایک تہلکہ مچادیا۔ ۱۹۳۵ء تک انھوں نے ۴۲ ڈرامے لکھے۔ ان میں خوبصورت بلا، گل بکاولی، رستم وسہراب، شہید ناز وغیرہ بہت مشہور ہوئے۔ ان کے ہم عصر ڈرامہ نگاروں میں ذائق لکھنوی، غلام عباس اور حکیم احمد شجاع قابل ذکر ہیں۔

۱۹۳۱ء میں جب بولتی فلموں کا آغاز ہوا تو ڈرامے کا فن بھی متاثر ہوا۔ انیسویں صدی کے وسط میں اگر چہ ادب کی مختلف اصناف میں تبدیلی آئی مگر ڈرامے کی صنف کو نظر انداز کیا گیا۔ البتہ بیسویں صدی کے وسط میں ادیبوں میں اسٹیج کو اعلیٰ سماجی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا شعور پیدا ہوا چنانچہ عوامی تھیٹر، پرتھوی راج تھیٹر اور جوہو آرٹ تھیٹر نے ترقی پسند ڈرامے اسٹیج کیے۔ ان میں کرشن چندر، اوپیندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، سعادت حسن منٹو، پروفیسر مجیب، فضل الرحمٰن، ڈاکٹر عابد حسین، کرتار سنگھ دگل، اشفاق حسین قریشی، امتیاز علی تاج، حبیب تنویر، اطہر پرویز، ریوتی شرن شرما اور ساگر سرحدی کے ڈرامے قابل ذکر ہیں۔ اردو ڈراموں کے احیاء میں ریڈیو ڈراموں کا بھی اہم حصہ رہا ہے۔ منٹو، بیدی، فکر تونسوی، سلام مچھلی شہری، انور معظم، اظہر افسر، ابراہیم یوسف، احمد جمال پاشاہ، غلام جیلانی، ساجدہ زیدی، وجاہت علی سندیلوی، ظہیر اور دیگر کئی ڈرامہ نگاروں نے اس صنف کو آگے بڑھایا۔

گذشتہ ۴، ۵ دہوں کے ڈراموں کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جرمنی، فرانس، امریکہ، انگلستان، روس اور دیگر مغربی ممالک کے ڈرامائی فن میں نئی جہتیں در آئی ہیں۔ فرد و سماج کے نت نئے مسائل اور قدروں کی شکست و ریخت نے نہایت جذباتی، حساس اور بیدار مغز ڈرامہ نویس پیدا کیے۔ ان میں انگلستان کے ایڈورڈ پاونڈ، آرنلڈ، جان آسبورن، امریکہ کے ایڈورڈ ایلبی، جرمنی کے بریخت اور روس کے اسٹرنس لاوسکی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ دور جدید میں حقیقت اور رومانیت روایتی مفہوم کھو چکے ہیں اور زندگی کو وجودی آنکھ سے دیکھنے کا عمل جاری وساری ہے۔ مگر اردو میں بہت ہی کم ڈرامہ نویسوں نے اس جانب توجہ دی ہے۔ ان ہی کمیاب ڈرامہ نویسوں میں قدیر زماں بھی شامل ہیں جنکے ڈراموں کا مجموعہ "پنجرہ کا آدمی" جدید ترین ڈراموں کی نمائندگی کرتا ہے۔

ڈرامہ کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ قدیم ڈرامہ چاہے یونانی ہو کہ ہندوستانی، دیومالائی کے گرد

گھومتا رہا۔ بعد ازاں تاریخی واقعات، عشق و محبت کے قصوں اور سماجی مسائل کو موضوع بنایا گیا۔ بعض ڈراموں کا مقصد دل بستگی و تفریح تھا اور بعض کا مقصد صرف روپیہ بٹورنا رہا۔ ہمارے ڈرامہ نویس یہ فراموش کر گئے کہ اعلیٰ ڈرامے کا وصف تو "تطہیر نفس کے ساتھ ساتھ اسرار حیات کی نقاب کشائی" بھی ہے۔ اس تناظر میں ریون سدیارُدر سوامی متھ کے اردو ڈراموں کے مطالعے سے یہ احساس جاگزیں ہوتا ہے کہ انھوں نے گردش ایام کو پیچھے کی طرف لوٹانے کی سعی ضرور کی ہے مگر اس سعی کا حاصل روایات کا احترام، تہذیبی ورثہ کی شناخت اور ماضی کی بازیافت ہے۔

ریون سدیارُدر سوامی متھ کنڑا کے ممتاز ادیب، شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ درس و تدریس ان کا شغل رہا ہے۔ ایک عرصے تک معلّمین کے سرکاری تربیتی ادارے کے صدر رہ چکے ہیں۔ محکمہ تعلیم کے ماہنامہ جیون وکاس کی ادارت بھی اُن کے ذمہ تھی۔ جیون وکاس کے منتخب اداریوں پر مشتمل ان کی تصنیف "ہلکے بلاپا" (لوح و قلم) رہنمائے معلّمین کا کردار ادا کر رہی ہے۔ ان کی کنڑا شاعری کے بھی دو مجموعے "روا" (آواز) اور "دلمبا" (اتار) بھی شائع ہو چکے ہیں۔ مگر ان کا اصل میدان ڈرامہ نگاری ہے۔ خصوصیت کے ساتھ انھیں تاریخی ڈراموں سے فطری شغف ہے ان کے کنڑا ڈرامے "محمود گاوان" "شوراپور میں سنگولی رائنا" اور بلا بل (بیلا ٹا) علاحدہ علاحدہ شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ ان میں محمود گاوان کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ ڈرامہ کرناٹک کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہو چکا ہے۔ ان کے ریڈیو ڈرامے دلچسپی سے سنے جاتے ہیں تا حال انکے تحریر کردہ ۳۵ ڈرامے اے۔ آئی۔ آر گلبرگہ سے نشر کیے گئے ہیں۔ اے۔ آئی۔ آر کی جانب سے منعقدہ ریاستی سطح کے مقابلے میں ان کا ڈرامہ بعنوان "ایک ڈرامہ جو نشر نہیں ہو سکا" انعام اول کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ ایک اور ڈرامہ "ماتا آڑو واتو تگے گلو" (بولتی شاخیں) کو بھی آل انڈیا ریڈیو کی جانب سے منعقدہ قومی سطح کے مقابلے میں انعام سوم مل چکا ہے۔ ۱۹۹۴ء میں کرناٹک ناٹک اکاڈمی نے انھیں بحیثیت ڈرامہ نگار ایوارڈ سے نوازا اور کیسہ زر و توصیفی سند عطا کی۔

ریون سدیا جی کو نہ صرف عثمانین ہونے کا افتخار حاصل ہے بلکہ گریجویشن کی سطح تک انھوں نے اردو ہی کے ذریعے تعلیم حاصل کی۔ ایم۔ اے میں کنڑا کے ساتھ اردو بھی ان کا مضمون رہا ہے۔ تاریخ سے بھی ان کو رغبت ہے۔ خاص طور پر دکن کے بہمنی سلاطین کے عہد پر ان کی گہری نظر ہے۔ تاریخ اور اردو سے

دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے بہمنی سلطنت کے چند اوراق کو ڈراموں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ شمالی کرناٹک کے وہ دوسرے اردو قلمکار ہیں جن کے ڈرامے کتابی صورت میں زیور طباعت سے آراستہ ہورہے ہیں۔ قبل ازیں "خالی خانے" اور اندھے رشتے کے ذریعے انل ٹھکر (ہبلی) نے اردو ڈراموں کی کمی کو دور کرنے کی موثر کوشش کی ہے۔

ریون سدیا رُدر سوامی مٹھ کے دونوں ڈرامے "انوکھی شادی" اور "فقیر کی تین لکیریں" وقت، ماحول اور زندگی کی تصویر کشی میں کامیاب ہیں۔ ریون سدیا جی کے لیے ڈرامے کے فنی لوازمات سے عہدہ برا ہونا نسبتاً آسان ہے، کیوں کہ وہ نہ صرف ڈرامہ نگار بلکہ ہدایت کار اور اداکار بھی ہیں۔ کسی بھی ڈرامے میں مکالمے اور تکنیک کی اہمیت ہوتی ہے۔ ان دونوں ڈراموں میں نپے تلے مکالے ادا کیے گئے ہیں اور تکنیک تاریخی ڈراموں سے مناسبت رکھتی ہے۔ ڈراموں کی زبان بھی موضوع اور کرداروں کے لحاظ سے موزوں اور عام فہم ہے۔ ڈرامہ نویس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تاریخی واقعات قلمبند کرتے ہوئے رنگین بیانی و رانشاء پردازی سے اجتناب کرے۔ پیش نظر ڈرامے، اس خوبی سے بھی متصف ہیں۔ ان ڈراموں کا سب سے اہم وصف تاریخی واقعات کی غیر جانبدارانہ پیشکش ہے۔ آج جبکہ تاریخ کو مسخ کرنے، واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، ریون سدیا جی کے یہ دونوں ڈرامے غیر جانبدارانہ تحقیق اور صحت و صداقتِ واقعہ پر مبنی نظر آتے ہیں۔ جس کے لیے میں ڈرامہ نویس کو مبارکباد دیتا ہوں اور پر امید ہوں کہ ان ڈراموں کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

●●

(فروری 2001ء)

کنڑا اردو بودھے .... محمد جلال الدین

زبان اظہار کا موثر وسیلہ ہے۔ ایک سے زیادہ زبانوں سے واقفیت ہم کو مختلف اللسان، مختلف الخیال افراد سے قریب کرتی ہے۔ اور اس سے باہمی میل جول کے جذبے کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ہماری ریاست میں اردو مادری زبان کے طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کے علاوہ انگریزی و کنڑا زبانوں پر بھی دسترس حاصل کریں۔ انگریزی علمی زبان تو کنڑا ہماری ریاست کی سرکاری زبان ہے۔ ہمیں کنڑا نہ صرف سیکھنی ہے بلکہ اس پر عبور بھی حاصل کرنا ہوگا۔ اردو مدارس میں کنڑا پڑھانے کا جو موجودہ نظم ہے، اس پر اطمینان کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ تعلیمی حلقوں میں اردو کے ذریعے کنڑا سیکھنے اور سکھانے کے لیے ایک عرصے سے موزوں کتاب کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ مجھے یہ جان کر بے حد مسرت وطمانیت حاصل ہوئی کہ جناب محمد جلال الدین، سابق پرنسپل گورنمنٹ پری یونیورسٹی کالج گلبرگہ نے کنڑا سے نابلد افراد اور اردو طلبہ کے لیے (کنڑا اردو بودھے) مرتب فرمائی ہے، جس سے کنڑا سیکھنے میں مدد ملے گی۔ مسرت اس لیے کہ ان کا یہ اقدام اس سمت میں اولین کوشش کی حیثیت رکھتا ہے۔ طمانیت اس لیے بھی کہ وہ کنڑا زبان پر غیر معمولی دستگاہ رکھتے ہیں۔ میں نے اس کتاب کا جستہ جستہ مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کی یہ کوشش بارآور ہے اور اس کتاب کو کنڑا آموزگار کی حیثیت حاصل ہوگی۔

اردو کے ذریعے کنڑا سیکھنے وسکھانے کی کتابیں مشکل ہی سے دستیاب ہوتی ہیں۔ مصنف کی یہ کتاب اس خصوص میں مفید خدمت انجام دے سکتی ہے۔ اس کتاب میں زبان دانی کے بہت سے کارآمد نکات پیش کیے گئے ہیں۔ نیز صرف ونحو، انشاء واملا کے قاعدے اور مثالیں دی گئی ہیں۔ جس سے ہم روزمرہ کی گفتگو میں استعمال ہونے والے الفاظ فقروں، محاوروں اور جملوں سے آشنا ہوں گے۔ اس میں تلفظ کی صحیح ادائیگی کے لیے اردو الفاظ کنڑا رسم الخط میں اور کنڑا الفاظ اردو رسم الخط میں تحریر کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں اعضائے جسم، بیماریوں، ملبوس، گھریلو ساز وسامان، زیورات، اشیائے خورد ونوش، معدنیات، گھڑی کے اوقات، آلات موسیقی، حشرات الارض، پرندوں، چوپایوں، درندوں، معذوروں، درختوں، پھلوں، پھولوں، سبزیوں ہندی اور اسلامی مہینوں، دنوں، موسموں، ہندسوں اور تجارتی وکاروباری لفظوں کے متبادل کنڑا میں دیے گئے ہیں۔ اس طرح سے یہ کتاب اختصار کے باوجود جامع ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین پر میں مولف کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے پرامید ہوں کہ اردو طلبہ واساتذہ اور کنڑا سیکھنے کے خواہشمند اس سے استفادہ کریں گے۔ ●●

(جنوری 2002ء)

کنڑا اُردو کائی دیپ

لعل محمد استاد

یہ خوش آئند امر ہے کہ ان دنوں ہماری ریاست کی لسانی اقلیتوں کو علاقائی زبان کی ضرورت و اہمیت اور اس کی کارفرمائی کا احساس ہوگیا ہے۔ طلبہ، والدین اور اولیائے طلبہ اپنی مادری زبان کے علاوہ علاقائی زبان کو سیکھنے اور اس پر عبور حاصل کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔ ایک دوسرے کی زبان سے واقفیت کے بغیر مختلف الخیال وفکر کے افراد کا ایکجا ہونا ممکن نہیں ہے۔ ہندوستان جیسے کثیر اللسان ملک میں صرف مادری زبان سے آگاہی کافی نہیں ہے۔ ایک سے زیادہ زبانوں سے واقفیت ہی سے ہمارے سماجی رشتے استوار ہوسکتے ہیں اور قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہوسکتا ہے۔ ہماری ریاست میں کنڑا نہ صرف اکثریت کی زبان ہے بلکہ دفتری زبان بھی ہے۔ کنڑا سے عدم واقفیت ترقی کی دوڑ میں سدِ راہ بن سکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے ہمارے طلبہ کنڑا سیکھیں اور اس پر عبور حاصل کریں۔ یوں بھی ان دنوں اردو کے ذریعے کنڑا سیکھنے وسکھانے والی کتابوں کی مانگ میں اضافہ ہوا ہے۔

مجھے مسرت ہے کہ جناب لعل محمد استاد، ایم۔اے (کنڑا) بی۔ایڈ جو درس وتدریس کا دیرینہ تجربہ رکھتے ہیں، اس جانب توجہ فرمائی اور طلبہ واساتذہ کی ضرورتوں کے پیش نظر ''کنڑا اردو کائی دیپ'' کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ لعل محمد صاحب کی مادری زبان اگرچہ اردو ہے مگر وہ کئی زبانیں جانتے ہیں، جن میں سنسکرت، کنڑا، مرہٹی، انگریزی اور تلگو کو خصوصیت حاصل ہے۔ وہ کنڑا زبان کے اہم قلمکار ہیں۔ کنڑا ادب میں موصوف کی ۲ کتابیں شائع ہوکر مقبول عام ہوچکی ہیں۔

زیرِ نظر ''کنڑا اردو کائی دیپ'' ایک مکمل کتاب ہے، جس میں حروف تہجی سے لے کر الفاظ، مرکبات، جملوں کی ساخت، اجزائے کلام، واحد جمع، تذکیر وتانیث، اضداد، مترادفات، صنائع بدائع اور فن عروض کے نکات بیان کیے گئے ہیں۔ نیز اعضائے جسم، اشیائے خوردنی، لباس، سامان آسائش وزیبائش کے علاوہ دنوں، مہینوں، دھاتوں، بیماریوں، پھلوں، پھولوں، ترکاریوں، پرندوں اور جانوروں سے متعلق تفصیلات دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ مکتوب نگاری، عرضی نویسی اور اسباق کے نمونے بھی مہیا کیے گئے ہیں۔ اس طرح سے ''کنڑا اردو کائی دیپ'' کنڑا سیکھنے اور سکھانے والوں کے لیے واقعی مشعل راہ ثابت ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ اردو کنڑا حلقے اس کتاب سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں گے۔ ●●

(نومبر 2002ء)

ڈھمڑی کی دُھوم

پرویز ڈھمڑی

اُردو میں طنز و مزاح کی روایت بہت قدیم و وقیع ہے۔ اُردو شاعری کے آغاز ہی سے ہمیں طنز و مزاح کے نمونے جعفر زٹلی، غالبؔ اور نظیر اکبرآبادی کے یہاں ملتے ہیں۔ البتہ اس صنف کو باقاعدہ کامل فن کا روپ دھارنے میں وقت صرف ہوا۔ اکبرالہ آبادی کی شاعری اس فن کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اکثر شعراء سے مزاح کے نام پر بوالعجبیاں سرزد ہوئی ہیں۔ تمسخر، تضحیک، فحش گوئی، پھکڑ بازی مزاح نہیں ہے۔ طنز و مزاح تو تلوار کی دھار پر چلنے کا فن ہے۔ جو ریاضت ذہانت اور ہنرمندی کا متقاضی ہے۔ برسوں خون جگر صرف کرنے والے شعرا ہی اپنے فن میں سرخرو ہو سکے ہیں۔ ویسے ظریف شعراء کی تعداد قابل لحاظ ہے مگر ایسے شعراء کم کم ہی ہیں، جنھوں نے اپنے فن سے متاثر کیا، مابعد آزادی طنز و مزاحیہ شاعری میں جن کو اعتبار حاصل ہوا ان میں سید محمد جعفری، ضمیر جعفری، مجید لاہوری، شاد عارفی، راجہ مہدی، علی خاں، فرقت کاکوروی، رضا نقوی واہی، دلاور فگار، خواہ مخواہ اور طالب خوندمیری کو خصوصیت حاصل ہے۔

اسی طرح دکنی شاعری میں نذیر دہقانی، سلیمان خطیب، گلی، اعجاز حسین کھٹا، علی میاں صائب، سرور ڈنڈا، باسط نوشہ اور حمایت اللہ کی شاعری اثر آفرینی سے معمور ہے۔ بقول پرویز ڈھمڑی:

ڈنڈا، خطیب گلی، کھٹا ہو یا کہ علی
زندہ دلاں کو ڈھمڑی بھولا نہیں زمانہ

ڈھمڑی کی دُھوم کے شاعر مستان پٹیل معروف بہ پرویز ڈھمڑی کا طنز و مزاح کے اسی مکتب سے تعلق ہے۔ پرویز ڈھمڑی شاہ آباد سمنٹ ورکس میں بہ حیثیت انجینئر کارگزار رہے۔ تاودگی ضلع گلبرگہ ان کا وطن مالوف ہے مگر ۱۹۶۲ء سے بسلسلہ ملازمت شاہ آباد ان کا وطن ثانی بن گیا ہے۔ طالب علمی کے دور ہی سے وہ سلیمان خطیبؔ مرحوم کی شخصیت و فن سے متاثر ہوئے اور ان ہی کی ہدایت کاری میں مزاحیہ ڈراموں میں حصہ لیا۔ اسی کا اثر تھا کہ ڈھمڑی مزاحیہ شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ معروف نعت گو و صوفی شاعر صابرؔ

شاہ آبادی مرحوم سے بھی انہیں شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔

پرویز دھموی کی شاعری میں زیرِ لب تبسم نہیں بلکہ قہقہے ملتے ہیں وہ طنز کی زہرناکی سے قہقہہ خیزی کو دعوت دیتے ہیں۔ ان کی یہاں شاعری محض خوش وقتی نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری کا مقصد سماجی ناانصافیوں اور ناہمواریوں پر زخمہ لگانا ہے اپنے گرد و پیش کی معاشرتی و سیاسی حالات کو انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

ان کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ سیاسی بے اعتدالیوں پر طنز کی تلخی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ سماجی مسائل پر بھی انھوں نے گہری چوٹ کی ہے:

چور خود لٹ گیا ہے تھانے میں
کوئی پولیس کو یہ خبر کر دے
آج پولیس کے گھر ہوئی چوری
کون کس کو کہاں خبر کر دے
آئے ہیں چُن کو دیش میں لیڈر نئے نئے
رہزن ہی کل بنیں گے یہ رہبر نئے نئے
بازار لگ گیا ہے سیاست کا دیش میں
بکنے لگے ہیں پھر سے یہ لیڈر نئے نئے
جنھیں دیکھ کر بھوک مٹتی تھی کل تک
وہ بچے بھی ہمنا وزن ہو کو ہیً تھیں
عجب چکر ہے شادی میں روز زیور کا چکر
کہ اب تو بیڑیاں سی ہوگئی ہیں بیٹیاں میری

دھموی کی دھوم پرویز دھموی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔ ●● (نومبر 2002ء)

فکر و نظر

ڈاکٹر جلیل تنویر

معروف افسانہ نگار جلیل تنویرؔ نے کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ سے اُردو میں پوسٹ گریجویشن کیا اور اُس کے بعد جامعہ گلبرگہ سے "پروفیسر سید محمد کی ادبی خدمات" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج ہیرے کیرور ضلع ہاویری میں بہ حیثیت سلکشن گریڈ لکچرر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

جلیل تنویرؔ نے ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "حصار" ۱۹۸۳ء میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ کی اشاعت پر انھیں کرناٹک اُردو اکادمی کا انعام بھی ملا ہے۔ جلیل تنویرؔ کو ہائی اسکول کے زمانے ہی سے کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ اہلِ خاندان نے بھی اُن کے ادبی ذوق کی آبیاری کی۔ رشید جاویدؔ (بھائی) صلاح الدین نیّر (ماموں) اور علی الدین نویدؔ (خالہ زاد) کی صحبتوں نے اُن کے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ افسانوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے سوانحی خاکے، شخصیات اور ادبیات پر مضامین بھی لکھے جو ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کے علمی و ادبی نگارشات کا سلسلہ ربع صدی پر پھیلا ہوا ہے۔

جلیل تنویرؔ جہاں بھی رہے، گلبرگہ ہو کہ شموگہ یا ہیرے کیرور، انھوں نے ٹوٹ کر زبان و ادب کی خدمت کی اور اُردو کے خدمت گذاروں اور اداروں سے اپنے آپ کو وابستہ رکھا۔ ان اداروں میں الامین ایجوکیشن سوسائٹی، فاران لائبریری جیلان آباد اور انجمن ترقی اُردو قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ہر جگہ کارکردگی اور بے لوث خدمات کی مثال قائم کی۔ جلیل تنویرؔ جہاں اپنی شرافت اور سنجیدگی، نفاست و خوش پوشی اور سرشت و شستگی سے متاثر کرتے ہیں وہیں شیریں زبانی سے مخاطب کا دل موہ لیتے ہیں۔

زیرِ نظر مجموعے "فکر و نظر" میں شامل ۲۵ مضامین پر شخصیات کا غلبہ ہے۔ جن شخصیات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اُس میں ہر شعبۂ زندگی کے نمائندے موجود ہیں۔ بزرگ، ہم عمر اور نسبتاً کم عمر بھی۔ "فکر و نظر" کے مضامین کو نوعیت کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ سوانحی و تاثراتی خاکے　　　۲۔ ادبی مضامین　　　۳۔ کتابوں پر تبصرے

رشید جاوید، عبدالرحیم آرزو اور ڈاکٹر شمیم ثریا پر لکھے گئے مضامین کا شمار سوانحی خاکوں میں ہوتا ہے۔ باقی جن ادیبوں اور شاعروں کے حالات تحریر کرتے ہوئے ان کے ادبی کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے، اُن میں زیادہ تر گلبرگہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات ہیں۔ حیدرآباد اور بیدر کے علاوہ ٹمکور، رانی بنور اور علی گڑھ سے متعلق ایک ایک شخصیت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ممتاز عثمانین پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر سید محمد کے حالات اور خدمات کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔ ادبی مضامین کے ذریعے ابوالکلام آزاد کی انشاء پردازی، اقبال کی شاعرانہ عظمت اور کنڑ ادب میں شیورام کارنت کے مرتبے کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اُردو افسانہ کی سمت و رفتار کا محاکمہ کرتے ہوئے ترقی پسند تنقید کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ شعری مجموعوں ''نوائے امکان'' (ماہر منصور) روحِ ترنم (صبیح حیدر صبیحؔ) آسمان حیران ہے۔ (رئیس الدین رئیسؔ) اور وقت کی آواز (ظہیر رانی بینوری) پر تبصرے بھی شریک ہیں۔

فکر و نظر کے مضامین سے مصنف کے تنقیدی زاویہ نگاہ اور اُن کی اصابت رائے کا پتا چلتا ہے۔ بہت سارے مضامین تعارف و تبصرے کی غرض سے تحریر کیے گئے ہیں۔ مضامین و تبصروں میں اُن کا اسلوب ستائشی و ہمدردانہ ہے۔ مصنف نے اپنے موضوعات کی صرف خوبیوں سے سروکار رکھا ہے۔ اور خامیوں سے دامن بچایا ہے۔ سوانحی اور تاثراتی خاکوں میں سوانحی مواد اور ادبی تنقید کا تناسب بڑھ گیا ہے۔ ڈاکٹر جلیل تنویرؔ واضح طور پر نام نہاد جدیدیت اور اُس کی فیشن زدگی سے نالاں نظر آتے ہیں۔ اس کا اظہار ان کے تبصروں میں ملتا ہے۔ ''نوائے امکان'' کا تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''آج کل مبہم علائم کا استعمال ایک فیشن بن گیا ہے۔ لیکن ماہرؔ منصور اس بے راہ روی سے محفوظ ہیں اور اُن کی شاعری نام نہاد 'ذات کے کرب' اور 'جنس زدگی' سے پاک ہے۔''

رئیس الدین رئیس کے مجموعے ''آسمان حیران ہے'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے۔

''جدیدیت کے نام پر بعض شعراء کے ہاں جو نام نہاد داخلیت پائی جاتی ہے۔ رئیس کے ہاں اس قسم کی فیشن زدگی نہیں پائی جاتی، انھوں نے جو کچھ اپنے اطراف دیکھا اور محسوس کیا اُسے اپنے مخصوص لب و لہجے میں شعری پیراہن عطا کیا ہے۔''

فکر و نظر کے ان مضامین میں مصنف کا انداز بیاں سیدھا سادہ مگر دلآویز ہے۔ امید ہے کہ اس کاوش کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ ●● (جون 2003ء)

آخری ساعت سے پہلے

حمید الماس

تخلیقی اظہاریت اور طرز ادا کے لحاظ سے حمید الماس کا شمار برصغیر کے نادرہ کار شعراء میں ہوتا ہے۔ بچپن میں بڑے بھائی کی تربیت اور بہ سلسلہ ملازمت حیدرآباد کے قیام نے ان کے شعری ذوق کو جلا بخشی۔ تقریباً پانچ دہے قبل انھوں نے شاعری شروع کی تو حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کا بول بالا تھا۔ ایک طرف مخدوم کی سرکردگی میں "سرخ سویرے" کے لیے تلنگانہ کی مسلح جد وجہد بام عروج پر تھی تو دوسری طرف اُدبا و شعرا یکجا ہو کر سلیمان اریب کے ماہنامے "صبا" کے ذریعے سماجی انقلاب کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔ ان قلمکاروں میں مغنی تبسم، شاہد صدیقی، اقبال متین، زبیر رضوی، عوض سعید، عزیز قیسی، وحید اختر، شاذ تمکنت اور حمید الماس کو خصوصیت حاصل تھی۔ حمید الماس کا ترقی پسند تحریک کے اعتدال پسند گروہ سے تعلق تھا۔ وہ ذہنی اور فنی طور پر شاذ تمکنت سے قریب تھے۔ ان کی پہلی غزل "شاہراہ" دہلی اور پہلی نظم "ادب لطیف" لاہور میں شائع ہوئی تھی۔

حمید الماس کے حین حیات میں ان کے پانچ شعری مجموعے "پہچان کا درد، جوئے سبز، نقش خرابی، برف شجر آواز اور رنگ تماشہ" شائع ہو چکے تھے۔ "جوئے سبز" قومی اور وطنی شاعری کا مجموعہ ہے تو "رنگ تماشہ" ثلاثیوں پر مشتمل ہے۔ زیر نظر مجموعہ "آخری ساعت سے پہلے" ان کا منتخب کلام ہے۔ جسے کرناٹک اُردو اکادمی بطور خراج عقیدت ان کی پہلی برسی کے موقع پر شائع کر رہی ہے۔ یہ انتخاب مرحوم ہی کا مُرتبہ ہے جس میں کل ۱۲۵ نظمیں شامل ہیں۔ اس انتخاب میں ۲۴ نظمیں "پہچان کا درد" ۵ "نقش خرابی" اور ۲۷ "برف شجر آواز" سے لی گئی ہیں۔ بقیہ ۶۹ نظمیں اور ۲۵ غزلیں ان کے کسی مذکورہ شعری مجموعے میں شریک نہیں۔

حمید الماس بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ حمد، نعت، سلام، مرثیہ، غزلیں، آزاد نظمیں، ہائکو اور ترائیلے نما نظمیں بھی لکھیں۔ مگر "آخری ساعت سے پہلے"

میں صرف نظمیں و غزلیں شامل ہیں۔ شاعر نے جبر و استحصال، معاشرتی انتشار و اختلال، قدروں کا زوال، احساس تنہائی، فرد کی تہی دامنی، عصری بے معنویت، شکستہ خواب اور ناکام اُمیدوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی نظموں میں معاشرتی مسائل کے علاوہ ذاتی رشتوں کا موثر اظہار ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں "صبح تخلیق' ٹی بی' لامکاں' تونہال اور واقعہ" خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ حمید الماس کی شاعری کا ایک اہم وصف احساس محرومی و نارسائی کی کسک ہے۔ ان کی نظمیں "مضمحل حوصلے' ازل تا ابد' دھندلکا' برف کی وادی، لامکاں، بن باس، آخری موڑ اور "اور بھی غم ہیں زمانے میں" اس وصف کا احاطہ کرتی ہیں۔

حمید الماس نظموں کے علاوہ اپنی غزلوں سے بھی متاثر کرتے ہیں۔ ہم عصر غزل گو شعراء میں ان کی آواز صاف پہچانی جاسکتی ہے:

نوائے شاعرانِ نو کے ہمراہ :: حمید الماس کی آواز بھی ہے

غزلوں میں انھوں نے اپنے کرب کو نہایت نرم روئی، ملائمیت اور شائستگی کے ساتھ زیرلب بیان کیا ہے۔ ان کا مرصع لب ولہجہ انھیں دوسروں سے ممیز کرتا ہے۔ اپنے کلام کی سادگی اور پرکاری کا احساس خود شاعر کو بھی ہے:

ظاہر ہے سادگی بھی الماسؔ کے سخن سے :: لیکن غزل کی فطرت پُر کار بھی رہے گی

نظم ہو کہ غزل، کلام کی اثر انگیزی اس امر کی غماز ہے کہ حمید الماس اُردو شاعری کی روایت اور کلاسیکی وراثت سے باخبر تھے۔ انھوں نے ادعائیت، وابستگی، لایعنیت ولغویت سے اپنے کو دور رکھتے ہوئے الگ راہ بنائی۔ ان کے لہجے سے آہستہ خرامی اور جمالیاتی کیفیت کی تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔

بلاشبہ یہ شعری مجموعہ (آخری ساعت سے پہلے) اُردو شاعری کی قدر و منزلت میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ امید ہے کہ خوش ذوق اور صاحب نظر قارئین اس مجموعے سے استفادہ کریں گے۔

●●

(جولائی/2003ء)

تخلیق و تحقیق .... فضل الرحمن شعلہ

ضلع گلبرگہ کا تعلقہ شاہ پور اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ تاریخ ادب اُردو میں اہمیت کا حامل ہے۔ دکنی کے مشہور صوفی شاعر محمود بحری کا تعلق گوگی (شاہ پور) سے تو جدید اسلوب کے ممتاز شاعر حمید الماس، سگر (شاہ پور) سے متعلق تھے۔ نامی گرامی شاعر حضرت چندا حسینی کوہ سوار اور ممتاز شاعر و صحافی وقار خلیل (فرزند نامی کوہ سوار) کا وطن مالوف بھی شاہ پور ہی ہے۔ آج بھی یہاں انیس صدیقی، خالد سعید، اعظم اثر اور سید فضل الرحمن شعلہ نے علم و دانش کا چراغ فروزاں رکھا ہے۔ سید فضل الرحمن شعلہ کو شاعری کے علاوہ صنف تحقیق و تنقید سے بھی شغف ہے۔ آپ کی نثری تخلیقات کا پہلا مجموعہ "نقش ہائے رنگ رنگ" (1988) میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اس میں شامل علمی و ادبی مضامین کی نوعیت زیادہ تر تحقیقی ہے۔ جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ شعلہ صاحب کو تحقیق، تلاش اور دریافت سے فطری نسبت ہے۔ زیر نظر تصنیف "تخلیق و تحقیق" کے مضامین بھی ان کے تحقیقی و تخلیقی صلاحیتوں کے غماز ہیں۔

"تخلیق و تحقیق" کے مضامین روزنامہ سیاست حیدرآباد میں شائع ہو کر موضوع بحث بنے رہے ہیں۔ ان مضامین میں لسانی، ادبی، تاریخی و تہذیبی موضوعات کے علاوہ شخصیات پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ شعلہ صاحب نے ایک دیانت دار مورخ اور محقق کی حیثیت سے مختلف موضوعات پر اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ دکنی و ہندوستانی میں فرق، دکنی زبان کے صف اول کے شعرا کی برجستہ گوئی، اشعار کا غلط انتساب اور اشعار کی تشریح پر مضامین مفید اور معلوماتی ہیں۔

اسی طرح امیر تیمور، حیدرآباد کے ہنسی رلجہ، توفیق حیدرآبادی، یگانہ چنگیزی ریختی کے شاعر بیگم جیسی شخصیات کا احاطہ موثر انداز میں کیا گیا ہے۔ تختِ طاؤس اور رودِ موسیٰ کی طغیانی سے متعلق بھی احوال شامل ہیں۔ ان موضوعات پر سید فضل الرحمن شعلہ کے علاوہ طالب حسین زیدی، مصطفیٰ شیروانی، مرزا اکبر علی بیگ، صفدر حسین صفدر، جاوید لطفی، محبوب علی خان اخگر، سید موسیٰ کاظم، غلام دستگیر، احمد محی الدین، اقبال رضا شاہ پوری، سردار الہام، منور حسین ہاشمی وغیرہ نے بھی اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ نقش ہائے رنگ رنگ کے بعد "تخلیق و تحقیق" کا اثاثہ لیے جناب فضل الرحمن شعلہ بھی ادب کے اس کارواں میں شامل ہو گئے ہیں جو زبان، ثقافت اور تاریخ کے گم شدہ اوراق کی بازیافت اور شیرازہ بندی کے ذریعہ تحقیق کو نئی جہتوں سے آشنا کر رہا ہے۔ میں اس مجموعہ کی اشاعت پر جناب فضل الرحمن شعلہ کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں ان کی اس تحقیقی کاوش کو ادبی حلقوں میں سراہا جائے گا۔ ●●

(اپریل 2004ء)

مہرباں کیسے کیسے

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

''مہربان کیسے کیسے'' مہارانیز کالج (بنگلور) کی اُردو لکچرر محترمہ فوزیہ چودھری کے خاکوں کا مجموعہ ہے جو کرناٹک اُردو اکادمی کی اعانت سے شائع ہورہا ہے۔فوزیہ چودھری کو زمانہ طالب علمی ہی سے زبان وادب سے شغف رہا ہے۔ادبی ذوق انھیں ورثہ میں ملا۔والدہ محترمہ کے علاوہ نانا عبدالحیٔ دبیر کو بھی اُردو وفارسی ادبیات سے خصوصی دلچسپی تھی۔اُردو کے معروف شاعر جناب اعجاز تماپوری اور ممتاز زبان داں نجم الثاقب شحنہ بھی اُن کے وہ قریبی رشتہ دار تھے جنھوں نے ادبی سفر کے آغاز میں فوزیہ کی حوصلہ افزائی کی ۔انھیں اپنی ادبی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کا موقع اس وقت ملا جبکہ وہ جامعہ گلبرگہ سے اُردو میں ایم۔اے کررہی تھیں۔اُسی جامعہ سے انھوں نے ''بچوں کا ادب'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ان کے ادبی شوق کو جلا بخشنے میں اربابِ شعبہ اُردو جامعہ گلبرگہ کے علاوہ ممتاز شعرا جناب تنہاؔ تماپوری اور جناب خمارؔ قریشی کا بھی اہم رول رہا ہے۔فوزیہ نے گلبرگہ کے جواں سال قلمکاروں کی انجمن ''شبستان اُردو'' کی صدارت کے فرائض انجام دیے اور گلبرگہ سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ''استعارہ واسلوب'' کی مجلس ادارت سے بھی وابستہ رہیں۔

فوزیہ چودھری نے اپنے ادبی کیریر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔شعر گوئی کے تجربے کیے۔بالآخر خاکہ نگاری کو اپنایا۔خاکہ نگاری ایک ایسا فن ہے جو ریاضت چاہتا ہے۔خاکہ نہ تو سوانح ہوتا ہے اور نہ ہی تذکرہ بلکہ تاثرات،احساسات اور واقعات کی مدد سے کھینچی جانے والی وہ لفظی تصویر ہے جو جیتی جاگتی،بولتی چالتی اور چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔شخصیت کی عکاسی میں سراپا نگاری (حلیہ نگاری) کو بھی خصوصیت حاصل ہے۔خاکہ نگار اس کے ذریعے کم سے کم الفاظ میں موضوع کی جسامت،قد وقامت، رنگ،لباس اور وضع قطع کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ساری شخصیت نمایاں ہوجاتی ہے۔فوزیہ نے صرف چند خاکوں میں سراپا نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

☆ ''کالا رنگ، گول چہرہ، گنجا سر، موٹے ہونٹ، سگریٹ ہاتھ میں جلتا ہوا، آنکھوں پر نازک فریم کا چشمہ چڑھائے، سفاری سوٹ اور ہوائی چپل پہنے، ذرا جھک کر سامنے کی طرف جلدی جلدی چلنے والا شخص''

☆ ''کھڑا چہرہ، ستواں ناک، گورا سرخی مائل رنگ، کھچڑی بالوں والا، گھر کے اندر کالا چشمہ چڑھائے، کرتا پاجامہ پہنے ایک سوالیہ نشان کھڑا تھا''۔

☆ ''بے وزن شخصیت کے مالک، کاندھوں پر چہرہ لیے، چہرے پر ناک، ناک پر چشمہ اور چشمہ سے اوپر پیشانی ہے، دانت کچھ ابھرے ہوئے، مجموعی اعتبار سے چہرے مہرے سے اُردو کا افسانہ نگار لگتے ہیں۔

مندرجہ بالا عبارتوں سے بآسانی امتیاز کیا جا سکتا ہے کہ ان میں خمار قریشی اور محمود ایاز کون ہیں اور یوسف عارفی کون؟

فوزیہ چودھری نے واقعات نگاری کا بھی سہارا لیا ہے، کہیں اہم واقعات تو کہیں چھوٹی چھوٹی باتوں اور مکالمات کے ذریعے شخصیت کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ فوزیہ اپنے حلقۂ احباب میں نٹ کھٹ اور منہ پھٹ مشہور ہیں۔ اپنی اسی افتادِ طبع کو انھوں نے خاکہ نگاری میں بروئے کار لایا ہے۔ عموماً انھوں نے موضوع کی خوبیوں اور خامیوں کا بلاکم وکاست احاطہ کیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ''محمود ایاز'' اور ''م۔ ن۔ سعید'' کے خاکوں میں اُن کا قلم بلا روک ٹوک حقیقت کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ خاکہ نگار نے بعض خاکوں کے آغاز ہی میں موضوع کے کسی ایک خاص وصف کے ذکر سے اس کی شخصیت کو نمایاں کیا ہے۔ جیسے اثر تھکر کے فرزند کی شادی کے واقعہ سے ان کی اُردو دوستی کو ممیز کیا گیا ہے۔ اسی طرح اعجاز تماپوری کے خاکے کی ابتدائی سطور سے ان کے درویش پیکر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ دیگر خاکوں کے بین السطور میں بھی بعض ایسے چونکا دینے والے جملے مل جاتے ہیں جن سے شخصیت کی پہچان میں مدد ملتی ہے۔ م۔ ن۔ سعید کے خاکے میں ذیل کا جملہ توجہ چاہتا ہے۔

''لکھنو میں ایسے اور دیر یے تھے، بنگلور میں ''سعیدیوں'' کا بول بالا ہے۔'' اسی طرح یوسف عارفی کے خاکے سے لیے گئے اس جملے سے افسانہ پڑھنے کی ادا کے ساتھ افسانہ نگار کی طویل قامتی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ''نیچی نظریں کیے اپنے آپ میں کھوئے ہوئے افسانہ پڑھنے میں اتنے مصروف ہو جاتے ہیں کہ سامعین کو افسانہ کم سنائی دیتا ہے اور افسانہ نگار زیادہ دکھائی دیتا ہے۔''

خاکہ نگار نے شگفتہ اسلوب، وحدتِ تاثر اور جزیات نگاری کے ذریعے خاکوں میں جان ڈال دی ہے۔ اعجاز تماپوری، خمار قریشی، محمود ایاز اور انل ٹھکر اس مجموعے کے کامیاب خاکے ہیں۔ دیگر خاکوں کے تیور بھی کچھ اس طرح کے ہیں کہ قاری کی دلچسپی باقی رہتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے بعض خاکوں میں تبصرے و تنقید کا تناسب بڑھ گیا ہے۔ جیسے ''تنہا تماپوری'' پڑھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ ان کے شعری مجموعے ''چھلنی چھلنی سائباں'' پر تبصرہ کر رہی ہیں۔ مگر اس تبصرہ نما خاکے میں انھوں نے شاعر ہی کے اشعار کی مدد سے شخصیت کے اوصاف کو اُجاگر کیا ہے۔ مشتاق سعید اور یوسف عارفی کے خاکوں میں بھی شخصیت سے زیادہ فن افسانہ نگاری کے محاسن گنائے گئے ہیں۔

من حیث المجموع، فوزیہ چودھری، فن خاکہ نگاری سے طبعی مناسبت رکھتی ہیں۔ میں ان کی اس اولین تصنیف ''مہرباں کیسے کیسے'' کا خیر مقدم کرتے ہوئے پُر اُمید ہوں کہ ادبی حلقے اس کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے۔

●●

(جون 2004ء)

آتشِ شوق

اسماعیل بدر

''آتشِ شوق'' کے خالق اسماعیل بدرؔ گلبرگہ کے متوطن ہیں۔ وہ تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد گئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ گلبرگہ سے انٹرمیڈیٹ کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے، ایل ایل بی کی تکمیل کی۔ وہ اے جی آفس اور محکمہ پی اینڈ ٹی حیدرآباد میں آڈیٹر کے فرائض انجام دے کر اکتوبر ۱۹۸۶ء میں وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

اسماعیل بدرؔ گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج میں میرے ہم جماعت ہونے کے علاوہ ہم محلّہ بھی تھے۔ گلبرگہ کالج کے دور میں ہمارا زیادہ تر وقت ساتھ گزرا۔ اُن دنوں ادبی حلقوں میں تعارف اور رونمائی کے لیے ضروری سمجھا جاتا کہ شعر گوئی کے بغیر ایک عدد لاحقہ نام کا جزو بنالیں۔ اس سلسلے میں راقم کے علاوہ اسماعیل بدرؔ، غلام حسین ساحلؔ، قادر جاویدؔ، اسمٰعیل نقیبؔ، امیر علی ناسخؔ اور دیگر احباب کے اسما نمایاں ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جنھوں نے شعر کہے بغیر نثر نگاری کو اپنایا اور بعض سینئر ہم عصروں نے کسی قدر تاخیر سے شعر کہنا شروع کیا اور بعد ازاں اپنے شعری مجموعے شائع کیے۔ اس ضمن میں عبدالقادر ادیبؔ اور عبدالرحیم آرزوؔ کو خصوصیت حاصل ہے۔ اسماعیل بدرؔ کا معاملہ سب سے جداگانہ رہا۔ انھوں نے ایک عرصے تک شعر گوئی کی اپنی فطری استعداد کو چھپائے رکھا اور ملازمت کے اختتام پر جب انھیں فرصت ملی تو شعر کہنا شروع کیا دورانِ ملازمت شعر کہے بھی ہوں گے تو اشاعت کی جانب توجہ نہیں دی۔

طالب علمی کے دور سے ہی بدرؔ صاحب کو ادب سے دلچسپی تھی سقوطِ حیدرآباد سے قبل بھی وہ گلبرگہ کلب کی سرگرمیوں سے متاثر تھے۔ ہمیشہ منتخب ادبی کتب و رسائل کے متلاشی رہتے تھے۔ کتابیں خرید کر پڑھنا ان کا مشغلہ تھا۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں نادر کتابوں کا ذخیرہ تھا حلقہ احباب نے مومن پورہ گلبرگہ میں ایک بزم ادب قائم کی تھی۔ حکیم عطاءاللہ انصاری کا دولت کدہ (روبرو بی بی مسجد) ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ حکیم صاحب کے صاحبزادے افتخار اللہ انصاری انٹرمیڈیٹ کالج میں ہمارے ساتھ تھے۔ افتخار

انصاری کے علاوہ ان کے دیگر برادران بشمول خلیل اللہ انصاری کو بھی ادب سے لگاؤ تھا۔ ہمارے ایک اور مشترک دوست اور ہم جماعت عظمت اللہ خاں بھی اس بزم کے سرگرم رُکن تھے۔ ہماری اس بزم کی ماہانہ محفلوں میں سلیمان خطیبؔ، شوؔر عابدی، محمود آغوشؔ، ارمان فاروقی اور سحؔر قادری کے علاوہ نومشق اُدباء وشُعراء شریک ہوتے۔ ان میں اُبھرتے ہوئے شاعر عزیز الدین عزیزؔ بھی تھے جو بعد میں پاکستان منتقل ہو گئے۔ بزم ادب نے ''گلبرگہ کلب'' کی ادبی فضا کا احیا کیا۔ ''گلبرگہ کلب'' کے اہم ارکان ابراہیم جلیسؔ، فضل گلبر گوی، نیازؔ گلبر گوی اور عثمان صحرائی پاکستان جا چکے تھے مگر سلیمان خطیبؔ، شوؔر عابدی اور حسن خاں مُجی جیسے تاسیسی ارکان ہماری رہنمائی کرتے رہے۔ ان سرگرمیوں نے اسماعیل بدؔر کی فطری ادبی صلاحیتوں کو نہ صرف مہمیز کیا بلکہ زِندہ رکھا۔ انھوں نے اشاعت وتشہیر کا سامان کیے بغیر شعر گوئی کے مشغلہ کو جاری رکھا۔ مُلازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کی شعر گوئی کی رفتار میں اضافہ ہوا ہے غزلیں کہتے ہیں۔ ''رباعیات اور قطعات بھی۔ ان دنوں اُن کا کلام ادبی رسائل اور روزناموں کے ادبی ایڈیشنوں میں شائع ہو رہا ہے۔

''آتشِ شوق'' قطعات پر مبنی اسماعیل بدؔر کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ انھوں نے ایک طویل خاموشی کے بعد اپنے تجربات واحساسات کو قطعات کی شکل میں ڈھالا ہے۔ اُن کے یہ قطعات پہلو دار اور دلکش ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت سے ادب کے تئیں شاعر کے ''آتشِ شوق'' میں مزید اضافہ ہوگا۔

●●

(فروری 2005ء)

پہلا قدم

سہیلؔ نظام

ڈاکٹر سید نظام الدین ملک شاہ بُدیُدی سے بہت کم لوگ واقف ہیں مگر ان کا قلمی نام زبان زد خاص وعام ہے۔ سہیل نظام ایک سیدھے سادے مگر فعال و سرگرم شخصیت کا نام ہے۔ وہ کئی ادبی، سماجی، و ثقافتی تنظیموں سے متعلق رہے ہیں اور آج بھی یہ وابستگی برقرار ہے۔ سہیل نظام، سوتھ انڈیا اُردو اکادمی شاخ ہبلی کے معتمد، محکمہ یوتھ سروس و اسپورٹس بلگام ڈویژن کے اسٹوڈنٹس ویلفیر آفیسر، "بزم اُردو" انجمن پری یونیورسٹی کالج کے صدر نشین اور انجمن اسلام ہبلی کی اکزیکیوٹیو کونسل کے رُکن کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ۲۰۰۱ء تا ۲۰۰۴ء جبکہ احقر کو کرناٹک اُردو اکادمی کی صدارت تفویض کی گئی تھی، سہیل نظام اکادمی کے رکن تھے۔ انھوں نے اکادمی کی سہ سالہ میعاد کے دوران مفوضہ فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ آج بھی وہ "اردو مرکز" ہبلی کے صدر کی حیثیت سے زبان وادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

سہیل نظام نے کرناٹک یونیورسٹی سے اردو ادبیات میں پوسٹ گریجویشن کے بعد کُمپو یونیورسٹی شموگہ سے ڈاکٹریٹ کیا۔ ان کی تحقیق کا موضوع تھا "ممبئی کرناٹک کے ادباء شعرا (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء)" یہ مقالہ انھوں نے جناب ایس یم عقیل صدر شعبۂ اردو کُمپو یونیورسٹی کی نگرانی میں قلمبند کیا۔ وہ گذشتہ ۳۳ ربرسوں سے درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور ان دنوں وہ انجمن پری یونیورسٹی کالج دھارواڑ میں اردو کے لیکچرر ہیں۔ شعر گوئی کا شغف انھیں طالب علمی کے دور ہی سے تھا۔ وہ طویل عرصے سے شعر کہہ رہے ہیں۔ تخلص کبھی "نظامؔ" تو کبھی "سہیلؔ" استعمال کرتے ہیں۔ روزنامہ سالار و سیاست کے ادبی ایڈیشنوں کے علاوہ آج کل، جواز، تحریک، سطور، رگ سنگ، مورچہ، مجل، آبگینہ جیسے موقر رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو دھارواڑ اور گلبرگہ سے ان کی نظموں وغزلوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر ان کے مضامین بھی نشر ہوتے ہیں۔ انھیں ریاست اور ریاست کے باہر کئی مشاعروں میں شرکت کا اعزاز حاصل ہے۔

''پہلا قدم'' ان کا اولین شعری مجموعہ ہے جس میں ان کی غزلیں شامل ہیں۔ غزل سہیل نظام کی پسندیدہ صنف ہے وہ اسے جذبات کے اظہار کا موثر ذریعہ سمجھتے ہیں:

یہ فقط جذبات کا اظہار ہے :: اس لیے مجھ کو غزل سے پیار ہے

سہیل نظام نے غزلوں میں روایتی مضامین کے علاوہ اپنے احساسات، تجربات کو زبان دی ہے۔ چوں کہ تغزل کی بنیاد لطیف جذبات پر قائم ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنی غزلوں کو رکاکت و ابتذال سے بھی بچائے رکھا ہے۔ تخلیقِ فن، شاعر سے نہ صرف ریاضت کا طلبگار ہے بلکہ وہ سوچ کا نیا انداز بھی مانگے ہے۔ وہ اپنا خون جلا کر فن کو جلا بخشتا ہے۔ سہیل نظام اس احساس سے مبرا نہیں۔ ملاحظہ ہو:

شعر و سخن کی بزم میں اکثر اے دوستو :: ہم نے جگر کا خون جلا کر غزل کہی

اشعار میں رنگینی لانے کے لیے یارو :: مانگے ہے سخن مجھ سے اب خونِ جگر تازہ

بڑے اچھوتے خیالات و ہ پرویا ہے :: غزل کو ہم نے نئے رنگ میں سمویا ہے

شاعر اپنے احساسات کو تشبیہات، استعارات، تلمیحات و کنایات کے ذریعے پیش کرنے پر بھی قادر ہے۔ مختلف صنعتوں کے استعمال سے اس کی شاعری کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

آیا خیال مل کے بچھڑنے کا جب کبھی :: پلکوں پہ تارے ہم نے سجا کر غزل کہی

دن غم زندگی میں کتنا ہے :: رات ناگن کی طرح ڈستی ہے

فرعون جس کے خوف سے مرتا تھا رات دن :: وہ طفلِ شیر خوار تو اس کے ہی گھر میں تھا

تم نے زلفوں کو رُخ پہ یوں ڈالا :: چاند آدھا گھٹا سا لگتا ہے

سہیل نظام کی غزلوں میں روزمرہ کی صفائی، ضرب الامثال و محاورات کی برجستگی لطف دیتی ہے:

جیسا بوؤگے ویسا ہی تو کاٹو گے :: نفرتوں کے بدلے میں چاہتیں نہیں ملتیں

دُنیا کی ہے ریت نرالی کبھی ہنسائے کبھی رُلائے :: پل میں تولہ پل میں ماشہ اس کو کوئی سمجھ نہ پائے

آج یہ اپنی حالت ہے :: جل گئی رسی رہ گیا بل

آڑے وقتوں میں کام آتا ہے :: گو کہ تنکا ذرا سا لگتا ہے

آگئی کشتی کنارے پر مری :: اور تلاطم ہاتھ ملتا رہ گیا

سہیل نظام کی غزل گوئی کا ایک خاص وصف جو انھیں اپنے ہم عصروں سے ممیز کرتا ہے وہ ان کی سہل پسندی ہے۔ شاعر اشکال اور اوق پسندی سے گریز کرتا ہوا سہل نگاری سے کام لیتا ہے۔ عام فہم زبان میں کہے گئے ان کے یہ اشعار حسن کلام اور بلاغت کا نمونہ ہیں:

دیواروں پر رقص کرے ہے ویرانی — آنگن آنگن جاگ رہا ہے سناٹا

میری باتیں کہکشاں ہو جائیں گی — آپ پر جب یہ عیاں ہو جائیں گی

دو قدم پر ہی یہ ہوا معلوم — حادثے بھی سفر میں رہتے ہیں

کبھی تو ابر کو صحرا پہ بھی برسنا تھا — ستم ظریفی ہے دریا پہ جاکے برسا ہے

شاعر سماجی وسیاسی مسائل سے بے بہرہ نہیں وہ سماج میں رہتے ہوئے جو کچھ محسوس کرتا ہے اس کی شعوری عکاسی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ عید کی نوید مسرت ہو کہ رویت ہلال، وہ اپنے ماحول سے بے خبر نہیں:

ہم سے ساری بستی والے پوچھ رہے ہیں، دیکھا چاند
گھر میں فاقہ ہو تو بھائی کیسی خوشیاں کیسا چاند

ہم ادھر عید منانے میں ہیں مصروف، اُدھر
دیدۂ نم کوئی معصوم ، قبا مانگے ہے

فسادات نہ صرف ہمارے ملک کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہیں بلکہ گجرات کی نسل کشی جیسے واقعات سے اقوام عالم میں ہندوستان کا وقار کافی متاثر ہو گیا ہے۔ شاعر نے بھی اس احساس کی ترجمانی کی ہے:

انسانیت کا خون خرابا نگر میں تھا — منظر لہو لہان سا مری نظر میں تھا

شر پسندوں کی لگائی آگ میں — رشکِ جنت گلستاں جلتا رہا

بے گنہ کو دار پر کھینچا گیا — اور مجرم شہر میں پھرتا رہا

غالبؔ نے کہا تھا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

سہیل نظام نے اسی مضمون کو اپنے رنگ میں باندھا ہے:

روک لو ان خواہشوں کو ورنہ یہ

بڑھتے بڑھتے آسماں ہو جائیں گی

عہد حاضر کی سیاست میں غیر سماجی عناصر مہذب افراد کے داخلے نے اس کی شفافیت کو متاثر کیا ہے۔ شاعر اس طرح کی ناپاک سیاست پر بھی زخمہ لگایا ہے:

رہزنوں میں جو گنے جاتے تھے کل

رہبروں میں آج ان کا نام ہے

نزاکت خیال، اسلوب بیان اور سادگی اظہار کے باعث بھی سہیل نظام کے اشعار گہرا تاثر چھوڑتے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے میرے اس ادعا کی تصدیق ہوگی:

خوشی کی راہ میں دو ہی قدم چلے تھے مگر

غموں نے مل کے یہ پوچھا مزاج کیسا ہے

یہ احترام زمیں کا نہیں تو پھر کیا ہے

فلک ازل سے زمیں پر جھکا جھکا ہے میاں

''پہلا قدم'' سہیل نظام کا اولین شعری مجموعہ ہے جس کی اشاعت پر میں انھیں مبارکباد دیتا ہوں اور پُر اُمید ہوں کے ان کے کلام کا اگلا قدم بہت سنبھلا ہوا، سلجھا ہوا اور پائیدار ہوگا۔ مجھے ان کے دوسرے مجموعے کا انتظار ہے۔

●●

(فروری،2006ء)

ندائے دل

سعید عارف

نام محمد سعید احمد اور تخلیقی عارفؔ ہے۔ مگر ادبی حلقوں میں سعید عارفؔ کے قلمی نام سے معروف ہیں۔ سعید عارفؔ کا وطنِ مالوف گنجوٹی ضلع عثمان آباد (مہاراشٹرا) ہے۔ جہاں وہ ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ سقوطِ حیدرآباد کے بعد ملازمت کے سلسلے میں اورنگ آباد اور ہٹی گولڈ مائنز میں چند سال گزارے بالآخر گلبرگہ ہی سے کے۔ایس۔آر۔ٹی۔سی کی ملازمت سے ۱۹۹۷ء میں سبکدوش ہوئے۔ اُردو زبان وادب سے شیفتگی انہیں ورثے میں ملی۔ والد بزرگوار علم وفضل سے سرفراز تھے۔ والدہ محترمہ اور ماموں اُردو اور فارسی کے دلدادہ تھے۔ خاندانی ماحول کے باعث طالب علمی کے دور ہی سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ مگر باقاعدگی کے ساتھ ۱۹۹۰ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ باضابطہ طور پر کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ ابتدا میں انھوں نے ''وجود وشہود'' کے شاعر عطا کلیانوی سے ذریعہ خط وکتابت چند غزلوں پر اصلاح لی۔ بعدازاں ممتاز شاعر جناب محبؔ کوثرؔ نے اُن کی کافی حوصلہ افزائی کی۔ اور شعر گوئی کے سلسلے میں مفید مشوروں سے نوازا۔ ان دنوں کہنہ مشق بزرگ شاعر جناب صبیح حیدر صبیحؔ کی رہنمائی میں مشقِ سخن جاری ہے۔ اورنگ آباد اور گلبرگہ کے شعری وادبی ماحول کے باعث ان کی شاعری کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ ''گلشن صحرا'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔ زیرِ نظر مجموعہ ''ندائے دل'' ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔

حالات کی شکست وریخت' انسانی اقدار کی پامالی' سماج کی بے راہ روی کے علاوہ قومی یکجہتی، ہندو مسلم اتحاد، حب الوطنی، مظلوموں وفلاکت زدوں کی غم خواری ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔ مجموعہ کلام میں ابتدا حمد، صحن کعبہ میں کہے گئے دو شعر اور پانچ نعتوں کے بعد غزلوں کا سلسلہ ہے۔

سعید عارفؔ کے پیشِ نظر اصلاح معاشرہ اور زندگی کی اعلیٰ اقدار کا تحفظ ہے۔ اس لیے ان کی شاعری ابتذال ورکاکت سے پرے پاکیزہ احساسات کی حامل ہے۔ سوز وگداز، سادگی، بے ساختگی اور سادہ

زبان کے استعمال کے باعث ان کی شاعری میں جذب واثر کا عنصر نمایاں ہے۔ انھوں نے رمزیہ اسلوب اور علامتی پیرائے سے اجتناب برتتے ہوئے اپنی راہ بنائی ہے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:

خطا اچھی ہے نہ جفا اچھی ہے — میری نظروں میں وفا اچھی ہے

آنکھ ظاہر میں ہے کھلی لیکن — میں ابھی خواب سے کہاں جاگا

خوب ہے مانگ اس کی دنیا میں — کم جو شئے دستیاب ہوتی ہے

بڑھ رہا تھا منزل کی طرف — دور مجھ سے اتنی ہی منزل ہوئی

سعید عارفؔ صنعتوں ومحاوروں کے استعمال کا ہنر جانتے ہیں۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

رخِ روشن پہ ترے تل جیسے — چاند میں داغ ہے شامل جیسے

غم میں دیتا ہے دلاسا کوئی — مل گیا کشتی کو ساحل جیسے

دشمن اپنا دوست بنے گا — بات میں مصری گھولیں ہم

مذہب پسندی، خدا شناسی، اور عشقِ محمدی ﷺ سعید عارفؔ کی شاعری کا خاص وصف ہیں۔ خدا پر ان کا ایقان غیر متزلزل ہے۔ وہ کبھی بھی عطائے خداوندی سے مایوس نظر نہیں آتے۔

بھر ہی جائے گا دامنِ مقصود

دُعا دل سے یہ چشمِ نم کرنا

حضور اکرم ﷺ سے گہری عقیدت کا ثبوت یہ ہے کہ نعتوں کے علاوہ دیگر اشعار میں بھی سیرت پاک ﷺ کا ذکر موجود ہے۔ شاعر کی آرزو کاشفِ حال ہے۔

سیرتِ پاک ﷺ ہو ذکر مرے شعروں میں

شعر گوئی میں خدایا تو مہارت دے دے

(گلشن گلشن صحرا صفحہ نمبر ۲۷)

شاعر جب وطن کے حالات پر نظر ڈالتا ہے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔ اسے بھائی، بھائی کا دشمن اور آدم، آدم کا شکاری نظر آتا ہے۔ یہ نظارہ اُسے حیرت میں ڈالتا ہے۔ اور وہ سوال کناں ہے:

یہ کیسا زمانہ ہے ہر ایک کے دل میں
تعصب کے شعلے بھڑکنے لگے ہیں

شاعر چاہتا ہے کہ تعصب کی اس آگ پر قابو پانے کے لیے جستجو کی جائے:

جلتی ہوئی دلوں میں تعصب کی آگ کو
کیا اپنی جستجو سے بُجھایا نہ جائے گا

چنانچہ وہ اس آتش کو فرو کرنے کا سامان بھی کرتا ہے:

ہر ایک سے جہاں میں محبت کی بات کر — نفرت کی بات کر نہ عداوت کی بات کر
امن کی راہ زمانے کو دکھادی جائے — آگ نفرت کی لگی ہے جو بجھادی جائے
اب مئے حُبِ وطن سب کو پلا دی جائے — یہی پیغام ہے عارفؔ کا زمانے کے لیے

حب الوطنی کے تقاضے سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک نظم "بھارت دیس" لکھی۔ جو اس مجموعے کے آخر میں شامل ہے۔ "ندائے دل" میں قطعات بھی شامل ہیں۔ ان قطعات میں بھی قومی یکتا اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں اشعار مل جائیں گے ایک قطعہ پیش ہے:

بات ہندو نہ مسلمان کی ہے
اب ضرورت یہاں انسان کی ہے
ہم زمانے میں رہیں مل جل کر
یہی آواز ہندوستان کی ہے

شاعر کو دنیوی زندگی کی پروانہیں ہے۔ وہ منزل مقصود کی جانب بے نیازانہ گذر جاتا ہے۔

چند روزہ زندگی کی کریں فکر کس لیے
ہم کو جہاں میں رہنا ہے مہمان کی طرح

اپنے بیٹے کی جواں مرگی پر انھوں نے غزل کی ہیئت میں جو مرثیہ لکھا ہے۔ وہ نہایت متاثر کن ہے:

عجیب ہوک سی اٹھتی ہے ماں کے سینے میں
جو یاد آئے محبت جواں بیٹے کی

رُلائے ہر گھڑی عارفؔ کو خون کے آنسو

یہ بوڑھے کاندھوں پہ میت جوان بیٹے کی

اچانک ان پرغم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور انہیں محسوس ہوا:

گلشن جو یہ ہرا بھرا تھا

صحرا صحرا ہونے لگا ہے

مگر انھوں نے توازن قائم رکھا۔ اپنے قدموں کو ڈگمگانے سے بچائے رکھا۔ نہایت فرض شناسی کے ساتھ وہ قلم کے ذریعہ حقیقت کی پردہ دری میں مصروف ہیں:

فرض اپنا تو ہے یہی عارفؔ

جو حقیقت ہے وہ رقم کرنا

مجھے اُمید ہے کہ وہ اپنے مشاہدات واحساسات کی روشنی میں جو کچھ رقم کریں گے وہ اُن کے دل کی ترجمانی ہوگی۔ اس طرح وہ "شاعرِ صدائے دل" کہلانے میں حق بجانب ہونگے۔

●●

(2006ء)

ابھی سفر میں ہوں

سلیم کیفی مرادآبادی

سلیم کیفی مرادآبادی کا شعری مجموعہ ''ابھی سفر میں ہوں'' پیش نظر ہے۔ سلیم صاحب اکثر سفر میں رہتے ہیں۔ سفر ان کی کمزوری ہی نہیں ضرورت بھی ہے انھوں نے ہندوستان کی تقریباً تمام ریاستوں کی خاک چھانی ہے اور دورانِ سفر انسانی سماج کو مختلف زاویوں اور رویوں سے دیکھا ہے۔ شاعر کا یہ سفر تجربات و مشاہدات سے ہم رشتہ ہو کر نہ صرف تخلیقی فضا میں سانس لے رہا ہے بلکہ زندگی کا ایک بلیغ استعارہ بن گیا ہے ان کے محسوسات شعر سے پتا چلتا ہے کہ ابتدائے سفر میں انھیں کچھ پریشانی بھی ہوئی:

راہ نادیدہ ، اکیلا رہ گذر نا آشنا
منزلیں بکھری ہوئیں اور میں سفر نا آشنا

لہو لہو کیے دیتا ہے راستوں کا سفر
قیام کے لیے کچھ تو اساس دے مجھ کو

ہم آسماں کو اوڑھ کے گرم سفر رہے
منزل قریب آئی تو گم گشتگی ملی

درماندگی ملی کبھی آوارگی ملی
گھر کی تلاش میں تھے مگر بے گھری ملی

رفتہ رفتہ منزل کی تلاش اور عزم سفر نے حوصلہ دیا۔ انھیں تیرہ شبی میں بھی صبح کے آثار دکھائی دینے لگے:

منزلیں میری دسترس میں ہیں
فاصلوں کو غلام لکھتا ہوں

گو دور تلک صبح کے آثار نہیں ہیں
امید سحر پھر بھی نمودار بہت ہے

سلیم کیفی نے کسی مخصوص فکر یا تحریک کے زیر اثر شعر نہیں کہے بلکہ وہ ایک فطری شاعر ہیں جن کے ہاں خارجیت سے زیادہ داخلیت کارفرما ہے ان کے کلام میں کلاسیکی اثرات کے علاوہ احساس عصر بھی نمایاں ہے ذیل کے اشعار نئے لب و لہجے کی نشاندہی کرتے ہیں:

بے شمار چہروں کی اتنی بھیڑ میں آخر
کسی کو مبتلائے غم کسی کو ماورا دیکھوں

کس طرح زندہ رہوں بے چہرگی کے دور میں
جب میری پہچان میرے ہم نفس نے روک لی

ایک چہرے میں کئی چہرے نظر آئے تو پھر
گھٹ کے صناعی بھی دستِ شیشہ گر میں رہ گئی

کربِ شدید روح کی پہنائیوں میں تھا
اک شورِ بے صدا مری تنہائیوں میں تھا

سلیم کیفی نے عدم مساوات اور معاشرتی ناہمواریوں کا بھی صحیح نقشہ کھینچا ہے:

چاندنی میں نہاتے تھے جو خوش بدن
وقت کی دھوپ میں کتنے بے آب ہیں

پھولوں کی شاخ بن گئی تلوار دیکھنا
اب ظلمِ بے حساب کے آثار دیکھنا

اچھے شعر کی علامت یہ بھی ہے کہ اس کو پڑھتے ہوئے کسی اور شاعر کا اسی معنی و مفہوم میں کوئی شعر یاد آ جائے۔ سلیم صاحب کا یہ شعر جب میری نظر سے گزرا:

کون راہ بھولے گا کس کا راستہ دیکھوں
پھر بھی میں درِ دل پر اک دیا جلا دیکھوں

تو مجھے فیض کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ گیا:

نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گذر بھی نہیں

اچھے اور متاثر کن شعر سننے اور پڑھنے والوں کے حافظے میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ سلیم کیفی کے بھی بعض اشعار ایسے ہیں جو نفاست اور عمدگی کے باعث دل میں اتر جاتے ہیں۔ ذیل کے اشعار کی دلآویزی ملاحظہ فرمائیں:

شہر خوباں میں نظر آئے کبھی سنگ بکف
ساری بستی مری اس درجہ مدارات میں تھی

بلندیوں سے بلند آسمان جیسا تھا
وہ شخص راہِ طلب میں چٹان جیسا تھا

بہت سکون ملا زلف کی اسیری میں
گرفتگی کا تاثر امان جیسا تھا

سمجھ سکوں میں کسی تشنہ لب کی بے تابی
مرے خدا کبھی اتنی تو پیاس دے مجھ کو

سلیم کیفی نے اپنے مجموعہ کلام کی ابتدا ثنا (حمد) سراجا منیر (نعت) اور مناجات سے کی ہے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کی نظمیں مختصر اور پر اثر ہیں۔ ان میں حقیقت، آمد و رفت، تعارف اور زندگی کی اساس خصوصیت کی حامل ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی سلیم کیفی کی شاعری تازہ و پرکار ہے نیز گنجلک تراکیب اور غرابت لفظی سے اجتناب کے باعث اس کی اثر آفرینی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ سلیم کیفی کے اس شعری مجموعے کو ادبی حلقے بے حد پسند کریں گے۔

●●

(دسمبر 2006ء)

دکنی غزل

ڈاکٹر میمونہ بیگم

محترمہ میمونہ بیگم کی تحقیقی کاوشوں کا حاصل ''دکنی غزل، تحقیق و تجزیہ'' کا مسودہ نظر سے گزرا۔ دکنی غزل کی شعریات پر محترمہ کی گہری نظر ہے۔ انھوں نے سلاطین بہمنیہ، عادل شاہی اور قطب شاہی کی بعض دکنی شاعروں کی منتخب غزلیات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کا محاکمہ بھی کیا ہے، جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ دکنی غزل کا دامن بھی فکر و خیال کے نگینوں سے مالا مال ہے۔ ان غزلوں میں دکنی شعراء کا اپنے جذبات و احساسات کا شائستگی اظہار، دکنی زبان کی گراں مائیگی کا پتا دیتی ہے۔ ان شعراء نے تشبیہوں، استعاروں، کنائیوں، ضرب الامثال اور صنائع بدائع کے ذریعہ فکر و خیال کی جو قندیلیں روشن کی ہیں، ان سے اردو کا ایوان ادب ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔

منتخب غزلوں کے ان تجزیوں سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ مصنفہ کو دکنی زبان، اس کی لسانیات، صوتیات، لغت اور قواعد پر بھی عبور حاصل ہے۔ یہ تجزیے مصنفہ کے شعور کی بالیدگی اور ہنرمندی کے حامل و شاہد ہیں۔ ●●

(2007ء)

دکنی مثنویات

ڈاکٹر جاوید رفاعی

انجمن آرٹس اینڈ کامرس کالج بلگام (کرناٹک) کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر جاوید رفاعی جنوبی ہند کے معروف ادیب و شاعر ہیں۔ مزاج کے لحاظ سے درویش تو اطوار کے اعتبار سے صوفی صافی ہیں۔ ادب کا نہایت پاکیزہ شغف رکھتے ہیں۔ انہی کی سرکردگی میں اردو ماہنامہ ''روپ رس'' بلگام کے ادبی اُفق پر ایک عرصے تک جلوہ کناں تھا۔ جاوید رفاعی کا کلام ملک کے معیاری رسائل میں شائع ہوتا ہے۔ تحقیق کے شعبہ میں بھی انھیں درک حاصل ہے۔ ان کے نثری مضامین کا پہلا مجموعہ ''آئینہ در آئینہ'' شائع ہوکر مقبول عام ہو چکا ہے۔ کالج کے طلبہ نے جاوید رفاعی کے فن اور شخصیت پر پروجیکٹ تیار کر کے شعبہ اردو میں امتیازی نمبر حاصل کیے۔ نثری مضامین کا دوسرا مجموعہ ''دکنی مثنویات'' پیش نظر ہے۔ فاضل مصنف نے اس مجموعے کے ذریعے دکنی مثنویات کا فنی، ادبی، تہذیبی، تاریخی، سماجی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔

مثنوی اردو شاعری کی مقبول ترین صنف رہی ہے۔ جس کے ذریعے شاعری کے تمام انواع نہایت خوبی سے ادا کیے جاتے ہیں۔ جذبات انسانی ہو کہ مناظر قدرت، واقعہ نگاری ہو کہ تخیل کی قلابازی ان تمام کیلئے مثنوی سے زیادہ کوئی صنف بارآور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سحر البیان، گلزار نسیم، کدم راؤ پدم راو، قطب مشتری وغیرہ کی ادبی وقعت آج بھی قائم ہے۔

مصنف نے دکنی مثنویات کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اور ان ابواب کے ذریعے اپنے موضوع کو واشگاف کرنے کی حتی المقدور سعی کی ہے۔ دکن کے ادبی ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے دکن کی عشقیہ، رزمیہ، تمثیلی، اخلاقی و صوفیانہ مثنویوں کے نہ صرف نام گنائے ہیں بلکہ اپنے موضوعات کی کہیں تفصیل تو کہیں تلخیص پیش کی ہے۔ عشقیہ مثنویوں میں وجہی کی قطب مشتری، غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال، نصرتی کی گلشن عشق، مقیمی کی چندر بدن و مہیار، ہاشمی کی یوسف زلیخا تو رزمیہ مثنویوں میں نصرتی کی علی نامہ، رستمی کی خاور نامہ، شوقی کی فتح نامہ نظام شاہ اور اشرف کی جنگ نامہ کو امتیاز حاصل ہے۔ اسی طرح ابن

نشاطی کی پھول بن مشترکہ تہذیب کی غمازی کرتی ہے۔ مذہبی مثنویوں میں برہان الدین جانم کی ارشاد نامہ، شاہ ملک کی شریعت نامہ، ایاغی کی نجات نامہ، اور مختار کی معراج نامہ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

جاوید رفاعی نے ایک علاحدہ باب میں دکنی مثنویات کی نمایاں خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ واقعی دکنی شعراء میں غزل سے زیادہ مثنوی لکھنے کا رجحان تھا۔ دکنی مثنویات میں مقامی خصوصیات اور فطری حالات کا برملا اظہار ملتا ہے۔ ان مثنویوں میں حقیقت سے زیادہ مافوق الفطرت اور متحیر العقل واقعات کی فراوانی ملتی ہے۔ تو چند مثنویوں سے ہندوستانی تہذیب کی رنگارنگی عیاں ہوتی ہے۔ اردو مثنوی کا سفر دکن سے شمال کی طرف زیرِ نظر کتاب کا ایک اہم باب ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ دکنی مثنویوں نے شمال پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اس امر کو تقویت مصنف کے اس اظہار سے بھی ملتی ہے کہ شمالی ہند کے تذکروں میں ڈیڑھ سو کے قریب ایسے شاعروں کے نام ملتے ہیں جن کا تعلق دکن سے تھا۔ پانچویں باب میں دکنی مثنویات سے متعلق ناقدین کی آرا یکجا کی گئی ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں بیانو (۹۲) دکنی مثنویوں کی جو فہرست مع تاریخ تصنیف دی گئی ہے وہ محققین کے لیے نشان راہ ہے۔

مجموعی طور پر ''دکنی مثنویات'' دکنی ادب کے شیدائیوں اور ریسرچ اسکالرس کے لیے ایک عمدہ تحفہ ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر میں ڈاکٹر جاوید رفاعی کو مبارکباد دیتا ہوں۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

●●

(2007ء)

مجتبیٰ حسین اور گلبرگہ

احسان اللہ احمد

گلبرگہ اور مجتبیٰ حسین کا تعلق گہرا اور اٹوٹ ہے۔ مجتبیٰ کہنا چاہیں تو کہنے دیجیے کہ وہ "فردِ بے ارض یا بے زمین انسان (No Land's man)" ہیں۔ غالباً بے زمینی کے احساس کا سبب وہ عرصہ ہے جو انھوں نے آبائی وطن عثمان آباد (مہاراشٹرا) گلبرگہ (کرناٹک) حیدرآباد (آندھرا) اور دہلی میں گزارا ہے۔ مختلف جگہوں کے قیام کے باعث اُن کے چاہنے والے انھیں کبھی کرناٹکی تو کبھی حیدرآبادی تو کبھی دہلوی کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے گلبرگہ ہی کے تعلقہ چنچولی میں پہلی بار آنکھیں کھولیں، جو اُن کا ننھیال ہے۔ اسی شہر میں ۱۹۴۸ء کے آفت رساں پولس ایکشن میں اُن کے ماموں شہید ہوئے۔ مجتبیٰ نے گلبرگہ کے مڈل اسکول آصف گنج میں ہشتم تک اور بعد میں گورنمنٹ ہائی اسکول تانڈور سے میٹرک کے علاوہ گورنمنٹ کالج گلبرگہ میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔ اُن کے والد ماجد احمد حسین صاحب نے بہ حیثیت تحصیلدار اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں ایک بڑا عرصہ گلبرگہ میں گزارا۔ اُن کا دولت کدہ "اقبال منزل" گلبرگہ کے محلہ جگت میں واقع تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے مجتبیٰ نے حیدرآباد کا رُخ کیا تو اُن کا دو سال تک گلبرگہ کے طلبہ کی قائم کردہ ہاسٹل "گلبرگہ اسٹوڈنٹس" واقع کاچی گوڑہ میں قیام رہا۔ برادران مجتبیٰ محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس، عابد حسین اور یوسف حسین کی تعلیم و تربیت کا مرکز بھی گلبرگہ ہی رہا۔ ابراہیم جلیس اور یوسف حسین کی بیگمات گلبرگہ ہی سے متعلق تھیں۔ ان سب کی واحد بہن صندلی بیگم گلبرگہ کے قصبہ ہنگندہ کے زمیندار اختر میاں پٹیل سے رشتۂ ازدواج میں منسلک تھیں۔ مجتبیٰ کے ایک بھائی اکرام حسین جن کا کم سنی میں انتقال ہوا تھا، گلبرگہ میں مدفون ہیں۔ ان کے بھائی اقبال حسین (مرحوم) کے صاحبزادگان جمیل حسین، مشتاق حسین، سجاد حسین، سرفراز حسین، صادق حسین اور شوکت حسین گلبرگہ ہی میں برسرِکار ہیں۔ ان کے دو چھوٹے بھائی محمود حسین اور سرتاج حسین اب عثمان آباد میں رہتے ہیں۔

بڑی صاحبزادی راشدہ صمدانی گلبرگہ کے پی رضا ڈگری کالج میں تاریخ کی لیکچرر اور داماد غلام

صمدانی الیکٹریکل انجینئر ہیں۔ مجتبیٰ کے بڑے صاحبزادے ہادی حسین نے کے بی این انجینئرنگ کالج گلبرگہ سے سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

۱۹۶۸ء میں اُن کی تصنیف ''تکلف برطرف'' (مضامین کا مجموعہ) کی رسم اجرا کی تقریب نہایت تزک واحتشام کے ساتھ گلبرگہ کے پبلک گارڈن (محبوب گلشن) میں منعقد کی گئی تھی۔ ''قطع کلام'' (۱۹۶۹ء) کی اشاعت پر بھی تہنیتی اجلاس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہر دو تقاریب کے موقع پر گلبرگہ کے استاد شاعر سرور مرزائی مرحوم نے اپنے احساسات کا اس طرح اظہار کیا۔

مجتبیٰ اے خالقِ جام ''تکلف بر طرف''
تیرے ہر اک لفظ میں تاب وتب دُرِّ نجف
ہم تجھے اس شہر میں کہتے ہیں خوش آمدید
ہے تجھے حاصل جہاں کو چہ نوردی کا شرف

خالقِ ''قطع کلام'' آج پئے استقبال
بہمنی شہر کا ہر فرد ہوا چشم براہ
تیری تحریر میں گیرائی بھی ، گہرائی بھی
نکلی ہے زباں سے میرے بے ساختہ واہ

گلبرگہ کے سامعین کو بارہا گلبرگہ کی ادبی محفلوں میں مجتبیٰ صاحب کے پرلطف مضامین سننے کا موقع مل چکا ہے۔ گلبرگہ سے متعلق چند شخصیتوں اور احباب پر انھوں نے خاکے بھی قلمبند کیے ہیں۔ اُن کے کئی مضامین میں گلبرگہ اور گلبرگہ کی شخصیتوں کا ذکر خیر ملتا ہے۔ آستانۂ بندہ نوازؒ سے اُنھیں گہری عقیدت ہے۔ جب بھی گلبرگہ آتے ہیں سب سے پہلے بارگاہِ عالیہ پر حاضری دیتے ہیں۔ حضرت محمد محمد الحسینی صاحب مرحوم سجادہ نشین بارگاہ گیسودرازؒ سے بھی اُن کے گہرے روابط تھے۔ مجتبیٰ صاحب کی دو صاحبزادیوں اور دو صاحبزادوں کی شادیوں کا خطبۂ نکاح مرحوم سجادہ نشین قبلہ نے پڑھا تھا۔ الغرض گلبرگہ اور مجتبیٰ حسین کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اُن کی شخصی اور تہذیبی زندگی کی تعمیر میں جن شہروں کو خصوصیت حاصل ہے ان میں گلبرگہ کو اولیت حاصل ہے۔

اہل گلبرگہ، ممتاز عثمانین و مجتبیٰ حسین کے مداح جناب احسان اللہ احمد کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انھوں نے گلبرگہ اور احباب گلبرگہ سے متعلق تمام مضامین اور اقتباسات کو نہ صرف یکجا کیا بلکہ کتابی صورت میں شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ جو کام اہل گلبرگہ کو انجام دینا تھا وہ احسان اللہ احمد حیدرآبادی نے انجام دیا، اس کے لیے وہ ہم سب کی جانب سے شکریے کے مستحق ہیں۔ احسان اللہ احمد اردو زبان و ادب کی خاموش خدمت پر یقین رکھتے ہیں، گو پیشہ کے لحاظ سے وہ وٹرنری ڈاکٹر ہیں مگر اُن کا ادبی شغف بھی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ ادیب اور مترجم کی حیثیت سے بھی وہ معروف ہیں۔ اردو اور انگریزی میں اُن کی نصف درجن سے زیادہ کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ اُن کی اس تازہ ادبی پیش کش (تالیف) ''مجتبیٰ حسین اور گلبرگہ'' نے اپنے دامن میں گلبرگہ کی تاریخ، جغرافیہ، ادب و تہذیب کو اس طرح سمیٹا ہے کہ ہم مابعد آزادی کے گلبرگہ کی تہذیبی تاریخ اور ادبی منظرنامے سے روشناس ہوتے ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ ادبی حلقے اس کتاب سے استفادہ کریں گے۔

●●

جون 2008ء

آئینۂ سخن

رزاق اثر

رزاق آثر کا فن بتدریج ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اور نسیم شب، شعر و سنگ، بیاض ثناء اور زیرِ طبع آئینۂ سخن میں شامل کلام کلاسیکیت اور عصری شعور کے حسیں امتزاج سے عبارت ہے انھیں پیرایۂ اظہار پر عبور حاصل ہے اور اس حقیقت سے شاعر آشنا بھی ہے:

عجب سلیقہ آثر کو ہے شعر کہنے کا :: ہر ایک حرف معانی جدید دیتا ہے

رزاق آثر نے مشاہدہ، شعور، تجربات اور قوتِ متخیلہ کی صلاحیتوں کو حسبِ استعداد بروئے کار لایا ہے جہاں پہ قوتیں یکجا ہوئی ہیں اعلیٰ درجے کے شعروں کی تخلیق ہوئی ہے اور جہاں انھوں نے ان قوتوں سے کام نہیں لیا شعروں میں کیف آوری اور اثر انگیزی نسبتاً کم ہے۔ غزل جو شعریت، رمزیت، نشتریت کی پہچان بن گئی ہے، رزاق آثر کی پسندیدہ صنف ہے۔ ابتدا سے آج تک غزل محبوب رہی ہے اور معتوب بھی مگر اسے یہ افتخار حاصل ہے کہ کڑی مخالفت کے باوصف ہر دور میں اپنی نغمگی لطافت سادگی و پرکاری کے باعث نہ صرف زندہ رہی ہے بلکہ اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ رزاق آثر نہ صرف اچھے غزل گو ہیں بلکہ معیارِ غزل کی برقراری و بلندی کے بھی متمنی ہیں ملاحظہ ہو:

بلندی پر پہنچ کر تم بھی دیکھو :: نظر آئیں گے قد آور بھی بونے

غزل، رزاق آثر کے ہاں صنف سخن بھی ہے اور استعارہ بھی۔ ذیل کے اشعار میں ایک خوش رنگ منظر کی عکاسی لطف دیتی ہے:

توڑ کر بند قبا کس کا صبا گذری ہے

کہہ رہے ہیں اسے سب اہلِ چمن آوارہ

رزاق آثر کی غزلیں پامال مضامین سے مبرا اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں ایک ذمہ دار شہری ہونے کے ناطے شاعر اپنی ذات کے خول میں مقید نہیں رہ سکتا۔ ممتاز و مقبول شاعر و ادیب، راہب

یا جوگی نہیں ہوتے ان سب کی بڑی ذمہ داری یہی ہے کہ وقت کے تقاضوں کو سمجھیں۔ اس لیے عصری احساس کے ساتھ ساتھ سماجی تقاضے رزاق اثر کے پیش نظر ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے سلگتے ہوئے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ وہ اپنے نظریہ کا تعارف ان اشعار سے کرتے ہیں۔

بے ضمیروں کے لیے دل میں جگہ کچھ بھی نہیں
یہ الگ بات کہ اظہار نہیں کرتا میں

فہم و ادراک ہیں مری پہچان
چشمِ دانشوراں میں رہتا ہوں

ہاتھ میں پتھر لیے بیٹھے ہو کیوں
کھل گیا کیا آئینہ بازار ہے

رزاق اثر نے روایات کا احترام کرتے ہوئے ذات کی تلاش سماجی انصاف عدم مساوات، فسادات، ادب اور زندگی و تجریدی ادب جیسے موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ انھیں کبھی فرد کے حقوق کی پامالی کا احساس ستاتا ہے تو کبھی یہ قلق ہوتا ہے کہ مظلوم نہ صرف انصاف سے محروم ہے بلکہ قاتل خود منصفوں کے درمیان ہے اسی احساس کا نتیجہ یہ اشعار ہیں:

ہمارے حق میں عدالت کا فیصلہ نہ سہی
کھلا یہ راز کہ منصف بکاؤ ہے کتنا

رُکیں گے کیسے فسادات روکنے سے پھر
ہوس کو روز پیام آرہے ہیں تعریفی

گردن کسی بھی حال میں اپنی نہیں جھکی
دستار سر سے گرگئی دربار میں تو کیا

موت کا بک رہا ہے ہر ساماں
کس نے کھولی ہے یہ دُکاں آخر

ملک میں ہونے والے بم دھماکوں اور دہشت گردی کے پس منظر میں ان کی نظمیں ''سات گیارہ'' (ممبئی لوکل ٹرین بم دھماکے) اور ''مکہ مسجد کی فریاد'' سیاسی تفاوت اور عدم مساوات کی منظر کشی کرتی ہیں۔

عصری احساسات کے حامل ہونے کے باوصف انھیں تجریدیت کے زیر اثر زبان کا غیر خلاقانہ استعمال بالکل نہیں بھاتا۔ وہ ترسیل کے بغیر ادب کی افادیت کے بھی قائل نظر نہیں آتے۔

بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہونے کے باوصف مختلف موضوعات پر ان کی پابند اور آزاد نظمیں نہ صرف چونکانے والی ہیں بلکہ دعوتِ فکر بھی دیتی ہیں۔ ان کا مطالعہ و مشاہدہ گہرا ہے اور اپنے گردوپیش کے حالت سے باخبر ہیں ان کے تخیل میں بلند پروازی، طرز نگارش میں تازگی اور لہجے میں بے باکی پائی جاتی ہے۔ اس بات کا ثبوت ان کے درج ذیل اشعار اور نظمیں ہیں:

کیوں ہوا کم یک بیک ہر فاصلہ کچھ تو کہو
کس لیے ٹوٹا ہوا تھا رابطہ کچھ تو کہو

میں نے سکھلائی ہے تہذیب تمھیں دنیا کی
تم کہاں ورنہ مرے قد کے برابر ہوتے

۱۔ کچھ پرندے جہاں میں/ ابھی ایسے ہیں/ خودکشی کرتے ہیں/ خاص موسم میں ہی اجتماعی/ مگر کیوں کہ/ انساں مہذب ہیں ہم/ اس لیے خودکشی کرتے ہیں/ پانچ برسوں میں اک بار/

۲۔ کہاں تک چھپو گے/ کہاں تک بچو گے/ نگاہوں سے حق کی/
سزا اور جزا کا مقرر ہے اک دن/ فرشتے خدا کے/ برابر لکھنے میں ہیں مصروف ہردم/
پشیماں اگر ہو/ تو مانگو دعائیں/ کہ بخشش کا در تو/ خدا نے کھلا ہی رکھا ہے۔

●●

(2008ء)

گلبر گہ میں اُردو شاعری

ڈاکٹر منظور احمد دکنی

ڈاکٹر منظور احمد دکنی ادبی حلقوں کے لیے اجنبی نہیں ہیں انھیں اپنی شناخت اور پہچان کو چھپائے رکھنے سے دلچسپی تھی، اس لیے انھوں نے ابتدا میں کئی دنوں تک کبھی صاحب دکنی تو کبھی ایم۔ ایم۔ احمد کے نام سے مضامین لکھے۔ ان کے مضامین کتاب نما، خوشبو کا سفر، اردو بک ریویو، اشرفیہ، عالمی شمع، آندھرا پردیش، ہندوستانی زبان وغیرہ کے علاوہ روزنامہ منصف، روزنامہ اعتماد کے ادبی ایڈیشن اور مقامی روزناموں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

منظور احمد دکنی کے جد امجد دکنی سپاہ کے اس گروہ میں شامل تھے جس نے ۱۴ ویں صدی عیسوی میں محمد بن تغلق کی سختیوں اور مطلق العنان کے خلاف بغاوت کردی تھی۔ ان کے پردادا راجگان شورار پور کی فوج کے سپہ سالار رہ چکے ہیں۔ شاہی دربار سے خاندانی وابستگی کے باعث علم وادب سے شغف ورثہ میں ملا۔ انہوں نے ۲۰۰۰ء میں اردو میں پوسٹ گریجویشن کے بعد بھی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے ان کا تحقیقی موضوع ''گلبر گہ کی شعری تصانیف کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ (۱۹۶۰ء کے بعد)'' پر جامعہ گلبر گہ نے انھیں جنوری ۲۰۰۶ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔ ان دنوں اسی جامعہ میں بحیثیت گیسٹ لیکچرار، درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ حال میں کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور کے جزوی تعاون سے ان کی نثری تصنیف ''جزیرے'' شائع ہو چکی ہے۔ جس کے ذریعہ حیدرآباد کرناٹک کے شعراء کے فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مذکورہ تصنیف پر گلبر گہ یونیورسٹی سے راجیہ اتسوا ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے جو مضامین شائع ہوتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو ادب کی اہم صنف، تحقیق وتنقید سے گہری دلبستگی ہے۔ اس امر کی تصدیق زیر نظر تصنیف ''گلبر گہ میں اردو شاعری'' کی اشاعت سے بھی ہوتی ہے۔

''گلبر گہ میں اردو شاعری'' پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ مصنف نے گلبر گہ میں اردو شاعری کے عہد کا تعین نہیں کیا ہے اس لیے یہ تصنیف چھ سو سالہ عرصہ پر محیط گلبر گہ کی شعری تاریخ بھی ہے۔ مصنف نے

مختلف تحریکات ور حجانات کے زیر اثر نمو پذیر شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ گلبر گہ کا شعری منظر نامہ کا عمومی مطالعہ اس کتاب کا اولین باب ہے۔ اس باب کے ابتدا میں فاضل محقق نے مسعود سعد سلیمان لاہوری (۱۱۲۱۔ ۱۰۴۶) کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قرار دیا ہے جو ہنوز تحقیق طلب ہے مسعود سعد سلیمان کا ہندوی کلام دستیاب ہے۔ اردو کا اولین صاحب دیوان شاعر کہلانے کا اعزاز قلی قطب شاہ کو حاصل ہے۔ باب اول میں گلبر گہ کی تاریخ، جغرافیائی اور تہذیبی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا باب، گلبر گہ میں دکنی شاعری کا احاطہ کرتا ہے اس باب میں دکنی کے آغاز وارتقاء کی تفصیل کے علاوہ یہاں کے دکنی شعراء حضرت بندہ نوازؒ سے لے کر جدید دکنی شاعر ڈھکن رائچوری کا ذکر موجود ہے۔ آزادی کے بعد گلبر گہ کے دکنی شعراء میں حضرت سلیمان خطیب کے علاوہ پرویز دھمڑی (مجموعہ کلام: دھمڑی کی دھوم) بگڑ رائچوری (مجموعہ کلام: آم چھو املی چھو)، قبلہ گلبر گوی (سرور مرزائی) نے بھی دکنی شاعری کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا یہ باب ان بعض شعراء کے ذکر سے خالی ہے۔

منظور دکنی کا یہ ادعا ہے کہ حضرت بندہ نوازؒ کا دکنی کلام اور تصانیف سے متعلق جب تک کوئی ٹھوس تحقیقی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اس وقت تک نثر ونظم میں حضرت بندہ نواز کو اولیت حاصل رہے گی۔ مولوی عبدالحق جنہوں نے ۱۹۲۲ء میں معراج العاشقین کے حوالے سے حضرت بندہ نواز کو اولین نثر نگار قرار دیا تھا۔ ۱۹۲۲ء او ۱۹۶۶ء جب اپنے دو مضامین کے ذریعہ اپنی رائے تبدیل کرتے ہوئے لکھا ہے "دکنی یا قدیم اردو میں حضرت مخدوم کی کوئی تصنیف نہیں ہے اور یہ کہ حضرت کے فارسی وعربی رسالوں کے ترجموں کو ان سے منسوب کر دیا گیا ہے"۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل، جمیل جالبی اور ڈاکٹر حسینی شاہد جیسے معتبر محققین کی بھی یہی رائے ہے کہ دکنی اردو میں حضرت مخدوم کی کوئی تصنیف نہیں ہے اس لیے معراج العاشقین کے بجائے حضرت برہان الدین جانم کی تصنیف کلمۃ الحقائق کو بلا اشتباہ اردو نثر کی پہلی کتاب قرار دی گئی ہے۔

گلبر گہ میں روایتی شاعری زیر نظر تصنیف کا تیسرا باب ہے جس میں شعر کی اہمیت، شاعری کی ابتدا دکن وشمال ہند کی شاعری کے خدوخال اور اردو کے شعری روایت کی وضاحت کے بعد موضوعاتی لحاظ سے کلاسیکل اور ہم عصر شعراء کے اشعار کے نمونے شامل کیے گئے ہیں۔ کلاسیکل اور گلبر گہ کے ہم عصر شعرا کے اشعار علاحدہ دیے جاتے تو متقدین ومتاخرین کی شناخت میں آسانی ہوتی۔ روایتی شعراء میں صابر شاہ آبادی، رزاق اثر فضل الرحمٰن شعلہ، اعظم اثر کے نام مصنف کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔

چوتھا باب گلبر گہ میں ترقی پسند شاعری سے عبارت ہے۔ مصنف نے ترقی پسند تحریک کی تاریخ

اور اس کے اثرات کا محاکمہ کرتے ہوئے تسلیم کیا ہے کہ اس تحریک کے زیر اثر اردو شاعری میں کثیر سرمائے کا اضافہ ہوا ہے۔ گلبرگہ کے ترقی پسند شاعروں میں فضل ،نیاز ،شور ،آرزو ،ادیب ،محبؔ کوثر اور وقار ریاض شامل ہیں۔ اس فہرست میں سلیمان خطیب ،وقار خلیل اور حمید الماس کی عدم شمولیت کھٹکتی ہے۔

گلبرگہ کی جدید شاعری کا جائزہ ،پانچواں اور آخری باب ہے۔ اس باب میں جدیدیت کی ابتداء، ارتقاء، زوال اور اس کے زیر اثر نمو پانے والے شاعروں کا اسلوب ،زبان ،لفظیات اور تراکیب کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اس باب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں گلبرگہ کے جدید شعراء کے بارے میں علاحدہ پیراگراف موجود ہے جس کی مثال دوسرے ابواب میں نہیں ملتی وقار خلیل ،حمید الماس ،تنہا تماپوری ،راہی قریشی، لطیف ،جبار جمیل ،حکیم شاکر ،حامد اکمل ،خالد سعید ،بدر مہدی نصیر احمد نصیر ،فخر الدین ۔محب کوثر ،جلیل تنویر، اکرم نقاش ،حمید سہروردی ،وحید انجم ،وقار ریاض ،اور فضل افضل وغیرہ کا جدیدیت کے تحت اُبھرنے والے شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی ''گلبرگہ میں اردو شاعری'' ادب کا ایک ایسا منظر نامہ ہے جس کے مطالعہ سے قاری گلبرگہ میں اردو شاعری کی ابتداء سے موجودہ دور کی ادبی صورت حال سے آشنا ہوجاتا ہے۔ گلبرگہ آج بھی نہ صرف اردو ادب کا ہم مرکز ہے بلکہ ادب کے مختلف ادوار کے اردو شعراء کی قابلِ لحاظ تعداد گلبرگہ میں پائی جاتی ہے اور ان کے شعری مجموعے بھی دستیاب ہیں مگر کتاب میں منظر نامے سے زیادہ پس منظر پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

مصنف نے پہلے باب میں ''گلبرگہ کا شعری منظر نامہ'' کے آخر میں یہ ادعا پیش کیا ہے کہ انھوں نے گلبرگہ کے شعری منظر نامہ کا چودھویں صدی تا اکیسویں صدی کا عمومی جائزہ پیش کیا ہے۔ مصنف کا جائزہ دیگر جائزوں کی طرح اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز سے انیسویں صدی کے نصف تک گلبرگہ میں کسی شعری و ادبی سرگرمی کا پتا نہیں دیتا۔ یقین نہیں ہوتا کہ سقوط بیجاپور کے بعد عہد عالم گیری و آصفی دور میں آزادی کے ایک دہے قبل تک گلبرگہ ادبی حیثیت سے جمود کا شکار رہا ہو۔ منظور احمد دکنی اور ان کے ہم عصر محققین سے اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ گلبرگہ کی ڈیڑھ سو سالہ ادبی تاریخ پر پڑے ظلمت کے پردے کو چاک کریں گے۔ اس کتاب کی ترتیب میں مصنف نے بنیادی ماخذات اور ثانوی ماخذات کے تحت قابلِ لحاظ کتابوں کے علاوہ تحقیقی مقالات اور رسائل و جرائد سے استفادہ کیا ہے اس سے ان کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے امید یہ ہے کہ تحقیقی ذوق کے حامل افراد اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے۔ ●●

(ستمبر 2008ء)

جان ہے تو جہان ہے

ڈاکٹر ناصب قریشی

ماہر جلد و جنسیات ڈاکٹر محمد رُکن الدین معروف بہ ناصب قریشی کو میں اُن دنوں سے جانتا ہوں جبکہ وہ مڈیسن کے طالب علم تھے۔ طالب علمی کے دور ہی سے انھیں شعر گوئی سے شغف تھا۔ اُنھیں اُستاد سخن سرور مرزائی مرحوم سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔ جلد ہی وہ شعر گوئی ترک کرتے ہوئے نثر نگاری کی جانب راغب ہوئے۔ اُن کے طبی و اصلاحی مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر ناصب قریشی نے اپنے تعارف ''اپنی کہانی اپنی زبانی'' میں جن اُستاد محترم ابوالحامد صاحب کا ذکر خیر فرمایا ہے وہ سرکاری ثانوی اسکول میں میرے ہم پیشہ اور رفیق کار رہے ہیں۔ موصوف ہونہار طالب علموں کی فراخ دلانہ طور پر حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ یہ امر موجب مسرت ہے کہ ناصب قریشی نے بجا طور پر تسلیم کیا ہے کہ اُستاد محترم کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی اُن کی میڈیکل کی تعلیم کی تکمیل میں معاون ثابت ہوئی۔ طلبہ کی شخصیت کی تعمیر میں اساتذہ کا جو رول ہوتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ بلاشبہ آئندہ نسلوں کی سیرت سازی معلم ہی کے سپرد ہوتی ہے کہ مگر آج کتنے متعلمین ہیں جو اپنے اساتذہ کی تربیت و رہنمائی کا خوش دلی سے اعتراف کرتے ہیں۔ استاد محترم کے تئیں ناصب قریشی کا یہ صائب اعتراف انھیں شاگردوں کی اس صف میں جگہ دیتا ہے جنھیں 'رشید' کہا جاتا ہے۔

ناصب قریشی نے 1981ء میں ایم بی بی ایس کی تکمیل کے بعد کچھ عرصہ تک خانگی پراکٹس کی۔ بعد ازاں 1985 میں ان کا پی ایس سی کی جانب سے بہ حیثیت اسسٹنٹ سرجن تقرر عمل میں آیا۔ 1990 میں میسور میڈیکل کالج سے ڈی وی ڈی یعنی جلد و جنسی امراض کے شعبہ میں پوسٹ گریجویشن کیا۔ مختلف سرکاری اسپتالوں میں HIV اور ایڈز کے شعبے کے سربراہ رہے اور اس مہلک مرض سے متعلق پروگراموں اور لکچروں کے ذریعے عوام میں بیداری پیدا کی۔ 2005 میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو کر بی این جنرل اسپتال میں بہ حیثیت RMO خدمات انجام دے رہے ہیں۔

دورانِ ملازمت اور وظیفہ پر علاحدگی کے بعد انھوں نے مختلف امراض سے متعلق مفید مضامین سپردِ قلم کیے۔ زیرِ نظر مجموعہ 'جان ہے تو جہان ہے' ناصب قریشی کے 24 طبی مضامین پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مختلف امراض کے اسباب، علاج، احتیاطی اقدامات اور تدارک کے بارے میں معلومات افزا مضامین تحریر کیے ہیں جو ان کے وسیع مطالعے اور گہرے تجربے کا نچوڑ ہیں۔ پہلا مضمون "طبیب اعظم حضور اکرم ﷺ" کے طبیب حاذق ہونے پر شاہد و دال ہے کیوں کہ سرورِ کائنات حضور اکرم ﷺ روحانی امراض کے علاوہ جسمانی امراض کا شافی علاج فرماتے تھے۔ ویسے صحت کے لیے اسلامی اعمال طہارت، غسل، وضو، نماز، روزہ، مراقبہ اور قلت طعام، قلت کلام اور قلتِ منام آج کے سائنسی تجزیے سے بھی ہم آہنگ ہیں نیز حضور اکرم ﷺ نے مختلف امراض میں کھجور، ستو، زیتون، سرکہ، شہد، انجیر، کلونجی، سرمہ، لوبان وغیرہ سے علاج فرما کر رہنمائی کی۔ علاوہ ازیں حضور اکرم ﷺ نے بدکاریوں کو حرام قرار دے کر نت نئے جنسی امراض کے پھیلنے پر قدغن لگا دی تھی۔ "عازمِ حج طبی سہولیات اور احتیاطی اقدامات" ایک اور سودمند اور معلومات سے پُر مضمون ہے۔ چوں کہ مصنف کو دو تین دفعہ حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے اور وہ مقدس مقامات پر بہ حیثیت ڈاکٹر عازمین حج کی خدمت انجام دے چکے ہیں اس لیے یہ مضمون عازمِ حج کے لیے اپنی صحت کی برقراری کی ضمن میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں قیام اور دورانِ سفر رہنمائی کا فرض انجام دے گا۔

دیگر مضامین میں عام جلدی امراض، خون کا عطیہ، نیند کیوں رات بھر نہیں آتی، دل کی بیماری، ذیابیطس، موٹاپا، سرعت انزال، منشیات اور جذام کی روک تھام وغیرہ نہایت فیض رساں مضامین ہیں۔ ڈاکٹر صاحب دورانِ ملازمت گلبرگہ جنرل اسپتال کے شعبہ HIV اور ایڈز کے سربراہ رہے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ HIV اور ایڈز کے بارے میں 5 مضامین شاملِ کتاب ہیں۔ ایڈز جیسے مرض کی نوعیت اور اس کی ہلاکت خیزی کا باعث اس پر سیر حاصل جائزہ کی ضرورت سے انکار ممکن نہیں، لیکن ان میں سے بعض مضامین یکسانیت اور تکرار کا شکار ہو گئے ہیں۔

مجموعی طور پر کتاب میں شامل تمام مضامین کا طرزِ تحریر نہایت دل نشین ہے۔ قاری پڑھتے ہوئے اُکتاہٹ محسوس نہیں کرتا بلکہ مکمل مضمون قاری کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ مصنف نے ان مضامین میں محاروں اور اشعار کا استعمال موزونیت کے ساتھ کیا ہے۔ اشعار کا انتخاب، شعر و سخن سے مضمون نگار کے شغف

کی غمازی کرتا ہے۔ جیسے پلاسٹک سرجری کے ضمن میں یہ شعر نقل کیا گیا ہے:

تیرے چہرے پہ کسی اور کی صورت ہوگی
آئینہ دیکھنے والے تجھے حیرت ہوگی

کثرتِ شراب نوشی کے سلسلے میں جگر کا یہ شعر:

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

''نیند کیوں رات بھر نہیں آتی'' میں حامدی کشمیری اور اوج یعقوبی کے اشعار بھی متاثر کرتے ہیں:

سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پر اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

جو بدحواس ہیں پھولوں پہ سو نہیں سکتے
سکونِ دل ہو تو کانٹوں پہ نیند آتی ہے

جذام سے متعلق مضمون میں جہاں مریض کے ہاتھوں کے متاثر ہونے کا ذکر ہے وہیں مضمون نگار نے سردار جعفری کے وہ شعر نقل کیے ہیں جن میں ہاتھوں کی تعظیم وتکریم بیان کی گئی ہے۔ بہرحال مختلف مضامین میں موضوع سے متعلق موزوں اشعار قاری کی دل جمعی ولطف اندوزی کا باعث ہیں۔

''جان ہے تو جہان ہے'' مصنف کے طبی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ میں ناصب قریشی کو ان کے اس اولین مجموعے کی اشاعت پر مُبارک باد دیتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ قارئین ان مضامین سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔●●

(2009ء)

ابرِ رحمت

ڈاکٹر وحید انجم

نام محمد وحید الدین لیکن ادبی حلقوں میں وحید انجم کے نام سے معروف ہیں۔ سلسلہ نسب بہمنی سلطنت کے وزیر اعظم میر فضل اللہ انجو (خسر فیروز شاہ بہمنی) سے ملتا ہے۔ ایم اے (سیاسیات) اور ایل ایل بی کے بعد اُردو ادب میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا۔

پیشہ تدریس سے وابستہ ہوئے۔ دراز قد، کتابی چہرہ، ستواں ناک، سانولی سلونی رنگت، بشرٹ اور پتلون میں ملبوس متحرک اور سیماب صفت شخصیت جو صرف آگے بڑھنا جانتی ہے۔ نہایت پر عزم اور دھن کے پکے۔ جب کسی کام کا بیڑا اُٹھالے تو اس کو تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ انھیں ہم منصوبہ بند شخصیت کہہ سکتے ہیں۔ مزاج عاشقانہ اور مجاہدانہ بھی ہے۔ انھیں اپنی دراز قامتی اور ادبی قد کا عرفان ہے۔ اس لیے اپنے حاسدوں سے یوں مخاطب بھی ہیں:

میرے خلاف ہوتی رہیں سازشیں بہت
بونوں کو یہ جلن ہے مرا قد دراز ہے

انھوں نے نثر اور نظم میں بہت کچھ لکھا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ انھیں شاعری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری، خاکہ نگاری، مزاح نگاری اور تحقیق و تنقید نگاری سے دلچسپی ہے۔

افسانوں کا مجموعہ ''کڑی دھوپ کا سفر'' ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ دو شعری مجموعوں ''زخموں کی زباں'' ۱۹۹۸ء، ''منظر دھواں دھواں'' ۲۰۰۳ء کے خالق ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں ضلع گلبرگہ کے قلم کاروں کا انتخاب ''آفاق'' شائع کیا۔ جو گلبرگہ کے قلم کاروں کے اولین انتخاب ''افلاک'' ۲۰۰۳ء (مرتب: اکرم نقاش رڈاکٹر انیس صدیقی) میں اپنی عدم شمولیت پر احتجاج بھی ہے۔

ڈاکٹر وحید انجم کوئی ربع صدی سے شعر کہہ رہے ہیں۔ انھیں سلسلہ چشتیہ میں بیعت حاصل ہے۔ تصوف سے شغف کے باعث نعت و منقبت کہنے سے بھی دلچسپی ہے۔ ان کا تازہ نعتیہ مجموعہ ''ابرِ رحمت'' پیش نظر

ہے۔ جس میں تین حمد ایک مناجات، چالیس نعتیں اور تین منقبتیں شامل ہیں۔

نعت حضور ﷺ سے محبت و قلبی تعلق کے اظہار کا نام ہے۔ اقصائے عالم میں حضرت محمد ﷺ کی واحد ذاتِ اقدس ہے جن کا اسم پاک دنیا کے ہر حصہ میں سب سے زیادہ لوگوں کی زبان پر ہے۔ نیز حضور ﷺ کی مدح و منقبت میں مختلف زبانوں میں اشعار لکھے گئے ہیں کیوں نہ لکھے جائیں؟ جب خدا خود اپنے محبوب بندے کو "ورفعنا لک ذکرک" (ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا)۔ اور "انک لعلیٰ خلق عظیم" (بے شک اے محمدؐ آپ حسن و اخلاق کے بڑے رتبے پر ہیں) جیسے الفاظ کے ذریعے اعلیٰ مرتبے پر فائز کیا ہے۔ بلاشبہ نعت گوئی ایک پاکیزہ صنفِ سخن ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں بعض صحابہ کرامؓ نے حضور کی سیرت و اخلاق کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا آج بھی کئی شعراء نے نعت گوئی کو وسیلہ اظہار بنا کر اپنی پہچان بنائی ہے۔ مشرقی زبانوں میں عربی، فارسی، ترکی، اردو، پشتو، ہندی، سندھی، بلوچی، کشمیری اور پنجابی و دیگر زبانوں میں نعتِ رسول ﷺ کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ نعت گوئی آسان بھی ہے اور مشکل بھی اس صنف میں جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہے۔ سچ ہے:

باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ فکر و خیال کی بے اعتدالیوں اور عقیدت کے غلو سے پہلو تہی کرے اور احد اور احمد میں الوہیت رسالت کے فرق کو ملحوظ رکھے۔

ڈاکٹر وحید انجم کا شمار نئی نسل کے معروف شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ نعت گو کی حیثیت سے بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے ان کی نعت گوئی کے محاسن کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعر طبع رسا اور حسن ادا کا طالب ہے تاکہ اپنی نعت گوئی سے محفل کو متاثر کر سکے۔

انجم میں پڑھوں نعتِ نبیؐ جھوم اُٹھے محفل
وہ طبع رسا حسن ادا مانگ رہا ہوں

شاعر حضور ﷺ سے عقیدت کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

نام احمدؐ کی یہ تاثیر نہیں تو کیا ہے
ہر بلا دور بہت دور چلی جاتی ہے

نبی کے نام سے کھلتا ہے بند باب دعا
درود پڑھنا، عقیدت سے پھر دعا کرنا

پر فتن دور میں آپ کی نسبت کے طفیل
ہے سلامت میرا ایمان مدینے والے

ہر صدی محمدؐ کی ہر زماں محمدؐ کا
چل رہا ہے دھرتی پر کارواں محمدؐ کا

شاعر، عشق رسول ﷺ کو ایمان کا جز قرار دیتا ہے:

عشق رسول پاک ہے ایمان کا ظہور
کی جس نے آپؐ سے وفا اس کو خدا ملا

حضور ﷺ کے معجزات کا اس طرح احاطہ کیا گیا ہے:

شجر، کنکر پڑھیں کلمہ، قمر دو نیم ہو جائے
وجہ تخلیق عالم آپؐ ہیں کیا ہو نہیں سکتا

سر سدرہ یہ ثابت کر دیا خیرالبشر نے خود
فرشتوں کا بلند انساں سے رتبہ ہو نہیں سکتا

شاعر کے مطابق اسلامی کردار، تقویٰ میں مضمر ہے:

وہ اعلیٰ ہے جس کے ہیں کردار اچھے
یہ قول نبی ہے حسب نہ نسب ہے

شاعر شفاعت رسول ﷺ پر یقین کا اس طرح اظہار کرتا ہے:

کوئی خوف اے انجم مجھ کو ہو نہیں سکتا
رحمتوں کا ہے سر پر سائباں محمدؐ کا

کتاب میں شامل مناقب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انجم کو اولیائے کرام سے بھی خاص نسبت ہے۔ انھیں دکن کے بیشتر اولیائے کرام کے آستانوں پر حاضر ہو کر منقبتیں پیش کرنے کا شرف حاصل ہے۔ ذیل کے

اشعار سے میرے اس ادعا کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

جگ مگ آتے ہوئے مینار بلند، صدیوں سے
روضۂ شیخ کی پہچان میرے جنیدیؒ

دکن میں آپ نے روشن رکھی ہے شمعِ عرفاں
اسی کا فیض پایا ہوں علاالدین انصاریؒ

لقب قطبِ دکنؒ ہے اور صفت بندہ نوازی ہے
کرم و فیض کا جو سلسلہ ہے اب بھی جاری ہے

زمینِ برگ و گل پہ آپ نے اسلام پھیلایا
ہوا ہر سمت ایماں کا اُجالا پیر زنجانیؒ

میں ڈاکٹر وحید انجم کو ان کے نعوت و مناقب کے پہلے مجموعہ کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ اس مجموعے کی ادبی و مذہبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور دعا گو ہوں کہ ڈاکٹر وحید انجم کی مداح رسول ﷺ کی حیثیت سے پہچان ہو۔●●

(ڈسمبر 2009ء)

سید مجیب الرحمٰن شخصیت اور افکار

ڈاکٹر صدیقی انیسہ

صدیقی انیسہ نے حال ہی میں جامعہ گلبرگہ سے ایم۔فل کیا ہے ان کا موضوع تحقیق ممتاز ادیب و دانشور سید مجیب الرحمٰن اور ان کی تنقیدی نگارشات تھا۔ ریسرچ کے دوران انھیں مجیب صاحب کا شخصی قرب حاصل ہوا، ان کی شخصیت کو کھوجنے اور ان کے احساسات و خیالات کو پرکھنے کا موقع ملا اسی کا نتیجہ "سید مجیب الرحمٰن شخصیت اور افکار" ہمارے پیش نظر ہے۔

سید مجیب الرحمٰن کا شمار دکن کی عبقری شخصیتوں میں ہوتا ہے وہ سیلف میڈ ہیں انھوں نے میٹرک پاس ہونے بعد حیدرآباد کی فوج میں کلرکی کی۔ ایک سال بعد ہندوستانی ہوائی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ انھیں بنگال، آسام، برما، اور ہند چینی کے محاذوں پر جانے کا موقع ملا۔ تین سال بعد ہی لاہور سے رضا کارانہ طور پر فوجی خدمت سے سبکدوش ہوئے اور محکمہ آثار قدیمہ کی ملازمت اختیار کی وہ ریسرچ اسسٹنٹ، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور رجسٹرنگ آفیسر کی خدمات کے بعد وظیفہ حسن خدمت پر علاحدہ ہوئے۔ دوران ملازمت انھوں نے اپنے تعلیمی سلسلے کا احیا کیا۔ ایس بی کالج گلبرگہ سے پی یو سی کے بعد کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی تکمیل کی۔

سید مجیب الرحمٰن کی شخصیت کی کئی جہتیں اور پرتیں ہیں۔ وہ محقق، تنقید نگار، شاعر، ماہر نفسیات، ماہر آثار قدیمہ و نفسیاتی معالج ہونے کے علاوہ مارکسٹ اور سماجی انصاف کے فعال وکیل ہیں۔ ان کی زندگی کا معتد بہ حصہ NGO's کے کئی مسائل کو سلجھانے میں گزرا ہے۔ گویا ان کی شخصیت پر پیچ و متنوع اور فکر عام روش سے مختلف ہے۔ زیر نظر کتاب کے ذریعے صدیقی انیسہ نے سید مجیب الرحمٰن کی کثیر جہتی شخصیت اور ان کی طبع زاد افکار کا جائزہ لینے کی سعی کی ہے۔ مصنفہ نے شخصی ملاقاتوں، ممدوح کی تحریروں، تبصروں اور ان کے ہم عصروں سے انٹرویوز کے ذریعہ اس کتاب کا تانا بانا بنا ہے۔

زیر نظر تصنیف "سید مجیب الرحمٰن۔ شخصیت و افکار" کے پانچ ابواب ہیں پہلا باب "منظر اور پس منظر"

کے تحت صدیقی امیہ نے ان محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ جن کے زیر اثر انھوں نے منتخبہ شخصیت کو موضوع بنایا۔ دوسرے باب میں ممدوح کی تنقید نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں ''ماورائے شعور'' کے مضامین پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ''ماورائے شعور'' سید مجیب الرحمٰن کے تنقیدی مضامین کا اولین نقش ہے۔ جو1990ء میں شائع ہوا جس میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا دیباچہ، مصنف کا خودنوشت اسکیچ اور 17 مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کی انفرادیت، تنوع اور آزادیٔ روش چونکا دینے والی ہے مصنفہ نے مجیب صاحب کے خیالات کی من وعن ترجمانی کی ہے۔

مجیب صاحب کے مطابق حسیت میں تبدیلی ماڈرن سائنس پر چلنے سے نہیں آتی بلکہ ماڈرن سائنس کے کلچر میں اُٹھنے بیٹھنے اور رچنے بسنے کے تجربے سے آتی ہے۔ انھوں نے اُردو والوں کی پسماندگی کا سبب اس طرح ڈھونڈا۔

> ''اُردو کا مزاج تو ہندی سے بھی آگے جا کر عالمی زبان بننے کا ہے۔ مگر اس کے راستے میں اردو زبان والوں کی بدحالی اور نفسیاتی محرومی کا احساس آڑے آ رہا ہے۔ اس لیے ان کا خیال ہے جو عالمگیر مزاج اردو کا ہے، اردو والوں کا اب ایسا نہیں رہا۔ اس لیے اردو والوں کی حیثیت پسماندہ ہوگئی ہے''۔

مجیب الرحمٰن جہاں نئے افکار سے متاثر ہیں وہیں دو ہزار تین سو سال قبل ہیوقریطس کے پیش کردہ نظریہ پر اپنی فکری عمارت بھی کھڑی کرتے ہیں یہ نظریہ انسانوں کو طبعی اعتبار سے گول چہرے والے اور لمبوترے چہرے والوں کے دو گرہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہی وجہ بھی ہے کہ لمبوترے چہرے والے غالب کو ایک نازک بدن محبوب کے نہ ملنے کی شکایت تھی۔

مجیب الرحمٰن سگمنڈ فرائیڈ اور روسی ماہر جمالیات این۔ جی۔ چرنیشفسکی سے بھی متاثر ہیں Oepdipus Complex (مادرزدگی) کا جواز انھوں نے سگمنڈ فرائیڈ کے نظریے میں تلاش کیا ماہرین نفسیات کا چودہ جبلتوں پر اتفاق ہے مگر مجیب الرحمٰن صاحب جمالیاتی حس کو پندرھویں جبلت قرار دیتے ہیں اور اسے نفسیاتی تجزیے سے جوڑ کر بغیر ادویہ کے بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ نیز نفسیاتی بیماری کا سبب جمالیاتی عدم تسکین قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے قانون توافق کی وکالت کرتے ہوئے کہا ہے کہ

''جیسا آدمی ہوگا ویسے ہی آدمی کو پسند کرے گا۔'' (Like attracts like) غرض ''ماورائے شعور ''مصنف کی تنقیدی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے اگر چہ طرز تحریر گنجلک اور فلسفیانہ ہے۔

''سید مجیب الرحمٰن شخصیت اور افکار'' کے چوتھے باب میں ادبا و شعراء کی تصانیف پر سید مجیب الرحمٰن کے تحریر کردہ تبصروں اور تجزیوں پر رائے زنی کی گئی ہے۔ حرف آخر اس کتاب کا آخری باب ہے مصنفہ صدیقی انیسہ سید مجیب الرحمٰن سے اس قدر متاثر نظر آتی ہیں کہ زیادہ تر ان کی تحریروں اور نظریات پر اپنی طرف سے بہت کم کہا ہے انھوں نے اپنے موضوع کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ صدیقی انیسہ شاکی ہیں کہ تاحال ناقدین نے سید مجیب الرحمٰن کی تحریروں اور تنقیدوں کا منصفانہ جائزہ نہیں لیا۔ زیر نظر تصنیف کی اشاعت سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اب کی بار برف ضرور پگھلے گی اور ناقدین اس جانب متوجہ ہونگے اور یہ کتاب عام قارئین کے لیے بھی پسندیدگی و پذیرائی کا باعث ہوگی۔

●●

(2010ء)

تہلکہ

ڈاکٹر عبدالحمید مخدومی

ڈاکٹر عبدالحمید مخدومی، ادبی و مذہبی حلقوں میں خاصے متعارف ہیں۔ ان کا وطن مالوف الند، ضلع گلبرگہ ہے۔ انھوں نے میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول شوراپور (ضلع گلبرگہ) اور انٹرمیڈیٹ سٹی کالج حیدرآباد سے کامیاب کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے وٹرنری کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا مگر بعدازاں 1969ء میں اگر یکلچرل یونی ورسٹی آندھرا سے BVSC&AH کی تکمیل فرمائی۔ وہ سررشتہ حیوانات آندھراپردیش میں مختلف عہدوں پر فائز رہ کر 1996ء میں بہ حیثیت اسسٹنٹ ڈائرکٹر وٹرنری ہاسپٹل بودھن (نظام آباد) وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ مخدومی صاحب کی شخصیت میں ادب اور سائنس کا حسین امتزاج ہے۔ انھیں پڑھنے لکھنے سے دلچسپی ابتدا ہی سے رہی ہے مگر ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کا زیادہ تر وقت مطالعے کے علاوہ انجمن سازی اور ادبی سرگرمیوں کی نذر رہے۔ گذشتہ ۳ دہوں سے وہ جماعتِ اسلامی سے وابستہ ہیں اور ربع صدی سے اس کے رکن بھی ہیں۔ جماعت کی ادبی تنظیم، ادارہ ادب اسلامی گلبرگہ کے صدر رہ چکے ہیں اور ان دنوں خازن کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس ادارہ کے تحت اردو زبان و ادب کی ترقی اور تحریک اسلامی کے استحکام کے لیے جی جان سے کوشاں ہیں۔

مخدومی صاحب ادب، مذہب اور سیاست سے یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔ چنانچہ روزمرہ کے معاشرتی حوادث ہوں یا سیاسی واقعات ان کا قلم فوری ردعمل کے طور پر حرکت میں آجاتا ہے۔ ان کے بہت سارے مضامین حیدرآباد دکن کے اخبارات، سیاست، منصف، اعتماد، رہنمائے دکن کے علاوہ انقلاب (ممبئی) کے۔بی۔این ٹائمز (گلبرگہ)، انقلاب دکن (گلبرگہ)، دعوت سہ روزہ (دہلی) اور ماہنامہ زندگی (دہلی) میں شائع ہوئے ہیں۔ روزنامہ منصف (حیدرآباد) کے کالم زیروزبر میں بھی ان کی نگارشات جگہ پاتی رہتی ہیں ان کی تحریریں سادہ زبان میں پرخلوص جذبات کا بے لاگ اظہار ہیں۔ ان میں کہیں کہیں مزاح زیادہ تر طنز کی کاٹ ملتی ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ مخدومی صاحب کے مضامین کا پہلا مجموعہ "تہلکہ" کے نام سے اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ اُمید ہے کہ علمی و ادبی حلقے اس سے فیضیاب ہوں گے۔ ●● (2011ء)

مِلّی زندگی اور ہماری ذمہ داریاں

عابد مرزا

"ملی زندگی اور ہماری ذمہ داریاں" معروف مزاح نگار جناب عابد مرزا کی تیسری تصنیف ہے، قبل ازیں اُن کے فکاہیہ مضامین کا مجموعہ "ٹھیس نہ لگے آبگینوں کو" 2008ء میں اور موضوعاتی اشعار کا انتخاب "گلہائے رنگ رنگ" 2009ء میں شائع ہو چکا ہے۔ عابد مرزا اپنی نگارشات میں مقصدیت کو عزیز رکھتے ہیں۔ تحریر، مزاحیہ ہو کہ سنجیدہ، انھوں نے اصلاحی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے۔ "ملی زندگی اور ہماری ذمہ داریاں" کے ذریعہ عابد مرزا نے اصلاح ملت کا نہ صرف بیڑا اُٹھایا ہے بلکہ قارئین کو بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے۔ زیرِ نظر کتاب ۱۷ اصلاحی، تعمیری، تعلیمی اور فکری مضامین پر مشتمل ہے۔ عابد مرزا نے سادہ اور سلیس زبان میں ملت اسلامیہ کے شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیشتر مضامین ملت اسلامیہ کے مسائل ومشکلات اور حل سے متعلق ہیں۔ مصنف نے سیرت پاک ﷺ، فکر اقبال، شہادت عظمیٰ، فلسفہ خیر وشر، علماء کرام اور مدرسہ دینیہ کے مناصب کی روشنی میں اصلاح معاشرہ کے لیے ۱۲ نکاتی پروگرام بھی پیش کیا ہے۔

فاضل مصنف کے خیال میں امت کے افراد گروہ واری اور مسلکی تعصب کا شکار ہو گئے ہیں اس لیے مختلف مکاتب فکر، مسلمانوں کا باہمی اتحاد، وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے نیز مذہبی ادارے اور عبادت گاہیں انسانوں اور مذہب کی خدمت کم اور اپنے اداروں اور مسلکوں کی اپنے طور سے خدمت میں غلطاں ہیں، جس سے اتحاد اور بھائی چارے کی بجائے انتشار کو تقویت حاصل ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف فتوؤں کی تلاش کے بجائے شاہرہ اخوت اور قدر مشترک، عام کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

مجھے اُمید ہے کہ اصلاح معاشرہ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اس کتاب کو نہ صرف دلچسپی سے پڑھیں گے بلکہ اصلاح معاشرہ کی جانب عملی اقدام بھی کریں گے۔

●●

(2011ء)

من کا بن

زینت کوثر لاکھانی

''من کا بن'' محترمہ زینت کوثر لاکھانی کی تصنیف ہے جسے مجلس التفسیر یونیورسٹی کراچی نے اگست ۲۰۱۰ء میں شائع کیا ہے۔ مصنفہ نے اپنی کتاب ان لوگوں کے نام معنون کی ہے جو حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسان بننا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان بننا اور انسان کامل کا منصب حاصل کرنا، جوئے شیر لانے سے کم نہیں بقول حالیؔ۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

زیر نظر تصنیف انسانوں کو انسان بنانے کی جانب ایک اہم کاوش ہے۔ کتاب کے متن کا اصل اور بنیادی مأخذ قرآنِ حکیم ہے۔ مصنفہ کو افسوس ہے کہ آج کا انسان انسانی اصولوں کو بھلا کر حیوانیت کی طرف راغب ہے۔ ہمارے مذہب نے اسے اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الارض کا درجہ دے رکھا ہے۔ اسے اپنے مرتبے اور رتبے کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عرفانِ ذات ہی سے عرفانِ خدا ممکن ہے، لہٰذا انسان کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔

محترمہ زینت کوثر نے قرآن کے پیغام کو نہایت دلنشیں پیرائے میں اس طرح بیان کیا ہے کہ بات دل میں اتر جاتی ہے۔ انھوں نے خبردار کیا ہے کہ من کے بن میں شیطانی و حیوانی صفات داخل ہوں تو بہیمیت جاگ اٹھے گی اور انسان حیوان بنکر شرف انسانیت سے محروم ہوگا۔ انہوں نے خصوصیت سے ان جانوروں کا حوالہ دیا ہے جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے اور متنبہ کیا کہ انسان جانوروں کی خصلتوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے اور اپنے مقام ''احسن تقویم'' سے آگہی حاصل کرے۔ کتاب کا عنوان ''من کا بن'' قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ مصنفہ کے مطابق اگر من میں انسانیت، شرافت، دانائی، بے نیازی، وفاشعاری، نرم روی، غیرت، شرم و حیا جیسی صفات موجود نہ ہوں تو من، من نہ ہوگا بلکہ ایک ایسا جنگل ہوگا جہاں پر بربریت کا راج ہوگا۔

مصنف نے کتاب کے حصہ اول میں مقام بشریت وفضیلتِ آدم پر روشنی ڈالی ہے جب کہ دوسرے حصہ میں مختلف جانوروں اور ان کی بہیمانہ خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ان سے اجتناب کی تلقین کی ہے۔ حصہ سوم میں زور دیا گیا ہے کہ انسان اللہ کے عطا کردہ اعضا وزبان، کان، ناک، آنکھ وغیرہ سے صحیح کام لے کر مقام بندگی حاصل کرے۔

یہ جان کر مسرت ہوئی کہ عزیزی عبدالقادر انشا اور ان کے ساتھی اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے دوسرے اڈیشن سے بھی زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کریں گے۔ ●●

(جنوری 2012ء)

ادبی رجحانات اور شعری اصناف

ڈاکٹر فاطمہ زہرا

ڈاکٹر فاطمہ زہرا بحیثیت شاعرو نثر نگار، اردو حلقوں میں اپنی خاص پہچان رکھتی ہیں۔ ان کی شعری کاوشیں اور نثری افکار سالار (بنگلور)، سیاست (بنگلور)، کے بی این ٹائمز (گلبرگہ)، کے ہفتہ وار اڈیشن کے علاوہ معیاری رسائل تکمیل (بھیونڈی)، ترسیل (ممبئی)، اذکار (بنگلور)، سب رس (حیدرآباد) اور پرواز (کراچی) میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ بحیثیت محقق انفرادیت کی حامل ہیں۔ تخلیقی حسیت کے نمایاں ترجمان، شاذ تمکنت، ڈاکٹر فاطمہ زہرا کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ وہ ان کے ڈکشن، رومانی لہجے، پرشکوہ ترکیبوں اور انوکھی تشبیہوں سے بے حد متاثر رہی ہیں۔ اس پسندیدگی نے انھیں شاذ کی شخصیت اور فن پر تحقیقی کام کے لیے آمادہ کیا۔ محترمہ نے ممبئی یونیورسٹی سے جناب یونس اگاسکر کی رہنمائی میں بعنوان ''شاذ تمکنت: حیات اور ادبی خدمات'' تحقیقی مقالہ لکھا، جس کی بنیاد پر انھیں 2003ء میں ڈاکٹریٹ تفویض کی گئی۔ مقالے کی تلخیص ''شاذ تمکنت شخصیت و فن'' 2007ء میں شائع ہو چکی ہے۔

زیر نظر تصنیف ''ادبی رجحانات اور شعری اصناف'' ان کے نثری مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے، جس کے ذریعے مصنفہ نے قارئین کو ادب کے نئے رجحانات سے روشناس کروایا ہے۔ مشمولات کے پہلے مضمون، جدید شاعری کیا ہے؟ کے تحت مصنفہ نے لکھا ہے کہ جدید شاعری میں ڈکشن، ہیئت، مواد او اسلوب میں نت نئے تجربوں سے اردو شاعری رجحانات و میلانات سے مستفیض ہوئی، اس کا نتیجہ ہے کہ جدید شاعری عمیق داخلیت، انفرادیت، خودکلامی، نئی لفظیات، علامتوں کی تازہ کاری اور پیکروں کی ندرت سے بھی متصف ہوئی۔ جدید غزل، اس کتاب کا دوسرا اہم مضمون ہے، جس کے مطالعے سے آج کی غزل کی خصوصیات، برہمی، بے سمتی، بے راہ روی، لاتعلقی، خود اذیتی، نا آسودگی، اختلاف، انحراف، کرب، بے چینی، تنہائی، تناؤ، الجھن، توڑ پھوڑ، عقائد کی شکست و ریخت، لہجے کی درشتگی اور ناہمواری کا اندازہ ہوتا ہے۔ جدید شاعروں نے اشاروں، کنایوں اور علامتوں کے پردوں میں جنسی پیچیدگیوں اور نفسیاتی الجھنوں کو پیش کیا ہے۔

محترمہ کے مطابق جدید غزلوں میں کلاسیکی روایت کا نیا صحت مند اور توانا رجحان بھی ملتا ہے۔ نظموں میں معریٰ نظم، آزاد نظم، نثری نظم اور بصری نظم کی طرح غزلوں میں بھی آزاد غزل، نثری غزل، اور اینٹی غزل کے تجربے کیے گئے۔ مصنفہ نے جدید غزل کے مختلف موضوعات کو نمائندہ شعرا کے اشعار سے اس طرح مزین کیا ہے کہ جدید غزل کے رموز و نکات واشگاف ہو جاتے ہیں۔

زندگی کی طرح ہمارا ادب بھی تغیر و تبدل کا متقاضی ہے۔ زندگی کے ارتقا میں جہاں تحریکوں کا حصہ ہوتا ہے وہاں نظریات اور رجحانات بھی کارفرما ہوئے ہیں۔ ان سب کی باہمی قربت ایک اہم مسئلہ ہے۔ وہ ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ ایک کا دوسرے پر گمان ہوتا ہے۔ جدیدیت رجحان ہے کہ نہیں، اس بارے میں متضاد آراء ہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر نے جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع قرار دیا تھا، جب کہ کسی اور کی نگاہ میں وہ ترقی پسند تحریک کا ردعمل تھا۔ گیان چند جین نے جدیدیت کو ادبی تحریک کہا ہے، ان کے مطابق ادبی تحریکوں کے لیے تنظیم ضروری نہیں ہے۔ ''فرہنگ ادبیات'' کے خالق سلیم شہزاد نے جدیدیت کے بارے میں اپنا فیصلہ اس طرح صادر فرمایا ''جدیدیت کو محض رجحان نہیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ جدیدیت کے متعدد رجحانات کو انتہا پسندی ساتھ جدید ادب میں برتا گیا اور برتا جا رہا ہے۔ کسی تصور کے تعلق سے یہ انتہا پسندی اسے تحریک بنانے کے لیے کافی ہے۔ کلیم الدین احمد مصنف ''فرہنگ ادبی اصطلاحات'' نے دادائیت اور اظہاریت کو تحریک قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر کرامت نے بھی اپنے مقالے ''جدید شاعری اور اس کا پس منظر'' میں دادائیت کو تحریک ہی کا نام دیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی تصنیف ''نئے ادبی رجحانات'' پہلی بار 1942ء میں شائع کی تھی۔ اس کتاب کے متعدد اڈیشن شائع ہوتے رہے۔ پانچواں اڈیشن 1957ء میں شائع ہوا تھا۔ اعجاز حسین نے اپنی تصنیف میں 66 عناوین کے تحت تحریکات کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے۔ اس طرح ان کے جائزے میں غیر متعلق چیزیں بھی در آئی ہیں۔

مذکورہ بالا اختلافی آراء کے باوجود بہت سارے ناقدین نے (جن میں شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ وغیرہ شامل ہیں) تحریک اور رجحان میں خط فاصل کھینچا ہے۔ ڈاکٹر فاطمہ زہرا نے بھی ان ہی کے خطوط پر جدیدیت، علامت نگاری (Symbolism)، اظہاریت (Expressionism)، تجربیت (Empiricism)، ماورائیت (Transcendentalism)، ماورائی حقیقت پسندی

(Surrealism)، واقعیت پسندی (Realism) اور دادائیت (Dadaism) کو رجحان قرار دے کے ان کی ابتداء، رجحان سازی اور اس کے اثرات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اردو ادب کی اصناف کی طرح بہت ساری تحریکیں اور رجحانات بھی مغرب کی دین ہیں۔ اس لئے وہ زیادہ تر مغربی افکار ہی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جہاں تک اردو ادب پر ان کے اثرات کا تعلق ہے، مصنفہ نے اس خصوص میں چند فنکاروں کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ مگر ان رجحانات کے تحت فن پاروں کی شمولیت کی کمی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ تاہم جدید شاعری، جدید غزلوں اور ادب کے مختلف رجحانات کی تفہیم میں یہ کتاب قارئین کے لیے ممد ومعاون ہوگی۔ میں اس کتاب کی اشاعت پر مصنفہ کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کی اس دوسری تصنیف کی بھی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

●●

(2012ء)

ادب اطفال اور کہانی

ڈاکٹر محمد نظام الدین

زیر نظر کتاب ''اردو ادب اطفال اور کہانی'' کے مصنف ڈاکٹر محمد نظام الدین رینو کا انڈیپنڈنٹ پی۔یو۔کالج، بیدر کے سلکشن گریڈ لکچرر ہیں۔ڈاکٹر محمد نظام الدین کو تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق، تنقید اور افسانہ نگاری سے لگاؤ ہے۔ان کے افسانے اور تحقیقی و تنقیدی مضامین ''ہماری زبان'' ''زرین شعاعیں، سہ ماہی طنز و مزاح اور روزنامہ ''سیاست'' کے ادبی اڈیشنوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ڈاکٹر محمد نظام الدین نے ۲۰۱۰ء میں ''ادب اطفال میں کہانی کا حصہ'' کے موضوع پر جامعہ گلبرگہ سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ان کا یہ تحقیقی مقالہ ڈاکٹر حشمت علی فاتحہ خوانی صدر شعبہ اردو کرناٹک آرٹس، سائنس و کامرس کالج، بیدر و ریسرچ گائیڈ جامعہ گلبرگہ کی نگرانی میں تحریر کیا گیا ہے۔موضوع کے پیش نظر فاضل ریسرچ اسکالر نے اپنے مقالے کی تلخیص کو کتابی شکل دی ہے۔

کتاب پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ادب اطفال میں کہانی کا پس منظر، کہانی کی ماہیت اور فن کا جائزہ، کہانی کی اقسام، ادب اطفال میں کہانی کا تنقیدی جائزہ اور نمائندہ کہانی کار (انتخاب و تجزیہ) ادب اطفال میں کہانی کا پس منظر میں واضح کیا گیا ہے کہ قوموں کی ترقی کا انحصار نونہالوں پر ہے۔بچے قومی امانت ہیں، جن کی خبر گیری اور تحفظ ضروری ہے۔مصنف کے الفاظ میں:

> ''انھیں محض عمدہ غذاؤں، بہترین ملبوسات اور قیمتی کھلونے فراہم کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ جسمانی نشو و نما کے ساتھ ذہنی تربیت اور سلیقہ مند نگہداشت ضروری ہے۔ انھیں نصابی کتب کے علاوہ ایسے ادبی مواد کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کی ذہنی بالیدگی اور جذبات کی آسودگی کا باعث بنے''۔

ظاہر ہے اس ادبی مواد میں ''کہانی'' کو مرکزیت حاصل ہے۔بچوں کے کہانی کار انشاء اللہ خاں انشاء کی بچوں کیلئے تحریر کردہ کہانی (رانی کیتکی) سے ہے کہ آج کے ادیبوں کی کہانیوں نے بچوں کی ذہنی بالیدگی

میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ کہانی کو اپنے دو سو سالہ ارتقائی سفر میں مختلف مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ ابتدا میں کہانیوں پر پنچ تنتر، داستانوں، اساطیری اور روایتی قصوں کا رنگ غالب تھا۔ رفتہ رفتہ تبدیلی زماں و مکاں، تجربات و امکانات کی بوقلمونی، کہانی کی ہیئتی نوعیت میں تبدیلی کا موجب بنی۔ کیوں کہ زندگی اور فن کا اٹوٹ رشتہ ہے، دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ زندگی ٹھہراؤ اور جمود کا شکار ہوگی تو ادب بھی زندگی سے محروم ہوگا۔ مصنف نے صحیح تجزیہ کیا ہے: ''بدلتے وقت کیساتھ انسانی شعور نے بھی کروٹ لی اور انسان طلسماتی ادب سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگا اور حقیقت نگاری کی جستجو میں لگا رہا''۔

اسی جستجو کا نتیجہ ہے کہ ادب اطفال میں کہانی کو نئی سمت ملی۔ تبدیلی کا سلسلہ جو ۱۹ویں صدی میں شروع ہوا تھا، بیسویں صدی میں نقطۂ عروج پر پہنچا۔ ۱۹ویں صدی کے ربع آخر میں سرسید کی تحریک کے زیر اثر ڈپٹی نزیر احمد، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد اور اسماعیل میرٹھی نے بچوں کیلئے عام فہم زبان میں نثر لکھی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں پریم چند، خواجہ حسن نظامی، لیلیٰ خواجہ بانو، حامد اللہ افسر، محوی صدیقی، امتیاز علی تاج، حجاب امتیاب علی، مرزا ادیب، ایم اسلم، چراغ حسرت کے علاوہ جامعہ ملیہ کے مصنفین ذاکر حسین، حسن حسان، عبدالواحد سندھی، الیاس احمد مجیبی، عبدالغفار مدھولی، ڈاکٹر عابد حسین، صالحہ عابد حسین، پروفیسر مجیب، قدسیہ زیدی، شفیع الدین نیر اور بیرون جامعہ کے مصنفین رشید احمد صدیقی، کوثر چاند پوری، شجاع احمد قائد، اطہر پرویز، زکی انور وغیرہ نے کہانی کے بتدریج ارتقاء میں معاونت کی۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر کرشن چندر، عصمت چغتائی، کنھیا لال کپور، عادل رشید، پرکاش پنڈت، سہیل عظیم آبادی، رام لال، قرۃ العین حیدر، واجدہ تبسم، عطیہ پروین، اظہار افسر، سراج انور، احمد جمال پاشاہ وغیرہ نے جاندار کہانیاں لکھیں۔ مسلم ضیائی، جیلانی بانو، خورشید احمد جامی، امیر احمد خسرو، افتخار احمد اقبال، اظہر افسر، سلیم تمنائی، نعیم اقبال، خالد عرفان اور ضیاء جعفر نے فنی طور پر کہانی کو آگے بڑھانے میں جنوبی ہند کی نمائندگی کی۔

فاضل مصنف نے کہانی کی بہت ساری اقسام کی نشاندہی کی ہے۔ جیسے داستان، اساطیری و روایتی قصوں سے ماخوذ کہانیاں، طلسمی کہانیاں، باتصویر کہانیاں، تاریخی کہانیاں، مذہبی و اخلاقی کہانیاں، سائنسی کہانیاں، مزاحیہ کہانیاں، کہاوت اساس کہانیاں، منی کہانیاں، ترجمہ شدہ کہانیاں وغیرہ۔ ان اقسام کے تحت محقق نے مختلف کہانی کاروں کی کہانیوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔

چوتھا باب ادب اطفال کی کہانیوں کا تنقیدی جائزہ ہے۔ اس جائزے میں کلیم الدین احمد، وقار عظیم، مشیر فاطمہ، ڈاکٹر خوشحال زیدی، انتظار حسین اور ڈاکٹر محبوب راہی کے حوالے سے کامیاب کہانی کے لوازم بیان کیے گئے ہیں۔ بچوں کی کہانی میں تجسس و دلچسپی کی شمولیت موثر انداز بیان، آسان زبان، جداگانہ اسلوب اور پیچیدگی و علامت نگاری سے اجتناب پر زور دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں کہانی تحریر کرنے کے مقصد کی صراحت کرتے ہوئے تعلیم و تربیت، کردار سازی ذہانت و فکر میں وسعت، حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے فروغ کو ضروری قرار دیا ہے۔

آخری باب میں محقق نے ۱۵ منتخب کہانی کاروں کے تعارف کے ساتھ کہانیوں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ تجزیے میں ہر کہانی کے محاصل اور کہانی لکھنے کے مقصد کو واشگاف کیا گیا ہے۔ صرف ایک کہانی ''وقت کی قیمت'' (از۔ زینب نقوی) میں انگریزی الفاظ کے بیجا استعمال پر اختلاف رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ ۱۵ منتخب کہانی کاروں میں جنوب سے صرف جیلانی بانو کی شمولیت مکمل انتخاب نہیں ہے۔ مسلم ضیائی، افتخار احمد اقبال اور خالد عرفان کی کہانیاں بھی توجہ کی مستحق ہیں۔

کہانی کا ارتقائی سفر آج بھی جاری ہے۔ ڈاکٹر محبوب راہی کی ایک پیشن گوئی سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ ''بائیسویں صدی کی دہلیز تک پہنچتے پہنچتے اردو ادب اطفال بھی (خدانہ کرے) آغوش فنا میں ابدی نیند سوجائیگا'' ادب اطفال کے بالغ نظر شاعر و کہانی کار (بشمول ڈاکٹر محبوب راہی) زندہ ہیں اور ادب اطفال کی تخلیق میں ہمہ تن مصروف۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ادب اطفال گذشتہ دو سو سال سے ہمارے نونہالوں کی تربیت کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔

بحیثیت مجموعی ڈاکٹر محمد نظام الدین کی یہ کتاب ادب اطفال کے تحت کہانی کی ہیئت، فن اور اس کے ارتقاء کے بارے میں اہم دستاویز ہے۔ امید کہ ادب اطفال کے قارئین اس سے استفادہ کریں گے۔

●●

(2012ء)

آب فشار

سید احمد ایثار

سید احمد ایثار کو شاعری اور ترجمہ نگاری سے شغف ہے۔ وہ عاشقِ اقبال کی حیثیت سے ملقب ہیں۔ عشقِ اقبال نے انھیں اپنے ممدوح کی فارسی شاعری کو اردو میں منتقل کرنے پر راغب کیا۔ ایثار صاحب واحد مترجم ہیں جنھوں نے اقبال کے فارسی کلام کے تمام سات ے مجموعوں کو اردو میں منظوم ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اقبال فہمی اور افکارِ اقبال کی اشاعت کے باعث ان کا شمار ماہر اقبالیات میں ہونے لگا ہے۔ اقبال کے علاوہ سید احمد ایثار نے رباعیات مولانا روم " (شمس تبریز کی رباعیات)، رباعیات عمر خیام اور رباعیات سعدی کا بھی منظوم اردو ترجمہ کیا ہے جو ہنوز منتظر اشاعت ہے۔

ایثار صاحب اوائل عمر ہی سے شعر گوئی کی جانب مائل تھے۔ انہوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں پہلی غزل کہی تھی۔ ترجمہ نگاری کے باعث کچھ عرصے تک ان کی شاعری تعطل کا شکار رہی۔ 1999ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''ترانہ و ترنگ'' شائع ہوا جو رباعیات وقطعات پر مشتمل ہے۔ ان رباعیات وقطعات پر اصلاحی و مذہبی رنگ غالب ہے۔ زیرِ نظر تصنیف '' آب فشار'' ۱۲ سال کے وقفے کے بعد شائع ہونے والا ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ جس کی ابتداء میں ۵ حمدیہ نظمیں، دعا اور ۴ نعوت کے ساتھ سورۂ فاتحہ کا منظوم ترجمہ بعنوان '' افتتاحیہ'' بھی شامل ہے۔ رباعیات وقطعات کے اشعار ان کی فنی مشاقی کے ساتھ ساتھ خالق کائنات سے قلبی تعلق اور ذاتِ رسول ﷺ سے بے پناہ عقیدت کے مظہر ہیں۔ عجز وانکسار کے ساتھ داتا کی دین کا اعتراف ملاحظہ ہو:

نہیں کچھ بھی ایثار کا جو بھی ہے
تری دین ہے سب ترا دان ہے

بطحا کی وادیوں کا سفر شاعر کی بے قراری کو قرار بخش رہا ہے:

خوشا نصیب یہ بطحا کی وادیوں کا سکوں
قرار پائیں گے جو بے قرار آئے ہیں

حمد یہ ونعتیہ کلام کے علاوہ ''آب فشار'' میں ڈھیر ساری غزلیں شامل ہیں جو شاعر کی غزل گوئی سے چاہت کا پتہ دیتے ہیں۔ انہیں غزل کی ہمہ گیری اور مقبولیت کا اندازہ ہے۔

کون سامان نہیں، کس کی کمی ہے اس میں
کون سی بزم میں ایثار نہیں جائے غزل

شاعر غزل کے تقاضوں اور اس کی فکری رفعت سے بدرجہ اتم آگاہ ہے:

فکرِ سخن میں رفعت افلاک چاہیے
لے آئیں گے زمینِ غزل آسماں سے ہم

جہاں تک غزل کے موضوعات کا تعلق ہے، شاعر نے عشق ومحبت، مجاز وحقیقت، فقر واستغنا، خیر وشر، زندگی اور اس کے مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ شاعر عشق ومحبت کو ایک پاک، اعلیٰ وارفع جذبہ قرار دیتا ہے۔ معاملہ بندی اور بوالہوسی سے پرے وہ محبت کا آفاقی تصور رکھتا ہے:

محبت سمیٹے ہے سارے جہاں کو
محبت میں تاثیر ہے جاذبانہ

شاعر محبت کو سوداگری نہیں گردانتا وہ اسے سودوزیاں کے پیمانے سے نہیں ناپتا:

نہیں سوداگری چاہت یہاں سود و زیاں کیا ہے
وہ کیا پاتا ہے کھوتا ہے سمجھ میں کچھ نہیں آتا

شاعر قیس وکوہکن کے جذبہ کا قائل نظر آتا ہے جس کے لیے حوصلے کی ضرورت ہے۔ اس راہ کی دشواریوں کا بھی اسے احساس ہے:

آسان نہیں ہے پیرویٔ قیس و کوہ کن
پہلے وہ دل وہ حوصلہ پیدا کرے کوئی

کیا بڑی بات تھی وہ کوہ کنی
عشق کی جاں کنی بھی دیکھی ہے

شاعر اس سے باخبر ہے کہ ایک دانۂ گندم کے عوض انسان کہاں سے کہاں پہنچ گیا:

عوض ایک دانۂ گندم کے کیا کیا چھن گیا ہم سے
وہ جنت فضا ماحولِ طوبٰی چھوڑ آئے ہیں

شاعر محسوس کرتا ہے کہ دنیا خیر و شر سے ہی عبارت ہے۔ ازل سے یہی اس کا شعار رہا ہے اور ابد تک جاری رہے گا:

دنیا جو بد و نیک سے بیگانہ رہے گی
کہلائے گی کچھ اور وہ دنیا نہ رہے گی

سہو و خطا، تساہل و نسیاں، انسان کی فطرت میں ہے۔ شاعر کو یقین ہے کہ رحمت عفو و درگذر سے کام لے گی:

نہ اس میں سہو و خطا ہو نہ اس میں عفو و کرم
تو بندہ بندہ نہ ٹھہرا خدا خدا نہ رہا

خواب و خیال شعبدۂ سامری نہیں
ایثار ایک زندہ حقیقت ہے زندگی

شاعر زندگی کو خواب نہیں حقیقت مانتا ہے۔ اس کے ہاں خواب زندگی سے علاحدہ کوئی شئے نہیں ہے:

زندگی خواب ہو تو ایثار
خواب میں زندگی بھی دیکھی ہے

زندگی جیسی حقیقت بھی لمحہ بھر کی بہار ہی تو ہے اس کی بے ثباتی اٹل ہے۔

حسنِ آتش سوار ہیں ہم لوگ
لمحہ بھر کی بہار ہیں ہم لوگ

فقر، بظاہر بے نیازی، قناعت و ریاضت سے مرکب ہے مگر اپنے اندر ایک ماورائی قوت بھی رکھتا ہے:

ان کے اک اف سے عجب کیا جو لرز جائے شہی
پایۂ عرش کو درویش ہلا دیتے ہیں

ایثار صاحب کی شاعری میں اسلام کے سوا کسی ازم اور نظریے کی تلاش بے سود ہے۔ اصلاح عالم کے بہانے آج توسیع پسندی اور جہاں گیری کے رجحان کو غلبہ حاصل رہا ہے۔ شاعر نے اس ذہنیت پر کڑی ضرب لگائی ہے۔

جہاں بھر میں ان کو حکومت کا سودا
ہے اصلاحِ عالم فقط ایک بہانہ

"آب نشاط" میں سہل ممتنع میں کہی ہوئی غزلیں سادگی و پرکاری کا نمونہ ہیں:

میں حقائق بیان کرتا رہا
وہ سمجھتے رہے کہانی ہے
درد دل کے ستائے بیٹھے ہیں
مہر لب پر لگائے بیٹھے ہیں
انکساری کا ہے مقام بڑا
خودسری سرکشی سے کیا ہوگا
کامیابی ہے جہد پر مبنی
دوستی دشمنی سے کیا ہوگا

ان اشعار کے تیور بھی دیکھیے:

وہ دل کی بات زباں تک نہ آسکی جو کبھی
ہے زیر بحث سر عام کیا کیا جائے
شکر صد شکر، ندامت سے کبھی سر نہ جھکا
سرفرازوں میں اٹھائے ہوئے سر آئے ہیں
ہمارے حق میں وہی آج دشمن جاں ہیں
عزیز رکھتے تھے ہم جن کو اپنی جاں کی طرح

باب غزل کے بعد نظموں کا باب شروع ہوتا ہے۔ اس میں تاریخی شخصیات جیسے حضرت ابراہیمؑ ،

حضرت سیدنا امام حسینؓ، علامہ اقبالؒ، شیر میسور حضرت ٹیپو سلطانؒ اور ہم عصر اصحاب پروفیسر بی شیخ علی، اکمل آلدوری، آغا مرزا محمود سروش، عزیزہ شہناز، پاپا عبدالرحمٰن (بصارت سے محروم ایک مزدور) ایک مفلس طالب علم کے علاوہ دیگر موضوعات مقام زن، ماہ رمضان، علامہ اقبال کو "دافع اظلام" قرار دیتے ہوئے ان کے خیال عرش رسا اور پُر شکوہ طرز کلام کو سراہا گیا ہے۔ علامہ کی شاعری کے مقصد کو اس طرح واضح کر دیا گیا ہے:

تمیز قوم و وطن وجہ فتنہ ہائے عظیم
کہ پست و زشت اسی سے ہے آدمی کا مقام
فلاح نوع بشر کی ہے مقصد اصلی
یہی پیام ہے اقبال کا یہی اسلام

حضرت سیدنا امام حسینؓ کے پیام کو اس طرح اجاگر کیا ہے:

ثابت کلام حق سے ہے شہداء کی زندگی
باطل سے راست جنگ، پیام حسینؓ ہے

ایک مفلس طالب علم سے شاعر نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے یوں اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے:

علم کی دولت سے مالا مال ہونا چاہیے
تجھ کو خوش فکر اور نیک اعمال ہونا چاہیے
مشکلیں آتی ہیں ہمت آزمانے کے لیے
قوتِ پنہاں بروئے کار لانے کے لیے

عورت کے مقام، اس کی عزت وحرمت کے بارے میں شاعر کا احساس:

سماج والوں پہ احسانوں کا حساب نہیں
کہاں جوابِ تمھارا کوئی جواب نہیں

شاعر زبان اردو کو نازش ہند قرار دے کر حقیقت کا اظہار کر رہا ہے۔

ایک حقیقت ہے کوئی مانے نہ مانے اس کو
نازشِ ہند زبانوں کی زباں ہے اردو

اس طرح قرآن عظیم کے بارے میں شاعر کی حقیقت بیانی توجہ چاہتی ہے:

فصاحت بے مثال اس کی بلاغت اس کی لاثانی
کلام اللہ کا اور آپؐ امیؐ کی زبانی

ایثار صاحب کی غزلوں ونظموں کے جائزے کے پیش نظر ان کی شاعری کو کلاسیکی یا روایتی شاعری کی فنی اور فکری توسیع کا عمل قرار دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنے احساس کو بصیرت، تجربے اور مشاہدے کی کسوٹیوں پر پرکھا ہے۔ ان کی یہ شاعری علامتی اور تجریدی اظہار سے مبرا ہے۔ ان کے ہاں جدید شعری لفظیات کے بجائے فارسی لفظیات وتراکیب کا غلبہ ہے۔ جوش واقبال کی طرح ان کی شاعری میں شوکتِ لفظی کی مثالیں ملتی ہیں۔ ایثار صاحب اقدار کے شاعر ہیں۔ شاعری کے مروجہ اصولوں کو رد نہیں کرتے بلکہ ان کا احترام محوظ رہتا ہے۔ وہ اخلاق وکردار کو اپنی فکر کے مطابق معنویت عطا کرتے ہیں:

زباں کٹ جائے تو کٹ جائے حق گوئی نہ جائے گی
یہی وہ کارِ ہمت ہے جسے ایثار کہتے ہیں

اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شاعری سید احمد ایثار کے لیے تفریح طبع کا سامان نہیں بلکہ وہ اعلیٰ سماجی مقصد رکھتی ہے۔ وہ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں زندگی کی تصویر کھینچتے ہیں۔

ایثار لفظ لفظ ہے تصویرِ زندگی
میرے سخن کو کہتے ہیں احباب آئینہ

اس میں شاعرانہ تعلّی کہاں؟ شاعر کی خود اعتمادی آئینہ ہوگئی ہے۔ میں ایثار صاحب کو ان کے دوسرے شعری مجموعے "آب فشار" کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں اور پر امید ہوں کہ ان کے اس شعری مجموعے کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

●●

(2012ء)

منتخب اشعار

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

اردو کی لیکچرار ڈاکٹر فوزیہ چودھری بہ حیثیت خاکہ نگار، نقاد و صحافی ادب میں انفرادیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے گذشتہ دہے میں اپنے ہم عصر ادبا و شعرا کے جو خاکے تحریر کیے ہیں وہ متاثر کن ہیں۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''مہربان کیسے کیسے'' 2003ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر فوزیہ چودھری کی دوسری تصنیف ''حیدرآباد کرناٹک میں خاکہ نگاری'' 2012ء سے فنِ خاکہ نگاری پر ان کی گرفت اور تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے نہ صرف ''اردو میں ادب اطفال آزادی کے بعد'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ہے بلکہ بچوں کے رسالہ ''غبارہ'' کی اشاعت کے ذریعے ادب اطفال کے معماروں میں جگہ بنائی ہے۔

زیرِ نظر تالیف ''منتخب اشعار'' (برائے بیت بازی و دیگر مقابلہ جات) ''قدیم و جدید شعراء کے منتخب و معیاری ابیات پر مشتمل ہے۔ اردو زبان کی ترقی و ترویج میں اردو شاعری کا اہم رول رہا ہے۔ خصوصاً غزل خوانی، غزل گائکی، شعری نشستیں اور مشاعرے اردو کی مقبولیت کا بڑا سبب ہیں۔ اسی وجہ سے بھی ادب میں شاعری کا پلڑا بھاری رہا۔ فطرت کے اسرار کو آشکار کرنے، فکر و نظر کے تنوع اور وسعت میں بھی شاعری نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس انتخاب میں تقریباً ڈھائی ہزار سے زائد اشعار شامل ہیں۔ مولفہ نے ''اپنی بات'' کے ذریعے اس شعری انتخاب کے محرکات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اشعار کے ازبر ہونے سے الفاظ کی صحیح ادائیگی، زورِ بیان اور ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ تو یقینی ہے اس کے علاوہ شعر خوانی اور بیت بازی کے مقابلوں کے لیے اس طرح کے مجموعوں کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔

مؤلفہ نے ایک عرصے کی محنت، لگن اور جستجو کے ذریعے قارئین کی نظر و مطالعہ کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ اس سعی کی قدر و قیمت کا اندازہ ان ہی افراد کو ہوگا جنھوں نے اس دشت کی سیاحی کی ہے۔ بقول میر ؎

اسے ڈھونڈتے میر کھوئے گئے ::: کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس انتخاب کی ہر طرح سے پذیرائی ہوگی۔ خصوصاً طلبہ، اساتذہ، مقررین اور واعظین اس سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔ ●●

(مارچ 2013ء)

بیسویں صدی اور اردو شاعرات

ڈاکٹر فریدہ بیگم

فریدہ بیگم کا وطن مالوف و یار ادب گلبرگہ ہے۔ فریدہ نے ۱۹۹۶ء میں بی بی رضا ڈگری کالج گلبرگہ سے بی۔ اے درجہ اول میں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے ۲۰۰۱ء میں بی۔ ایڈ اور ۲۰۰۵ء میں جامعہ گلبرگہ سے اردو میں پوسٹ گریجویشن کیا۔ وہ ایم۔ اے میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کرتے ہوئے گولڈ میڈل کی مستحق قرار پائیں۔ دوران طالب علمی ہی سے انھیں مطالعے کا شوق رہا ہے، جس کے باعث بین المدارس و بین الکلیاتی تحریری، تقریری، بیت بازی مقابلوں و مذاکروں میں شرکت کے ذریعے اسناد و تمغات حاصل کیے۔ ۲۰۰۲ء میں انہیں اقبال ادبی مرکز سنسکرتی پریشد بھوپال مدھیہ پردیش، کے زیر اہتمام منعقدہ آل انڈیا Essay Competition میں قومی سطح پر مضمون نگاری مقابلے میں انعام اول حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ فریدہ کو ثانوی درجے سے جامعاتی سطح تک درس و تدریس کا دیرینہ تجربہ بھی حاصل ہے۔ موصوف، یو۔ جی سی کے امتحانات NET اور SET بھی کامیاب ہیں۔

فریدہ بیگم شعر و ادب کا پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں۔ انھیں ادب کی اہم صنف تحقیق و تنقید سے گہری دلچسپی ہے۔ ان کے مضامین اخبارات کے ہفتہ وار اڈیشن اور معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ فریدہ نے پروفیسر جلیل تنویر کی نگرانی میں ''اردو شاعری میں تانیثیت، آزادی کے بعد'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ جس کی بنیاد پر انھیں فروری ۲۰۱۱ء میں جامعہ گلبرگہ نے Ph.D کی ڈگری تفویض کی۔

زیر نظر تصنیف ''بیسویں صدی اور اردو شاعرات'' مصنفہ کی تحقیقی دروں بینی و توازن فکر کا اظہار یہ ہے۔ انھوں نے Ph. D کے اپنے مقالہ سے استفادہ کرتے ہوئے کچھ کمی بیشی کے ساتھ بیسویں صدی کی تانیثی شاعرات کا جائزہ لیا ہے جو بہ لحاظ موضوع منفرد اور افادیت کا حامل ہے۔ نفس مضمون پر اظہار خیال سے قبل بطور پس منظر مصنفہ نے پہلے باب میں ''ہندوستان میں عورت اور سماج'' کے تحت ویدک دور سے لے کر حصول آزادی تک خواتین کی ابتر حیثیت اور وقتاً فوقتاً ان کی بہتری کے لیے کیے گئے اقدامات کا ذکر کیا ہے۔ ''اردو ادب میں عورت کا مقام'' مشمولات کا دوسرا مضمون ہے جس میں ۱۸۵۷ء سے پہلے ادب کی

داستانی دور اور ۱۸۵۷ء کے بعد فکشن کے دور کے نسوانی کرداروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علی گڑھ تحریک کے رول کی وضاحت کرتے ہوئے مصنفہ نے بتایا کہ سر سید اگر چہ ابتدا میں تعلیم نسواں کے مخالف تھے۔ مگر انگلستان سے واپسی کے بعد انھوں نے تعلیم نسواں کی حامی بھری۔ سر سید نے اپنے اخبار ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے ذریعے عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کو اجاگر کیا۔ سر سید کے رفقا میں ڈپٹی نذیر احمد اور الطاف حسین حالی کے علاوہ رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور مرزا ہادی رسوا کی تخلیقات و مضامین کے باعث عظمتِ نسواں کی سمت پیش رفت ہوئی۔ ترقی پسند تحریک کا ذکر کرتے ہوئے مصنفہ نے لکھا ہے کہ اس تحریک کے آغاز سے قبل رشید جہاں اور ان کے ساتھیوں نے ''انگارے'' کی کہانیوں کے ذریعہ خواتین کے مسائل کو موضوع بحث بنایا بعد ازاں ترقی پسند تحریک کے نتیجے میں شعرا، ادبا کی ایک مکمل جماعت نے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ آزادیِ نسواں کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ عصمت چغتائی نے متوسط طبقے کی لڑکیوں جذبات و احساسات کو زبان عطا کی۔ اسی دور کے اہم افسانہ نگار منٹو کے بیشتر افسانوں کا موضوع بھی عورت ہے۔

ایک اور مضمون ''اردو ادب اور شاعرات'' میں مصنفہ کے مطابق قدیم دور ہی سے خواتین کو اظہارِ خیال سے روکا گیا۔ بقول باقر مہدی ''عورت جانِ غزل تو بن سکتی تھی مگر خود غزل گو نہیں بن سکتی تھی''۔ میر تقی میر کی صاحبزادی بیگم بھی اچھی شاعرہ تھیں مگر میر ان کی شعر گوئی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ تذکروں میں شاعرات کے ذکر کو معیوب سمجھا گیا۔ شعر گوئی پر بھی پابندی تھی۔ دلی میں بھی شعر گو خواتین تھیں لیکن تذکروں میں ان کا ذکر نہیں ملتا بعد میں تبدیلی آئی۔ ۱۹ ویں صدی کی شاعرات کا ایک تذکرہ ''شمیم سخن'' ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ جس میں ۴۹ شاعرات کے مختصر احوال مع کلام درج ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد اردو شاعری سے مرد شعرا کے ساتھ ساتھ شاعرات کو بھی اپنے جذبات و احساسات کو پیش کرنے کی آزادی ملی۔ اسی باب کا ایک اور مضمون ''تانیثی شاعری ایک مطالعہ'' میں مصنفہ نے تانیثیت کا یوں تعارف کروایا ہے۔

''عورت کا ادراک، اس کی حس اور اس کا احساس مرد سے الگ ہے لہٰذا عورت کے جذبات اس کا احساس، اس کا تخیل، اس کی فکر اور اس کے مسائل کا ذکر تانیثیت کہلاتا ہے''۔

انھوں نے مزید وضاحت کے لیے فرہنگ ادبیات سلیم شہزاد کا بھی حوالہ دیا ہے جس کے مطابق تانیثی ادب

کے معنی ''خواتین کے مسائل پر خواتین کے ذریعہ تخلیق کیا گیا ادب ہے''۔ مصنفہ نے شمس الرحمن فاروقی کی تفہیم سے بھی اتفاق کیا ہے کہ ''عورت کی اپنی شخصیت ہے اور اسے مرد سے الگ پڑھنا چاہیے''۔ انھوں نے مزید ایک اور حوالہ Oxford Dictioinary سے دیا ہے۔ فریدہ نے اس خصوص میں مزید لب کشائی یہ کی ہے کہ ''خواتین کے یہاں دو قسم کے جذبات پائے گئے ہیں۔ ایک وہ جذبہ جو لطیف نازک جمالیاتی حس لیے ہوئے حسن و عشق اور واردات قلبیہ پر منحصر ہے جسے نسائیت Feminism (نسائی حسیت) کا نام دیا گیا ہے۔ ایک وہ جذبہ جس میں مرد اساس معاشرہ کے خلاف سماجی عدم مساوات اور ازدواجی ناانصافیوں کے خلاف احتجاجی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ ان جذبات کو تانیثیت Feminism یا تانیثی جذبہ کہا گیا ہے''۔ دراصل نسائیت، تانیثیت ہی کا حصہ ہے۔ نسائیت اور تانیثیت کے خلط ملط سے الجھن پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ بہتر ہے کہ ہم نسائیت اور تانیثیت کے فرق کو برقرار رکھیں کیوں کہ Feminism (نسائی تحریک) ایک تحریک، ایک رجحان اور ایک انداز فکر ہے جب کہ Feminine Sensibility (نسائی حسیت) نسوانی طرز فکر اور نقطہ نظر سے دنیا کو دیکھنا ہے۔ جب ہم تانیثیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو ہمارے پیش نظر خواتین کے مسائل پر خواتین کے ذریعہ تخلیق کیا گیا ادب ہوگا۔ اس نقطہ نظر سے ہم اردو کی تانیثی شاعری کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ تانیثیت کی اصطلاح مغرب کی دین ہے۔ ورجینا وولف کی کتاب A Room of One's Own (1929) اور سیمون دی بوا Semone De Beauvio کی کتاب The Second Sex (1949)، Kate Millet کی کتاب Sexual Politics (1961) نے تانیثی نقطہ نظر کا احساس دلایا اسی طرح 1960ء کے بعد اردو شاعری میں مرد شعرا کے ساتھ ساتھ خاتون شعرا کو بھی اپنے خیالات واحساسات کو اپنے رنگ میں پیش کرنے کا موقع ملا۔ پاکستانی شاعرات ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، سارا شگفتہ، کشور ناہید، گلنار آفریں، حمیرہ رحمن، نزہت صدیقی، پروین شاکر، سعیدہ غزدار وغیرہ وغیرہ ہندوستانی شاعرات زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، ترنم ریاض، یاسمین حنا، ممتاز مرزا، جمیلہ بانو، رفیعہ شبنم عابدی، شبنم عشائی، شاہدہ حنا، زہرہ نگاہ، شہناز نبی، شفیق فاطمہ شعریٰ، عذرا پروین، شائستہ یوسف، اشرف رفیع، حسنی سرور، صغریٰ عالم وغیرہ نے نسائی و تانیثی نقطہ نظر کو پیش کیا ہے۔

زیر نظر کتاب میں مصنفہ نے دوسرے باب میں منتخبہ 8 شاعرات ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید،

پروین شاکر، سارا شگفتہ، زاہدہ زیدی، ترنم ریاض اور صغریٰ عالم کے حالات زندگی اور ان کی تخلیقات (غزلوں ونظموں) کے حوالے سے نسائی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے ادا جعفری، پروین شاکر، زاہدزیدی، ترنم ریاض اور صغریٰ عالم کونسائیت (نسائی حسیت)، نسائی فکروخیال کی شاعرات قراردیا جب کہ فہمیدہ ریاض، کشور ناہیداور سارہ شگفتہ کوعلی الترتیب تانیثی شاعرہ، حقوق نسواں کی علمبرداراور درد وکرب کی آئینہ دار قرار دیا ہے۔ اس سے متشرح ہوتا ہے کہ تمام شاعرات کی سوچ، انداز فکر میں یکسانیت نہیں ہے۔ کوئی اعتدال پسند ہےتو کوئی احتجاج کوروارکھتا ہے۔ بعض انتہاپسند تو مرد کی ضرورت سے انکار کرتے ہیں۔ کشور ناہید، سارا شگفتہ اور فہمیدہ ریاض کو احتجاجی شاعرات کے زمرہ میں شامل کیا گیا ہے۔ جن کا انداز جارحانہ ہے اس کے برخلاف پروین شاکر، ترنم ریاض، شفیق فاطمہ شعریٰ، بلقیس ظفیر الحسن، اشرف رفیع، صغریٰ عالم کا رویہ اثباتی ہے۔ ان کے ہاں وہ تندی اور جارحیت نہیں ہے جو کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور سارا شگفتہ کا وصف ہے۔ ان کے علاوہ شاعرات کا ایک اور گروہ بھی ہے جو مغرب کی آزاد روش سے متاثر ہوکر بغاوت پر آمادہ ہے۔ اس گروہ پر Betty Friedan کی کتاب"The Feminine Mystique (1967)، Garmaine Grear کی کتاب"The Boy" ایک اور کتاب Female Eunuch کے اثرات آصف دکھائی دیتے ہیں۔ جن کے ذریعہ مرد معاشرے کے خلاف جنگ کا بگل بج چکا ہے۔ اردو شاعرات میں پاکستانی شاعرات سعیدہ غزدار، پروین فنا سید، عذرا عباس اور ہندوستانی شاعرہ شبنم عشائی جیسی شاعرات اپنی ذات کے اظہار کے مسئلہ سے دوچار ہیں، چاہتی ہیں کہ روایتی تصور ختم ہو اور جنسی نشاط کی آزادی ملے، مگر برصغیر کا ماحول، مشرقی اقدار اور مذہبی تحریم اس امر کی اجازت نہیں دیتے کہ مغرب کی طرح جنسی بے راہ روی عام ہو۔ اس کتاب کا تیسرا اور آخری باب جس کا ایک اہم مضمون ''تانیثیت کی تدریس'' اور دیگر مضامین طلبہ واساتذہ کے لیے مفید ہیں، بعض اہم شاعرات کی نظموں کی شمولیت اوران کا تجزیہ بھی افادیت کا حامل ہے۔

مجھے مسرت ہے کہ فریدہ بیگم کی یہ کتاب جو تانیثیت کے موضوع پر ہے، اعتدال پسند روش اپنائے ہوئے ہے۔ منتجہ شاعرات کے کلام کے حوالے سے تانیثیت کو سمجھنے میں معاون ہوگی۔ تانیثیت کے موضوع پر یہ ایک منفرد کتاب ہے۔ یہ کتاب اس وقت شائع ہورہی ہے جب کہ سارے عالم میں بین الاقوامی ''یوم خواتین'' نہایت اہتمام سے منایا جارہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی اردو حلقوں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ ●●

(2013ء)

ناک ہے تو ساکھ ہے

رزاق اثر

اُردو نثر میں طنز و مزاح کے اولین نقوش مرزا غالبؔ کے خطوط میں ملتے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں طنز و مزاح نے ترقی کے مدارج طئے کیے ہیں۔ آج وہ ہمارے ادب کے اہم تخلیقی محرکات میں سے ایک ہے۔ آج ہم عصرِ حاضر کو طنز و مزاح کا ''عہد یوسفی'' کہتے ہیں تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ گذشتہ دو دہوں میں طنز و مزاح لکھنے والوں کی تعداد میں اضافے کے باوجود معیار تشفی بخش نہیں ہے۔

زیرِ نظر تصنیف ''ناک ہے تو ساکھ ہے'' کے خالق، رزاق اثر شاہ آبادی ضلع گلبرگہ کے متوطن ہیں۔ وہ شاعری کے علاوہ نثر لکھنے پر قادر ہیں۔ ان کے شعری مجموعے ''نیم شب''، ''شعر و سنگ'' اور ''بیاضِ ثنا'' شائع ہو چکے ہیں۔ نثر لکھتے ہوئے انھوں نے ذائقہ بدلنے کے لیے طنز و مزاح میں اپنی طبیعت کو آزمانا چاہا تو اب معاملہ یہ ہے کہ ''چھٹتی نہیں ہے منہ سے کافر لگی ہوئی''۔ ان دنوں اُن کا شمار ابھرتے طنز و مزاح نگاروں میں ہونے لگا ہے۔ گذشتہ دو دہوں سے ان کے فکاہیے اردو کے مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں ماہنامہ شگوفہ، ماہنامہ زریں شعاعیں اور سہ ماہی طنز و مزاح کے علاوہ سالار، سیاست، منصف، اعتماد، راشٹریہ سہارا، انقلاب دکن اور کے۔ بی۔ این ٹائمز جیسے روزناموں کے ادبی اڈیشن شامل ہیں۔ رزاق اثر کے مضامین کے مطالعے سے یہ واشگاف ہوتا ہے کہ انھوں نے سیاسی نظام و دفتر شاہی کی بدعنوانیوں، خود غرض رہبروں، رشوت خوروں، اقتصادی ناہمواریوں اور سماجی وتہذیبی بوالعجبیو ں کو اپنے فکاہیوں کا موضوع بنایا ہے۔ وہ واقعات، ماحول اور معاشرہ کی بوالعجبیو ں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مضامین میں زیرِ لب تبسم کی دھیمی دھیمی ملائم فضا ملتی ہے۔ اُن کے فکاہیوں میں مزاح کے مقابلے میں طنز کا عنصر نمایاں ہے۔ ''سخن فروش''، ''چولھے کی تیری تو ے کی میری''، ''ابلیس کا خط۔ خود غرض رہبروں کے نام''، ''کنگال''۔ ''ٹوپی''، ''تالی بجا کے دیکھ'' اور ''حفظ ما تقدم'' میں طنز غالب ہے۔ ''ٹوپی'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اس سفید ٹوپی کا کمال دیکھیے کہ انگریز ملک چھوڑ کر ایسا بھاگ گیا کہ اپنی ہیٹ، ٹائی اور زبان تک لے جانا بھول گیا۔'' رزاق اثر کو انشائیہ نگاری سے بھی شغف ہے۔ زیرِ نظر تصنیف کے مضامین میں انشائیہ کی بھی خوبو موجود ہے۔ ان میں ہوائی قلعہ، سبز باغ، دنداں نامہ اور لاتوں کے بھوت کو خصوصیت حاصل ہے۔

فکاہیہ ''ناک ہے تو ساکھ ہے'' لطیف مزاح وطنز سے معمور ہے۔ اس مضمون میں کئی محاوروں کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ دیگر محاوروں کے علاوہ ناک سے متعلق یہ محاورے، ناک اونچی کر کے چلنا، ناک میں دم آجانا، ناک پر مکھی بیٹھنا، ناک رگڑنا، ناک کا بال ہونا، ناک بچانا، وغیرہ وغیرہ توجہ چاہتے ہیں۔ کتاب میں شامل اڑتی چڑیا و دیگر مضامین میں بھی بہت ساری کہاوتیں اور محاورات شامل ہیں۔

رزاق اثر نے اپنے اکثر مضامین مین سیاست دانوں کا تمسخر اُڑایا ہے۔ معاشی مسائل اور گراں بازاری کے باعث وزیر اعظم کو بھی گھسیٹا ہے۔ ''گدھا گیری''، ''چمچہ گیری''، ''اچھا داری ناگ''، ''باہر شیروانی اندر پریشانی''، ''لوک شاہی'' وغیرہ۔ ان کے سیاسی مضامین ہیں۔ ''مانگے کا ہونڈا'' میں جہیز اور گھوڑے جوڑے کی روایتی رسم کی مذمت کی گئی ہے۔ تجارتی مشاعروں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے اپنے مضمون ''سخن فروش'' میں ان متشاعروں کی خبر لی ہے جو غزلیں خرید کر مشاعرہ لوٹتے ہیں۔ اس خصوص میں رزاق اثر رقمطراز ہیں۔

''آج کل تو یہ حال ہو گیا ہے کہ مشاعرے کے اسٹیج سے متشاعر موبائیل کے ذریعے فی البدیہہ غزل خرید رہے ہیں اور مشاعرہ لوٹ کر اگلے مشاعرے کے لیے اپنا نام بُک کروا رہے ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کو اگر اس مفید بزنس کی ذرا بھی بھنک پڑی تو اس کاروبارِ سخن فروشی میں بھی اپنا پنجہ گاڑھ سکتی ہیں۔''

''قلمی کاشت'' اور ''مالِ مسروقہ'' اسی زمرہ کے مضامین ہیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ رزاق اثر کے فکاہی مضامین کا مجموعہ ''ناک ہے تو ساکھ ہے'' اشاعت کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ انھیں اُن کے اس اولین مجموعہ مضامین کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں اور پُر اُمید ہوں کہ مستقبل میں خلاقانہ معروضیت، گہرے مشاہدے اور تخیلی آزادی سے معمور رزاق اثر کے ایسے رشحاتِ قلم منظرِ عام پر آئیں گے، جن سے ان کے فن کو استناد و اعتبار کا درجہ حاصل ہوگا۔ ●●

(2013ء)

قلم برداشتہ

صبیحہ زبیر

صبیحہ زبیر سے میری شناسائی کا عرصہ تین دہوں سے کچھ زیادہ ہے جب کہ وہ ۱۹۸۱ء کے اواخر میں میرے برادر نسبتی زبیر احمد خاں (انجینئر) کی زوجیت میں داخل ہوئیں۔ صبیحہ زبیر کا تعلق عروس البلاد ممبئی سے ہے۔ پانچ بھائیوں میں ایک بہن، والدین اور بھائیوں کی چہیتی، بچپن ناز ونعم میں گزرا۔ ممبئی گرلز ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی نشانات سے کامیاب کیا۔ صوفیہ کالج میں داخلہ لیا تو پی یو سی میں گولڈ میڈل کی مستحق قرار پائیں۔ سینٹ زویر کالج ممبئی سے بھی گریجویشن میں گولڈ میڈل حاصل کیا تو انتظامیہ نے اسی کالج میں جز وقتی لکچرر مقرر کیا۔ والدہ محترمہ پیشہ تدریس سے وابستہ تھیں۔ انھیں بھی قبل از وقت یہ شرف حاصل ہوا۔ دوران تدریس، ممبئی یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویشن کی تکمیل پر گولڈ میڈل سے نوازی گئیں۔ اس طرح اعلیٰ تعلیم کے دوران تین گولڈ میڈل حاصل کیے بعد ازاں ڈپلوما ان ہائیر ایجوکیشن بھی کیا۔

ازدواجی زندگی نے انھیں مشینوں کے شہر سے باغوں کے شہر (بنگلور) پہنچا دیا۔ جہاں زبیر احمد خاں جیسے روشن خیال و نیک خصال شریک زندگی کی رفاقت سے آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا۔ یہاں بھی انھوں نے منصب تدریس کو اپنایا۔ ۱۹۹۲ء سے عباس خاں پی یو اور ڈگری کالج میں تدریسی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ۲۰۰۵ء سے عباس خاں ڈگری کالج کے شعبہ اردو کی صدر ہیں۔ نہایت اخلاص سے اردو زبان وادب کی تدریس میں مشغول ہیں۔ انھیں اس خصوص میں کئی اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ یوم اساتذہ کے موقع پر ''بہترین استاد'' کی سند توقیر بھی ملی۔

صبیحہ کو آٹھویں جماعت ہی سے اردو زبان وادب سے شغف تھا۔ اس خصوص میں ہائی اسکول کی استانی قمر کمال کی رہبری حاصل ہوئی۔ کالج میں داخل ہوئیں تو نظام الدین گوریکر کی سرپرستی نے مہمیز کا کام کیا۔ زمانہ طالب علمی ہی سے مدارس اور کالجوں میں منعقدہ تحریری وتقریری مقابلوں میں امتیاز حاصل کیا۔ انھیں مختلف شعرا کے کئی اشعار زبان زد تھے۔ کالج کے جلسوں کی نظامت ان ہی کے سپرد کی جاتی۔ نظامت کے دوران اشعار کا استعمال موقع ومحل کے اعتبار سے کرتی ہیں۔ نظامت کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ۱۹۹۱ء

سے دوردرشن بنگلور سے وابستہ ہیں تاحال تقریباً ۳۰۰ سے زائد پروگرامس کی نظامت کر چکی ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو بنگلور سے بھی یہ مشغلہ جاری رہا۔ ۲۰۰۲ء میں تقریباً ۴۰۰ غزلوں پر مشتمل پروگرام ''محفل'' کی اسکرپٹ رائٹر اور کامیاب اینکر رہی ہیں۔ ۲۶ Episodes پر مشتمل غزلوں کا یہ پروگرام ای۔ ٹی۔ وی اردو پر ایک سال تک پیش کیا گیا۔ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے ارباب مجاز ممتاز شخصیتوں سے گفتگو و مصاحبے کے لیے صبیحہ زبیر ہی کا انتخاب کرتے رہے ہیں۔ انٹرویو کے دوران وہ نہایت بے باکی، زبان کی چاشنی، روزمرہ اور محاوروں کی برجستگی، مزیدار چٹکلوں اور شعر خوانی کے ذریعے ناظرین وسامعین کا دل موہ لیتی ہیں۔ انھوں نے جن نامی گرامی شخصیات کا انٹرویو کیا ہے ان میں مشہور قوال ہری کشن پاہوا سے لے کر فلمی لیجنڈ دلیپ کمار، خورشید عالم خاں (سابق گورنر کرناٹک)، بیگم سعیدہ خورشید عالم خاں، مسز حسنات منصور، کے رحمان خاں (ڈپٹی لیڈر راجیہ سبھا)، سید کرمانی (وکٹ کیپر)، قمرالاسلام (سیاسی رہنما)، کے علاوہ ادبا و شعرا میں خلیل مامون، حمید الماس، م۔ ن۔ سعید، ملنسار اطہر احمد اور احقر شامل ہیں۔

صبیحہ کی گھریلو زندگی نہایت پرسکون ہے۔ دو صاحبزادے تعلیم کی تکمیل کے بعد برسرکار ہیں۔ اکلوتی صاحبزادی کی تعلیم کا مرحلہ بھی تکمیل کے قریب ہے۔ زیادہ تر وقت تدریس کے علاوہ سماجی کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ غریب لڑکیوں کی شادی اور نادار طلبہ کی تعلیم کے لیے نہ صرف فکرمند رہتی ہیں بلکہ دامے درمے، قدمے سخنے، ان کی مدد کے لیے ہر دم آمادہ اور ہمہ اقسام کے پکوان میں بھی ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ کھانے سے زیادہ کھلانا پسند کرتی ہیں۔ انہیں مطالعہ کا شوق بچپن سے ہے۔ اقبال، میر، مومن، غالب، جگر، مجاز، ساحر، اختر الایمان اور جاں نثار اختر، ان کے پسندیدہ شعراء ہیں۔ پریم چند، خواجہ احمد عباس، سجاد ظہیر، کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی، منٹو اور قرۃ العین حیدر ان کے محبوب فکشن نگار ہیں۔

طالب علمانہ دور میں تقاریر اور نظامت کا زور و شور رہا۔ مضامین لکھے بھی تو ان کی اشاعت کی جانب توجہ نہیں کی۔ وقتاً فوقتاً ان کے مضامین نوائے ادب (ممبئی)، تریاق (ممبئی)، ترکش (کلکتہ)، ادیب (بنگلور)، دختران کرناٹک (بنگلور)، انجمن (گلبرگہ) کے علاوہ انقلاب (ممبئی)، سالار (بنگلور) اور سیاست (بنگلور) کے ہفتہ وار اڈیشن میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ جان کر مسرت ہوئی کہ صبیحہ زبیر کے مضامین کا پہلا مجموعہ ''قلم برداشتہ'' عنقریب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگا۔ زیر نظر تصنیف میں مختلف النوع

مضامین شامل ہیں جن کی نوعیت ادبی، تعلیمی اور تہذیبی ہے۔ مصنفہ نے اقبال کے تفکر کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ مجاز کو صرف انقلابی شاعر نہیں بلکہ محبت کی رفعتوں کا شاعر اور ساحر کو زندگی کی کشمکش کا شاعر قرار دیا ہے۔ جاں نثار اختر کی گھر آنگن شاعری اور خلیل مامون کی نشاطِ غم کی شاعری کا باریک بینی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد کی عہد سازی کا جائزہ لیتے ہوئے شبلی نعمانی جیسے مصلح قوم پر بھی قلم کو جنبش دی گئی ہے۔ اختر کی تصانیف قامت و قیمت اور تحقیق و تجزیہ کا محاکمہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ زیرِ نظر تصنیف میں ''موسمِ امتحان اور والدین کی ذمہ داریاں'' واحد مضمون ہے جو کسی تعلیمی سرگرمی سے متعلق تحریر کیا گیا ہے۔ امتحان کے موقعوں پر والدین کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے اساتذہ کا بھی محاسبہ کیا گیا ہے۔ مصنفہ ان اساتذہ سے نالاں نظر آتی ہیں جو بچوں کو ٹیوشن کی جانب مائل کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جو اساتذہ خود تدریسی صلاحیتوں سے محروم ہوتے ہیں وہ ٹیوشن کے اہتمام پر مصر نظر آتے ہیں۔ مصنفہ دو سال کے بچوں کے Play Home یا Baby Sitting میں داخلے کی بھی مخالف ہیں۔ انھوں نے اپنے سفرِ حج 2011ء کی روداد نہایت دل نشین پیرائے میں تحریر کی ہے جو قاری پر دیرپا اثر چھوڑتی ہے۔ ایک اور مضمون میں تحریک آزادی میں اردو کے رول کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ''رانی گپتا'' نائب سفیر برائے ثقافتی امور امریکی سفارت خانہ چنئی سے لیا گیا انٹرویو معلوماتی ہونے کے علاوہ ہند امریکی ثقافتی شعبہ کی سرگرمیوں کا عمدہ اظہار ہے۔ نیز ہند امریکہ کے درمیان طلبہ کی باہمی تعلیم پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ عالمی یوم خواتین کے موقع پر تحریر کردہ مضمون حقوق کے لیے خواتین کی جد وجہد کا حصہ ہے۔ اس مجموعہ میں کرناٹک کے ممتاز تاجر اور عباس خان کالج کے انتظامیہ کے سربراہ الحاج مقبول احمد سے متعلق ایک اثر آگیں خاکہ بھی شریک ہے۔ مضامین کے آخر میں صبیحہ زبیر کی ایک نثری نظم ''اے دہشت گردو'' اور مدر ٹریسا کی نظم کا ترجمہ ''پھر بھی'' شامل ہے جو قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ ''قلم برداشتہ'' صبیحہ زبیر کے مضامین کا اولین مجموعہ ہے جس کی اشاعت پر میں انھیں مبارکباد دیتا ہوں۔ امید ہے کہ وہ مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رکھیں گی۔ قارئین کو ان کے دوسرے مجموعہ کا انتظار رہے گا۔

●●

(2014ء)

سراغ زندگی

سید احمد ایثار

سوانحی ادب میں خودنوشت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ خودنوشت، مصنف کی ذاتی تحریر پر مبنی وہ سوانح ہے جو اس کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ اس کے ذریعے اپنی زندگی کے تجربات، مشاہدات ومحسوسات کو آنے والی نسلوں کے حوالے کرتا ہے۔ ''تواریخ عجیب'' اُردو کی اولین خودنوشت سوانح قرار دی گئی ہے۔ ''ذکرِ میر'' کا شمار بھی اُردو کی ابتدائی سوانح عمریوں میں ہوتا ہے۔ خودنوشت سوانح کے سلسلے میں ۱۹۶۴ء میں شائع شدہ نقوش لاہور کا ضخیم آپ بیتی نمبر بھی خصوصیت کا حامل ہے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ ہمارے ادیبوں شاعروں صحیفہ نگاروں اور سیاسی رہنماؤں میں یہ رجحان تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ اپنے حالاتِ زندگی کو خود رقم کریں۔ آج اُردو میں چار سو سے زیادہ خودنوشت سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض طبع زاد ہیں تو بعض ترجمہ شدہ۔ مواد اور ہیئت کے لحاظ سے بھی خودنوشت منقسم ہے۔ وہ مواد کے لحاظ سے مذہبی، سیاسی اور سماجی ہوسکتی ہے تو ہیئت کے لحاظ سے اس کی نوعیت بیانیہ، مکتوباتی، افسانوی اور منظوم ہے۔

پیش نظر خودنوشت ''سراغ زندگی'' اُردو کے معروف ادیب، شاعر و مترجم سید احمد ایثار کی تحریر کردہ ہے۔ یہ خودنوشت مواد کے اعتبار سے سماجی اور بہ لحاظ ہیئت بیانیہ ہے۔ اس کے ڈانڈے تاریخ، سماجیات، نفسیات اور اخلاقیات سے ملتے ہیں۔ آپ بیتی کے خالق کے لیے ضروری ہے کہ وہ سچائی اور آزادی کے ساتھ اپنے عیب وہنر کو بیان کرے اور کسی خوف یا ملامت سے بے نیاز ہوکر سچ کہہ دے۔ بقول احمد ندیم قاسمی ''دراصل خودنوشت سوانح کا اولین اور بنیادی مطالبہ سچ بولنا ہے۔'' گویا خودنوشت کے مصنف کو عدالتی طریق کے مطابق یہ حلف لینا ہوگا کہ جو کچھ بھی لکھوں گا سچ لکھوں گا سچ کے سوا کچھ نہیں لکھوں گا۔ ایثار صاحب کے ہم عصروں اور احباب سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ کتاب میں شامل بیانات و واقعات حقیقت پر مبنی ہیں۔ مصنف نے اپنی نجی زندگی، تعلیم، ماحول واحباب کے ذکر کے علاوہ اپنی ملازمت، اس سے متعلق مناقشات اور سماجی حالات کی بے کم وکاست منظر کشی کی ہے۔

مصنف کی ملازمت کا تعلق محکمۂ جنگلات سے رہا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں بہ حیثیت فاریسٹ رینجر ملازمت کا آغاز ہوا۔ ملازمت کے دوران ہی ۱۹۵۴ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹی آف واشنگٹن بھیجے گئے جہاں سے ۱۹۵۶ء میں ماسٹر آف فارسٹری کی ڈگری لی۔ انھوں نے ہماری ریاست کے مختلف مقامات پر مختلف عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ وہ D.C.F, A.C.F اور C.F کے عہدوں پر فائز رہے۔ انھیں ملازمت کے دوران کسی خاص شہر یا مقام سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے جہاں بھی جس منصب پر ان کا تبادلہ کیا گیا اور ترقی دی گئی وہ نہایت دیانت داری اور ذمہ داری کے ساتھ اپنا فرض منصبی نبھاتے رہے۔ چنانچہ رقمطراز ہیں۔ ''میرا کسی خاص مقام یا کام پر اصرار نہیں تھا۔ بلکہ میری تو یہ خواہش تھی کہ اپنی ریاست کے مختلف جنگلات دیکھوں اور محکمۂ جنگلات کے ہر ایک شعبے میں کام کروں اور تجربہ حاصل کروں''۔ (''سراغ زندگی'' باب: دیار یاراں میں واپسی، ص: ۱۰)

ملازمت اُن کے لیے ایک مہم سے کم نہیں تھی۔ وہ ۱۹۸۰ء میں بہ حیثیت ڈائرکٹر آف وائلڈ لائف اینڈ کنزرویٹر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے واردات اور ملازمت کے واقعات کا بڑی بے باکی اور ایمانداری سے جائزہ لیا ہے۔ خصوصاً جنگلات کی زندگی اور وہاں کی مشکلات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے نہ صرف ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ان مشکلات کا بھی اندازہ ہوتا ہے جن سے مصنف گزرتے رہے۔ گھنے جنگلات میں پیدل چلنے کا رکارڈ قائم کیا۔ ایک رات انھوں نے 35 میل پیدل چل کر منزل مقصود کو پالیا۔ ملازمت کے دوران انھیں بہی خواہوں اور بدخواہوں سے سابقہ پڑا۔ بعض کی دوستی، بے غرضی اور حسن اخلاق پر قائم بھی تھی تو بعض مفسدوں نے ان کے خلاف رپٹ پر رپٹ داخل کی، جس کے نتیجے میں انھیں کبھی کامیابی تو کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مگر انھوں نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔ بقول اصغر علی انجینیر ان کا ایقان ہے

''حقیقی کامیابی، منزل کو پانے میں نہیں ہے بلکہ مشکلات کے باوجود ہار نہ ماننے میں ہے۔''

(''زندہ عقیدہ'' خودنوشت اصغر علی انجینیر، مترجم قدیر زماں، ص: 78)

''سراغ زندگی'' کے مطالعہ کے دوران ہم فارسٹری میں Thining, Cleaning درختوں کی Pruning اور ضروری طریقہ ہائے روئیدگی سے واقف ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہاتھیوں کے

شکار (کھڈا آپریشن) کے طور طریقے اور اس کے اہم مرحلوں سے شناسائی ہوتی ہے۔ ہمیں اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ اپنے دور میں سید احمد ایثار نے ممتاز ماہر تعلیم، ممتاز احمد خاں کی سفارش پر شاہ خالد، فرماں روائے سعودی عربیہ کو تھیامن نسل کے ایک درجن ہرن تحفتاً روانہ کیے تھے۔ سید احمد ایثار کو ایک سے زاید مرتبہ سفرِ امریکہ کا موقع ملا۔ ان کے پہلے سفرِ امریکہ کے تاثرات سے وہاں کی طرزِ زندگی، آزادانہ ماحول، نوجوانوں کی بے راہ روی اور معمرین کی تنہائی کا علم ہوتا ہے۔ وہاں کے اساتذہ کے بارے میں اُن کی رائے ہے کہ ''وہ معلم ہونے کے ساتھ ساتھ خود کو طالبِ علم تصور کرتے ہیں۔ تعلیم اور تحقیق ان کا مقصدِ حیات ہوتا ہے۔'' امریکہ سے اُن کی واپسی نیویارک کے سمندری راستے سے ہوئی۔ امریکہ سے بنگلور پہنچنے میں انھیں دو مہینے صرف ہوئے۔ وہ اس سفر میں کیپ ٹاؤن، ڈربن اور کولمبو سے بھی گزرے۔ ڈربن سے کولمبو کا راستہ دس دن میں طے ہوا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ جنوبی افریقہ میں رنگ و نسل کا امتیاز عروج پر ہے۔ انھیں وہاں ریل کی بوگیوں پر کہیں For White تو کہیں For Coloured کی عبارت نظر آئی۔ بعد کے اسفارِ امریکہ میں انھیں وہاں مقیم اپنی صاحبزادی سیدہ آفتاب بانو اور داماد ڈاکٹر سعید الرحمٰن صدیقی کی رہنمائی میں امریکہ کے دلکش سیاحتی مقامات، فورڈ میوزیم، نیاگرا فالس آبشار، ڈزنی ورلڈ اور ہالی وڈ وغیرہ کی سیر اور وہاں کی علمی و ادبی شخصیتوں سے آشنائی کا موقع ملا۔

''سراغِ زندگی'' کے مطالعہ سے ہم آج سے ۵۰ برس قبل کے سماجی حالات اور معیشت سے بھی باخبر ہوتے ہیں۔ اس دور میں کم قیمت پر مطلوبہ سامان وافر مقدار میں مل جاتا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں بمبئی کی ہوٹل میجسٹک کا روزانہ کرایہ ۱۶ روپے تھا اور ۱۹۶۲ء میں ساگوان کی لکڑی فی مکعب فٹ دو روپے دس آنے میں فروخت ہوتی تھی۔

''سراغِ زندگی'' اپنے موضوع کے اعتبار سے دلچسپ اور افادیت کی حامل ہے۔ مصنف کا طرزِ تحریر رواں دواں اور زبان عام فہم ہے۔ امید ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

●●

(2014ء)

حرفِ تشکر

میرے مضامین، تبصروں اور پیش ناموں پر مشتمل کتاب ''تارِ نظر'' قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے دلی مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ یہ مضامین وقتاً فوقتاً گذشتہ چار دہوں کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ''تارِ نظر'' کی ترتیب، تدوین، تزئین اور اشاعت کے مختلف مرحلوں میں مجھے ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب (لندن)، جناب حامد اکمل، جناب خواجہ پاشاہ انعامدار، ڈاکٹر انیس صدیقی، ڈاکٹر غضنفر اقبال، باسط فگار، محمد ایاز الدین پٹیل، عارف مرشد، سید اسلم ہاشمی اور حسن محمود کی جانب سے جو گراں بہا تعاون حاصل ہوا، اس کے لیے میں ان سب کا سراپا سپاس ہوں۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کا بھی ممنون ہوں کہ اس کے مالی تعاون سے کتاب شائع ہوئی۔

وہاب عندلیب

مصنف کی کتابیں

تصنیف :

۱۔ قامت و قیمت (خاکے) بارِ اوّل ۱۹۸۱ء
بارِ دوّم ۲۰۰۴ء

۲۔ تحقیق و تجزیہ (مضامین) ۱۹۹۹ء

۳۔ گفتار و کردار (خاکے) ۲۰۱۰ء

۴۔ سلیمان خطیب : شخص، شاعر و نثر نگار (تحقیق) ۲۰۱۳ء

۵۔ تارِ نظر (مضامین، تبصرے، پیش نامے) ۲۰۱۴ء

تالیف:

۱۔ غیاث صدیقی: شخصیت و فن بارِ اوّل ۱۹۷۸ء
بارِ دوّم ۲۰۰۳ء

۲۔ افکار و نظریات (مقالات) ۱۹۹۹ء

۳۔ نذرِ ٹیپو سلطان (ہندوستانی شعرا کا خراجِ عقیدت) ۲۰۰۴ء
(بہ اشتراک پروفیسر عبدالغفار شکیل، میسور)

۴۔ رہنمائے تدریس ۲۰۰۹ء
(نصاب و طریقہ تدریس برائے اردو نرسری مدارس)

tar-e-nazar

Wahab Andaleeb